جو دیکھا، جو سُنا، جو بیتا

سلمٰی اعوان

ناول:

تنہا (سابق مشرقی پاکستان)

لہو رنگ فلسطین

یہ میرا بلتستان (پاکستان کا شمالی حصہ)

ثاقب (۱۹۶۵ء کی جنگ کے پسِ منظر میں)

گھروندا اک ریت کا

زرغونہ

شیبہ

افسانوی مجموعے:

کہانیاں دنیا کی

بیچ بچولن

خوابوں کے رنگ

برف میں دھنسی عورت کچھ کہتی ہے

ذرا سنو تو فسانہ میرا

The Sky Remained Silent

سفرنامے:

سندر چترال

میرا گلگت و ہنزہ

مصر میرا خواب

روس کی ایک جھلک

عراق اشک بار ہیں ہم

استنبول کے عالم میں منتخب

سلیون کے ساحل، ہند کے میدان

اٹلی ہے دیکھنے کی چیز

شام امن سے جنگ تک

تیرے افق بے حدود و بے ثغور

دیگر:

جو دیکھا، جو سُنا، جو بیتا (تحریریں)

عالمی ادب کی فروزاں قندیلیں (تحریریں)

باتیں دینا اور دل کی (کالم)

جو دیکھا، جو سُنا، جو بیتا

کچھ جلتی بلتی، روتی کُرلاتی، ہنستی ہنساتی، دل گیر و دل پذیر تحریریں

سلمیٰ اعوان

بُک کارنر

جہلم، پاکستان

انتساب

کاش مرنے سے قبل اپنے ملک کو اِس بدحالی سے نکلتے
اور سربلند ہوتے دیکھ سکوں

ترتیب

☆ ہم صورت گر کچھ لفظوں کے (پیش لفظ) 11

1۔ سعدی یوسف کا جنت سے جو بائیڈن کے نام خط 13

2۔ پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا جان کیٹس 18

3۔ ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات 33

4۔ اِک معجزہ میری زندگی کا 39

5۔ پاکستان کی خارجہ پالیسی کے اُبھرتے ہوئے امکانات اور چیلنجز 48

6۔ میرا محسن، میرا مربی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی 53

7۔ ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے 60

8۔ میکرون تھیوڈور ہرتزل کی طرح مسلم امہ کی بیداری کا باعث بنے گا؟ 64

9۔ بلتستان کے مسائل اور پھول شہزادی 68

10۔ ناگورنو کراباخ کی حسین شہزادی کیا کہتی ہے 72

11۔	’’صلائے عام ہے یاران نکتہ دان کیلئے‘‘	77
12۔	راجندر سنگھ بیدی کے آخری ماہ وسال	82
13۔	اور اگر میں تب ریپ ہو جاتی تو۔۔۔	87
14۔	میرے درد کا کوئی درماں ہو	92
15۔	گمنام گاؤں کا آخری مزار اور رؤف کلاسرہ	97
16۔	اہلِ بیت سب ہمارے	101
17۔	فلسطینیوں کے گھائل کرتے لفظ	106
18۔	بورس، اوسپ مینڈل اور سٹالن کی ہجو	112
19۔	اردگان کے لیئے مسلم امّہ کا لیڈر بننے کے امکانات	117
20۔	ہمارے وقتوں کی عیدیں	121
21۔	ابونواس آٹھویں صدی کا عظیم کلاسیکل شاعر	125
22۔	ایا صوفیہ کیا اسلام اور مسیحت کے درمیان نیا تنازعہ کھڑا کرے گی	133
23۔	سوشل میڈیا کا یہ طوفان	138
24۔	چھٹی میرے خان کے	142
25۔	طارق عزیز کے نام کا میوزیم بنانے کی ضرورت	147
26۔	ابن عربی، اسلامی تھیالوجی کا مستند نام	152
27۔	حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی قبر محفوظ ہے	157
28۔	’’ناں! آصف مسکرانے پر تمہارا کچھ خرچ ہوتا ہے‘‘	161
29۔	نیپلز سے خط، Great people to fly with	165

30۔ اماں جس پر لکھتے لکھتے یہ دن آ گیا 170

31۔ ہم تین نمبر یئے، ہمارا کرونا بھی تین نمبر یا 179

32۔ انور مسعود نے سونا نہیں ہیرا سپرد خاک کیا 184

33۔ دمشق کی مونا عمیدی کا اور میرا رمضان 189

34۔ پیاری بیبیو! اب پیچھا چھوڑ دو میرے مولانا کا 195

35۔ ہمارے گھر کا اہم ٹاک شو 200

36۔ غرناطہ کی چھتوں پر اذان نہیں اذانیں 205

37۔ اِس مشکل گھڑی ملک کے ساتھ کھڑے ہوں 211

38۔ وبائی دنوں میں خود سے ملنا، تجدید محبت اور جھگڑے 215

39۔ میلان اٹلی کی بالکونی میں بیٹھی وہ یاد آتی ہے 220

40۔ ہم اللّے تللّے پاکستانیوں کا رب وارث 226

41۔ کرونا وائرس، روم اور ویٹی کن سٹی 230

42۔ مایون ہم چترالیوں کے لیئے کرونا وائرس نہیں لانا 237

43۔ میرے محبوب سے ملاقات 241

44۔ استنبول کی سلیمانیہ لائبریری اور خوبصورت ترک شاعری 245

45۔ چین پر ہمیشہ کی طرح اب بھی اعتماد کی ضرورت ہے 251

46۔ علی شیر نوائی 256

47۔ قصّہ ایک افسانہ لٹنے کا 267

48۔ کچھ ستم وقت کے اور کچھ ہمارے 271

49۔ کچھ میری بھی سُن اے چارہ گر 275

50۔ رُوس کے عظیم شاعر الیگزینڈر پشکن کی شادی کی دلچسپ کہانی 279

51۔ پاکستان کے حالات پر روسی انستاسیا کی چھٹی 285

52۔ میں کاٹھی شہزادی شارلٹ اپنے ننہال لنڈے کی عاشق 289

53۔ پیٹرز برگ میں میخائل ویزالیوچ کی کھٹی میٹھی باتیں 294

54۔ لٹنا میرا استنبول کے کیپلی کارسی میں 300

55۔ عیسائیوں، یہودیوں اور آرمینیاؤں کے لیے کو
سموپولیٹن بغداد جانے کہاں گم ہو گیا؟ 307

56۔ سچ بتایئے کبھی کبھی شوہر کو پھینٹی لگانے کو جی چاہتا ہے ناں! 313

57۔ درویشوں کا ڈیرہ 317

58۔ سندر بن کے جنگلات، عید اور میں 321

59۔ میلانیوں اور رومیوں کی نوک جھونک کراچی اور لاہور والوں جیسی ہی 327

60۔ زندگی کے ہزار رنگ 332

61۔ ایک عظیم شخصیت رابندر ناتھ ٹیگور 336

ہم صورت گر کچھ لفظوں کے

کچھ کہنا چاہتی ہوں....

نو سو ہزار لفظوں کی قید میں گھری یہ تحریریں کیا ہیں؟ بس اندر باہر کے کھیتا رس کا ایک ذریعہ جسے آج کے مصروف اور مشینی دور میں پڑھنا آسان ہے۔ شاعری کی طرح جواب بھی فوراً مل جاتا ہے۔ کتابیں پڑھنے کا چلن اب کم ہو رہا ہے۔ ملک کے بڑوں کو نئی نسل کے ہاتھ میں کتاب دینے کا کوئی پروگرام نظر نہیں آتا۔ خدا کرے کوئی ایسی تحریک اٹھے۔ کچھ جنونی دیوانے ووٹ کو عزت دینے کے نعرے کے ساتھ کتاب کو بھی اس کی کھوئی ہوئی عزت اور عظمت کے احیا کا سلسلہ زور و شور سے شروع کریں۔

مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جو لفظوں کو کاغذی پیرہن پہنانے کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ خدا انھیں سلامت رکھے۔ دعا ہے کہ ہمارے ماضی کی آنہ لائبریریاں دس روپے کرایہ والی لائبریریاں بن کر شہروں کے گلی کوچوں میں پھیل جائیں۔

کتاب سے محبت کا خمیر زندگی میں گُھلنا اور رچنا بہت ضروری ہے۔

اطہر نفیس نے شاید میرے ہی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے........

بے جذبۂ شوق سُنائیں کیا، کوئی خواب نہ ہو تو بتائیں کیا

سلمٰی اعوان

279/A، نیو مسلم ٹاؤن لاہور

salma.awan@hotmail.com

www.salmaawan.com

0301.4038180

سعدی یوسف کا جنت سے جو بائیڈن کے نام خط

جو بائیڈن آپ کو چٹھی لکھنے کی وجہ بڑی خاص ہے۔قصہ کچھ یوں ہے کہ گذشتہ کچھ دنوں سے ہم عراقی، فلسطینی، شامی اور مصری شاعر عالمِ بالا میں اپنی ال شابندر کافی شاپ میں باقاعدگی سے اکٹھے ہو رہے ہیں اور سچی بات ہے کہ اِن دنوں آپ ہمارے درمیان کچھ زیادہ ہی زیرِ بحث رہے ہیں۔محمود درویش اور نازک الملائیکہ آپ کی بہت وکالت کر رہی ہیں۔میں نے انہیں تنبیہ کی ہے کہ وہ زیادہ جذباتی نہ بنیں۔

جو بائیڈن آپ مجھے نہیں جانتے ہیں۔اصل میں اس میں کچھ آپ کا بھی قصور نہیں۔اکثر امریکی صدور کا جنرل نالج کمزور ہی ہوتا ہے۔

آپ نے اپنے دفتر میں مارٹن لوتھر کنگ، رابرٹ کینیڈی، روزا لوئیس پارکس اور کچھ اِسی طرح کی دیگر امن پسند شخصیات کے مجسمے سجا دیئے ہیں تاکہ آپ کو ہدایت ملتی رہے۔مجھے یہ خبر پرسوں رات مظفر النواب نے ایک بڑے پاکستانی دانشور اور منفرد کالم نگار وجاہت مسعود کے کالم کے حوالے سے سنائی تھی۔

میں نے کہا مظفر النواب بس دعا کرو۔اس کا ماضی بھی خون اور جنگ کے دھبوں سے بھرا پڑا ہے۔ہم بے چارے عراقیوں پر حملہ کرنے کی اس نے بڑی بھرپور حمایت کی تھی۔گو حکومت میں بھی نہیں تھا مگر وزارتِ خارجہ کی کلیدی پوسٹ پر بیٹھا سپورٹ کیئے جاتا تھا۔پل بھر کے لیے بھی نہیں سوچتا تھا کہ ہم لاکھوں بے گناہ لوگوں کا قتل عام کرنے جا رہے ہیں۔میں اور تم تو اس وقت صدام کے ڈر سے خود ساختہ جلاوطن ہوئے پڑے تھے۔

اس وقت تو یہ امریکی ہمارے نجات دہندہ بن کر ہمیں صدام جیسے آمر سے بچانے آئے تھے اور جب ہم پر قابض ہو گئے تو پہلا ٹھپہ انہی لوگوں نے ہمارے ناموں پر لگایا تھا کہ عراق میں ان کے داخلے پر پابندی ہے۔مظفر مَیں اور تم تو دونوں سرفہرست تھے۔کوئی ہمارے جذبات جان سکتا ہے کہ ہم جن کی آنکھیں اپنے گھروں اور اپنے پیاروں کو دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔صدام ہمیں بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ آپ آئیں آپ لوگوں کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں۔آپ لوگ عراق کا فخر ہیں۔مگر ہمیں ڈر تھا کہ وہ ہمیں مروا دے گا۔صدی کا چوتھائی حصّہ یعنی پورے پچیس سال جب ہم نہ عراق جا سکے۔بغداد دیکھ سکے اور نہ بصرہ۔بصرہ جو میری جائے پیدائش تھی اور اسی طرح روتے کرلاتے اجنبی سرزمین سے اس عالم بالا میں آ گئے۔

چلو اگر تمہیں کچھ عقل آ گئی ہے تو اچھی بات ہے۔صبح کا بھولا شام کو اگر گھر آ جائے تو اُسے معاف کر دیتے ہیں۔تم لوگ دنیا کے ساتھ جو کھلواڑ کرتے رہے ہیں۔اس کا کچھ مزہ تو تمہارے سفید ہاتھی نے تمہیں چکھا ہی دیا ہے۔نزار قبانی کا کہنا ہے کہ اب اللہ کرے کہ یہ انسان بن جائیں۔

ہاں میں اپنی نظم بھیج رہا ہوں۔اسے اسی کمرے میں سامنے والی دیوار پر لگانا اور آتے جاتے اِسے پڑھنا۔جب پڑھو تو رک جانا۔سوچنا اُس وقت کو جب یہ میرے اندر کی بوٹیاں کاٹتی، میری خون برساتی آنکھوں سے میرے گالوں پر بہتی تھی۔صرف میرے گالوں پر نہیں ہر عراقی بچے، بوڑھے، جوان عورت، مرد سب کے گالوں پر۔

خدا امریکہ کو محفوظ رکھے

میرا گھر، میری جنت

جینز، جاز، خزانوں کے جزیرے

جان سلور کے طوطے اور نیو اور لینز (New or Leans) کی بالکونیاں
اُن سے بے پایاں محبت مجھے بھی ہے
مارک ٹوئن، مسسپی (Mississippi) کی دخانی کشتیوں
ابراھم لنکن کے کتوں اور ورجینا تمبا کو
اُن سے بڑا ہی پیار ہے مجھے
لیکن میں امریکی نہیں
پینٹم Phantom پائلٹ کے لیئے اتنا ہی کافی ہے
کہ دھکیل دے پتھر کے زمانوں میں مجھے
تیل کی ضرورت نہیں، نہ ہی امریکہ کی
نہ ہاتھیوں اور نہ ہی گھوڑے گدھوں کی
پائلٹ! میرے گھاس پھونس کی چھت والے گھر
چوبی پل اور مجھ سمیت سب کو چھوڑ دو
تمہارے گولڈن گیٹ اور تمہاری فلک بوس عمارتیں
اُن کی ضرورت کب ہے مجھے
اپنا گاؤں چاہیئے، تمہارا نیویارک نہیں
تم مسلّح سپاہی اپنے نویدا صحرا سے کیوں آئے
تم لوگ اتنی دور سے بصرہ کیا کرنے آئے
ہمارے گھر دروازوں پر مچھلیاں تیرتی ہیں
یہاں سور چارے کی تلاش میں نہیں پھرتے ہیں
میری بید کی چھڑی، جھونپڑی اور ڈوری کانٹا

چھوڑ و سب اور چھوڑ و مجھے بھی
اپنے سمگل شدہ سگریٹ لے لو
ہمارے آلو ہمیں واپس کر دو
اپنی مشنری کی کتابیں لے لو
اور اپنے کاغذ ہمیں دے دو
کہ ہم تمہیں بدنام کرنے کے لیئے نظمیں لکھیں
اپنے جھنڈے کی پٹیاں لے لو
اور ہمیں ستارے دے دو
افغان مجاہدین کی داڑھیاں لے لو
اور ہمیں والٹ وٹ مین کی
تتلیوں سے بھری داڑھی دے دو
صدام حسین کو لے لو
اور ہمیں ابراھم لنکن دے دو
اُسے نہیں دینا چاہتے
تو پھر کچھ بھی نہ دو
امریکہ ہم یرغمالی تو نہیں
اور
تمہارے سپاہی کوئی خدائی خدمتگار نہیں
ہم غریب ہیں مگر ہماری
دھرتی غرقاب دیوتاؤں کی ہے

نڈر سانڈ دیوتاؤں کی
آگ دیوتاؤں کی
غم کے دیوتاؤں کی
جو خون اور مٹی کے ملاپ سے
نغمے تخلیق کرتے ہیں
ہم غریب ہیں
ہمارا خدا بھی غریبوں کا خدا ہے

☆☆☆

پانیوں پر لکھے ہوئے نام والا جان کیٹس

یہ بتانا مشکل ہے کہ سات سمندر پار اُس رومانوی کلاسیکل شاعر کیٹس سے میرا عشق کب شروع ہوا؟ بلکہ اس میں اگر تھوڑا سا اضافہ کروں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اِس دوڑ میں اس کے دوست شیلے اور بائرن بھی شامل تھے۔گو کیٹس ہمیشہ میری کمزوری رہا۔تاہم شیلے بھی کم نہیں۔ہاں البتہ اِس رومینٹک تکون نما مثلث کا تیسرا اسرالارڈ بائرن کہیں تھوڑا سا پیچھے ہے۔

روم اور یہیں وہ سپینش سٹیپ ز والا گھر جہاں کیٹس نے اپنی بیماری کے دن کاٹے اور ختم ہوا۔ شیلے بھی اٹلی میں ہی ڈوب کر مرا۔دونوں دفن بھی روم کے پروٹسنٹ قبرستان میں ہیں۔ایک کی ہڈیاں اور دوسرے کی راکھ۔

اب روم پہنچ کر دل کا وہاں جانے کیلئے مچلنا اور ہمکنا سمجھ آتا ہے کہ عاشقوں کی زیارت گاہ ہے۔

تو اِس وقت میں spagna پیازہ سکوائر میں اُس چار منزلہ عمارت جو کہیں 1725 میں بنائی گئی تھی اور اس وقت کیٹس شیلے ہاؤس کے نام سے روم کی ایک اہم قابلِ دید جگہ ہے۔اس کی دوسری منزل پر کیٹس میوزیم جانے کیلئے قطار میں لگی کھڑی ہوں ۔

26 کا ہندسہ پلیٹ پر چمکتا دُور سے نظر آتا ہے۔ایک چھوٹے سے دروازے کی گزرگاہ سے اندر داخلہ ہوتا ہے۔اس کی دل کو بھگونے والی نظم قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی ہے۔ہلکی سی نمی بھی آنکھوں میں اُتر رہی ہے۔

خوف وخدشات کے سائے جب مجھے گھیر لیں
اس سے پہلے کہ
میرا قلم میرے دماغ کی معذوری کا احاطہ کرے

اور کتابوں کے ڈھیر اور اُن کے اندر کی خوبصورتیاں
مجھے گرفت میں لے لیں
اس بھرے غلّے کی کوٹھڑی کی طرح
جو پکے اناج سے بھری ہوتی ہے
جب میں رات کے چہرے کو دیکھتا ہوں
جیسے ایک دلکش رومانس کے دبیز بادل ہوں
سوچتا ہوں کہ میں تو شاید
زندگی کے اِس رخ کو دیکھنے کے لئے زندہ ہی نہ رہوں
ان کے سائے اتفاق کے جادوئی ہاتھ کے ساتھ
جب میں محسوس کروں
صرف ایک گھنٹے کی خوبصورت تخلیق
اور میں اسے اس سے زیادہ نہ دیکھ سکوں
کبھی نہ منعکس ہونے والا پیار
تب ساحلوں پر
اس وسیع وعریض دنیا میں
میں اکیلا کھڑا ہوں اور سوچتا ہوں
محبت اور شہرت سب بیکار ہیں
پس مر جاؤ

اِدھر اُدھر جانے کی بجائے سب سے پہلے اُس کے اُس کمرے میں جانے کی خواہش مند ہوں جہاں اُسنے آخری سانسیں لیں۔ پانچ یورو کا ٹکٹ۔ Attendent

لڑکیاں بڑی خوبصورت اور ہونٹوں پر شہد جیسی مسکراہٹ بکھیرے ہوئے ہیں۔

ایک قابل فہم ہیجان کی سی کیفیت طاری ہے کہ کبھی روم آنے اور اس زیارت گاہ کو دیکھنے کی خوش بختی کا تو کہیں تصور ہی نہ تھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے راہنمائی کر دی ہے۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ میری دائیں بائیں کسی طرف کوئی توجہ نہیں۔ رک گئی ہوں۔ سانس کی رفتار تیز ہوگئی ہے۔ سامنے وہ کمرہ ہے۔ جس پر پیتل کی بڑی سی پلیٹ پر لکھا ہوا پڑھنے لگتی ہوں۔

In this room,

on the 23rd of February 1821

Died

John Keats

آنسوؤں کو پلکوں سے نیچے نہ اُترنے میں تھوڑی سی نہیں بہت کوشش کرنی پڑی ہے کہ رُک کر گردن کو پیچھے لے گئی تھی۔

یہ کمرہ اس کے زمانے میں دو حصّوں میں منقسم تھا۔ ایک مالک مکان اینا Angeletti کے تصرف میں اور بقیہ حصّہ جسکا چہرہ میدان کی طرف تھا کیٹس اور جوزف سیورن کے پاس تھا۔

میں نے مارگریٹ (نگران) سے چند لمحوں کیلئے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت لی ہے۔ وہ کمرہ جہاں وہ چھبیس سالہ خوبصورت آنکھوں، چہرے اور خوبصورت دماغ والا شخص موت کے ہاتھوں کی ظالم گرفت میں جکڑتا چلا گیا تھا۔ شیشوں سے پار سکوائر میں زندگی کتنی خوش وخرم، ہنستے، مسکراتے، قہقے لگاتے نظر آ رہی ہے۔

میری تیسری آنکھ کھل گئی تھی جس نے ماہ نومبر کے کِسی چمکتے خوشگوار سے دن کو

سکوائر میں بھاگتی بگھیوں اور اُن میں جُتے گھوڑوں کے سموں کی ٹھپ ٹھپ اُسے سُناتے اور شیشوں میں سے زندگی کو آج ہی کی طرح رواں دواں دکھاتے ہوئے یقیناً اُسے اپنی صحت کے حوالے سے ایک نوید دی ہوگی۔ میٹھی سی اِس نوید نے پل بھر میں گنگناتے خوابوں کو اسکی آنکھوں میں بیدار کر دیا ہوگا۔ وہ خواب جنہیں وہ جوان ہونے کے بعد سے دیکھتا چلا آیا تھا۔

مارگریٹ نے مجھے بتایا ہے کہ منظروں کی یکسانیت میں تب اور آج کے حوالوں سے کچھ زیادہ فرق نہیں۔ میں نے دیکھا تھا۔ بگھیاں تو اس وقت بھی سکوائر میں بعینہ اُن دنوں کی طرح بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھیں۔

اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والے سمجھدار اور ذہین لوگ اپنے تاریخی ورثوں اور اُن مخصوص روایات کو اسی ماحول سے ہم آہنگ کرتے ہوئے وقت کی چال کو اسی روپ میں نہلاتے ہوئے لوگوں کو مسرت و سرشاری سے نوازتے ہیں۔ اب میں مقابلہ ''من وتُو'' میں کہاں کہاں کھپتی اور اپنا خون جلاتی۔

کمرہ اس وقت کتنا چمکتا دمکتا ہے۔ کھڑکی کے پردے کھینچے ہوئے ہیں۔ ڈیتھ ماسک سامنے دیوار پر آویزاں ہے۔ ساتھ ہی چھوٹا سا شوکیس سجا ہے۔ ذرا فاصلے پر ایک بڑا شوکیس اور درمیان میں آتش دان ہے۔ تب یہ کمرہ یقیناً ایسا شاندار تو نہ تھا۔ عام سی دیواروں، چھت اور کھڑکی والا تھا۔

گلاب کے پھول بکتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتا تھا۔ پھول تو آج بھی ہیں۔ یہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جوڑے اُس وقت بھی تھے جب نومبر کی سنہری اُترتی شاموں میں وہ اپنے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں اُتر کر سیر کیلئے بورگیز باغ Borghese جاتا۔ تب نیلے آسمان پر پرندوں کی اڑانیں دیکھتے ہوئے کبھی اس کا دل غم سے بھر جاتا اور کبھی امید اُسے خواب دکھانے لگتی۔

تصور کی آنکھ کھل گئی ہے اور منظر کسی نازنین کی نشیلی آنکھ کے خمار سے بھر گیا ہے۔میٹھی آواز کا جادو چاروں اور پھیل گیا ہے۔''A thing of Beauty'' میرے لبوں پر آ گئی ہے۔ دنیا بھر میں حسن وخوبصورتی کے حوالے سے ایک مثالی محاورہ بننے والا یہ مصرع A thing of Beauty is a joy for ever اُسی شاعر کا ہی ہے۔ جو لافانی ہونے کی تمنا رکھتا تھا۔

حُسن ہمیشہ رہنے والی ایک خوشی ہے
اس کی خوبصورتی بڑھتی رہتی ہے
یہ کبھی فنا نہیں ہوتی
ہمیشہ اپنے وجود کو قائم رکھتی ہے
جیسے یہ ہمارے لئے پھولوں کا کوئی پرسکون کنج ہو
یا نیند جو میٹھے خوابوں سے بھری ہو
جس میں تندرستی یا صحت اور خوشگوار
سانسوں کی مہک ہو

ایسے شعر کہنے والا میٹھے خوابوں کا مژدہ سنانے ،صحت کا پیغام دینے اور مہکتے سانسوں کی روانی رواں رکھنے والا غموں کی بھٹی میں کیوں کر گر پڑا!

اُسے فینی یاد آتی تھی جو لندن میں تھی۔اسکی یاد اسکی آنکھیں بھگو دیتی۔اُس کی محبت، منگنی اور پھر اسکی بیماری کا جان کر التفات بھرے اظہار میں اس کی بے رُخی اور بے نیازی جیسے رویّے۔

مجھے بھی فینی یاد آئی تھی۔ بہت سی یادوں نے گھیراؤ کر لیا تھا۔

فینی ہمسائی تھی اس کی۔ بیوہ ماں کی پہلوٹھی کی اولاد۔سترہ اٹھارہ سالہ مٹیار اور

تیئس 23 چوبیس 24 سال کے جذباتی سے جوشیلے لڑکے کا پیار ہمارے وقتوں کے گلی کوچوں جیسا۔ سانجھی دیواروں سے تانکا جھانکی، چٹوں کی پھینکا پھینکائی اور چھوٹے بہن بھائیوں یا کزنوں کے ہاتھوں چوری چھپے خطوط کا تبادلہ۔ منگنی بھی کروالی تھی۔ پر یار دوستوں کا کہنا تھا کہ یہ خوبصورت لڑکی نا قابل اعتبار ہے۔ مگر اس کا دل تھا کہ بے طرح لٹو تھا۔ ہر دوسرے دن لمبا چوڑا خط لکھنا ضروری ہوتا۔ ہر تیسرے دن محبت کی تجدید چاہتا۔

میری پیاری فینی کیا میں امید کروں تمہارا دل کبھی نہیں بدلے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پیار کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ دیکھو مجھے کبھی مذاق میں بھی دھمکی نہ دینا۔

ایک اور خط میں لکھتا ہے میں بہت حیران ہوتا ہوں کہ آدمی مذہب کیلئے مرتے ہیں تو شہید کہلاتے ہیں۔ میں تو سچی بات ہے اِس خیال اور نظریئے پر ہی تھرّ ااٹھتا ہوں۔ میرا مذہب محبت ہے۔ میں صرف اس کے لیے مرسکتا ہوں۔ میں تمہارے لیئے جان دے سکتا ہوں۔

ایک اور خط دیکھیئے۔ محبت اور چاہت میں بھیگا ہوا۔ دنیا میں کیا کوئی چیز اتنی خوبصورت، چمک دار اور من موہنے والی ہے جتنی تم ہو۔

Bright Star یادداشتوں سے نکل کر لبوں پر آ گئی ہے۔

روشن ستارے

روشن ستارے کاش میں آرٹ کی طرح امر ہو جاتا
میں بھی فطرت کے کسی رسیا کی طرح
جاگتے رہنے والے کسی رشی منی کی طرح
رات کے خوبصورت جلووں میں کبھی اکیلا تو نہ ہوتا
اس ابدی حُسن کو آنکھیں کھول کھول کر دیکھتا

دھرتی کے انسانی ساحلوں کے گرد

رواں پانیوں سے وضوتو کسی پادری کا ہی کام ہے

کیسی خوبصورت شاہکار نظم ۔ابدی چمکنے والے ستارے جیسا بننے کی تمنا۔لافانی ہونے کی خواہش ۔اپنی محبت اور چاہت کا دل آویز اظہار۔

موت سے ایک سال قبل مئی 1820 کا خط ذرا دیکھیئے......

تم کتنی خودغرض ہو،کتنی ظالم ہو۔ مجھے خوش رہنے نہیں دیتی ہو۔میرے لیے تمہاری محبت کی استقامت کے سوا کسی چیز کی اہمیت نہیں۔تمہیں فلرٹ کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔مسٹر براؤن سے بھی یہی سلسلہ ہے۔کیا کبھی تمہارے دل نے میرے بارے میں ذرا سا بھی سوچا ہے۔مسٹر براؤن اچھا آدمی ہے مگر وہ مجھے انچ انچ موت کی طرف لے جارہا ہے۔

اس کے مہکتے خواب بکھر گئے۔دہکتا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن رہا تھا۔اس کے سانسوں کی ڈوری کتنی جلدی ٹوٹ گئی۔

بیماری تو وراثت میں ملی تھی کہ ماں اور بھائی ٹوم دونوں اسی سے مرے تھے۔

مجھے 1816 میں لکھی جانے والی اسکی پہلی First looking into chapman's Homerاور دیگر "ode to a nightingale"اور "ode on a grecian"دونوں یاد آئی تھیں۔

اس نے سارے سفر بڑی سرعت سے طے کیے تھے۔صرف چھ سال کا مختصر سا وقت۔جس میں حیران کن حد تک ہر دل عزیزی سمیٹی۔شاعری،محبت،منگنی،بیماری اور موت۔پہلے مجموعے Chapman's Hamer نے لوگوں کی توجہ کھینچی،مگر ساتھ ہی نک چڑھے نقاد اسے تباہ کرنے پر بھی تُل گئے تھے۔1818 میں اس کی ambitious

زیادہ بہتر رہی۔ یہاں اُسے ہنٹ، ولیم اور بینجمن ہائیڈن نے بہت سراہا۔

1819 اسکی تخلیقی صلاحیتوں کا بہترین زمانہ تھا۔

وہ فینی کی محبت میں گرفتار رہا۔ Bright Star اور The Eve of St Angles جیسی شاہکار نظمیں تخلیق ہوئیں۔

میری نظریں بے اختیار اُس بیڈ پر جم گئی ہیں۔ نہیں جانتی ہوں کہ اس کی ترتیب اُس وقت بھی یہی تھی جو اَب ہے کہ آخری دنوں میں وہ زیادہ تر اپنے بیڈ پر ہی رہنے لگا تھا۔ یہی کھڑکی جو اس وقت میرے سامنے ہے اس کی دلچسپی اور دنیا سے ربط کا واحد ذریعہ رہ گئی تھی۔ اسی سے وہ سپنش سٹپس اور برنینز (Bernins) کشتی کو دیکھتا۔ آسمان، موسم، لوگ، درخت اور زندگی کے کچھ رنگ اسی سے اُسے نظر آتے تھے۔

منظر کسی فلم کے سین کی طرح بدل گیا تھا۔ سکوائر میں فروری کے آخری دنوں کی صُبح کتنی دُھند اور سردی میں لپٹی ہوئی تھی۔ درختوں کی چوٹیوں پر دھرنا مارے بیٹھی برف دنوں پہلے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرتی رہی تھی۔ سارے ماحول پر اُداسی اور تھکن کے سائے لرزاں تھے۔

کمرے میں کھڑے جوزف Severn نے اپنی تھکن کی لالی سے لبریز آنکھوں کو باہر سے اٹھا کر اندر پھینکا ہے۔ چار راتوں سے جاگتا اُسکا جسم اسوقت پھوڑے کی طرح درد کر رہا ہے۔ کمرے کی فضا میں کسی نحوست کے سائے سے بکھرے نظر آتے ہیں۔ دوسرے بیڈ پر گٹھڑی سی بنی ہڈیوں کی مٹھ میں سے ایک دل خراش سی آواز گندی مندی سی منحوس دیواروں سے ٹکراتی کمرے میں بکھرتی ہے۔

''سیورن''(Severn)

سیورن فوراً سے پیشتر اُس گٹھڑی کو کلاوے میں بھر لیتا ہے۔

''سیورن میں مر رہا ہوں۔ میرا سر اوپر کر دو۔ ڈر کیوں رہے ہو؟ سیورن ذرا سا اوراوپر کرونا۔''

چھبیس سالہ جوزف سیورن Severn یادداشتوں میں ابھر آیا ہے۔ یہ سنہری گنگھر یالے بالوں، خوبصورت خدوخال والا دلکش نوجوان آرٹسٹ بہت دن گزرے شاعر کی محبت میں گرفتار ہوا تھا۔ اُن محفلوں میں اُس کا جانا اور شاعر کیلئے محبت کے جذبات رکھنے کی پذیرائی نہ شاعر کی طرف سے ہوئی اور نہ اس کے دوستوں نے اُسے قابل توجہ گردانا۔ مگر وہ اس کے ایک خاموش پرستار کی صورت اُن محفلوں میں جاتا رہا جہاں شاعر اپنا کلام سُناتا تھا۔

سیورن اپنے فن کے مزید نکھار کیلئے روم جانے اور آرٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بڑا خواہشمند تھا۔ موقع ملا تو اس کی تکمیل کیلئے روم چلا آیا۔ محبت اور عقیدت رکھنے والے نے تو کبھی شاعر کی نجی زندگی میں جھانکا ہی نہ تھا کہ اُسے دُکھ کون کون سے ہیں؟

وہ حیران رہ گیا تھا جب اُسے خط ملا۔ کیٹس بیمار تھا۔ اُسے تپ دق تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے روم جانے اور وہاں رہنے کا مشورہ دیا تھا کہ یہاں کی آب وہوا اُس کیلئے صحت کی پیامبر بن سکتی ہے۔ وگرنہ لندن کی سردی اُسے مار دے گی۔ اُسے شاعر کیلئے روم میں گھر لینے اور اُسے اٹینڈ کرنے کی درخواست تھی۔

اور یہ سیورن تھا اور یہی وہ گھر تھا جہاں وہ اُسے لے کر آیا اور اُس کی نرس بنا۔

اُسے لانے اور اسکی خدمت گیری کرنے میں اس کی فیملی کے بہت سے لوگوں کی مخالفت تھی۔ سب سے بڑا مخالف تو باپ تھا جس نے بھّنا تے ہوئے اُسے کہا تھا۔

''تم پیشہ ور آدمی ہو۔ سیکھنے کیلئے روم گئے ہو۔ کیسے اُسے وقت دو گے؟ اپنا نقصان کر کے اور سب سے بڑی بات وہ بیمار ہے۔ چھوت کی یہ بیماری تمہیں لگ گئی تو کیا بنے

گا؟ باز آؤاس سے۔مگر اُس نے نہ کچھ سُنا اور نہ کچھ سوچا۔

چار ماہ کا یہ وقت اگر کیٹس کیلئے تجربات اور دوستوں رشتوں کی پہچان کا تھا کہ کون سے ایسے کڑے وقت اس کے ساتھ کھڑے تھے اور کون سے کان منہ لپیٹ کر روپوش ہو گئے تھے۔تو یہ بھی قابل ذکر بات تھی کہ سیورن اپنی شخصیت کی بھرپور خوبیوں کے ساتھ اُبھر کر اس کے سامنے آیا تھا۔یہی سیورن جسے کیٹس نے کبھی اہمیت ہی نہ دی تھی۔

پہلی بار وہ اُس کے قریب ہوا۔دل کے قریب اور جانا کہ فینی براؤن Browne سے علیحدگی کے غم نے کیسے کیٹس کو غموں کے پاتال میں پھینک دیا تھا۔

وہ کبھی کبھی اُس سے کہتا تو جب میں ٹھیک تھا،تندرست تھا وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔اور جب میں بیمار ہوا اُس کی محبت کہاں گئی؟

کچھ باتیں پھر یادوں میں اُبھری ہیں۔اپنے کِسی خط میں سیورن (Severn) جوزف نے لکھا تھا۔ابھی ابھی وہ سویا ہے۔میرے لیئے ہر دن اُسے نمک کی طرح گُھلتے دیکھنا کتنا تکلیف دہ ہے؟ شاید اگلے ماہ بہت بُری خبر کے ساتھ طلوع ہو۔جب میں اُسے لے کر چلا تھا تو مجھے اس کی صحت یابی کا یقین تھا۔مگر اب؟

ہاں پیسے بھی ختم ہوگئے ہیں۔آخری چند کراؤن ہی رہ گئے ہیں۔بل واپس آ گیا ہے۔بیکر نے چیزیں دینے سے انکار کر دیا ہے۔میرے لیے باہر نکلنا اور دو گھنٹے کیلئے پینٹنگ سے کچھ کمانا ناممکن ہو گیا ہے کہ اُسے میری چند لمحوں کی دوری بھی برداشت نہیں۔کِس امید کا پلّہ اُسے پکڑاؤں۔یہ بہت اذیت میں ہے۔اس کا خدا پر یقین اور ایمان تو پہلے ہی نہیں تھا۔چلو عقیدے کی مضبوطی اور توانائی بھی کہیں تکلیف کی شدت میں کمی کا باعث بن جاتی ہے۔اگر کچھ کہتا ہوں تو لعن طعن سُنتا ہوں۔اب مجھے تو سمجھ نہیں آتی ہے کہ میں کیسے اس کے زخموں پر پھاہا رکھوں۔اور ہاں دیکھو نا زندگی کا کوئی فلسفہ،مذہب کی کوئی تھیوری کِسی نہ کِسی

حوالے سے مُطمئن کرنا اور مُطمئن ہونا بھی کتنا ضروری ہے؟ آنکھیں پھر کہیں وقت کی ٹنل میں گُھس کر ایک اور منظر سامنے لے آئی ہیں۔نڈھال سا ایک جسم۔ایک کمزور شکستہ سی آواز کمرے کے سناٹے میں ذرا سا شور کرتی ہے۔

’’میرا دل اس وقت کیفے Greco میں کافی پینے کو چاہ رہا ہے۔چلو وایا ڈی کون ڈوٹی Via dei condotti چلتے ہیں۔‘‘

سیورن نے جنوری کی اِس یخ بستہ شام میں اُسے دھیرے دھیرے سیڑھیاں اُترنے میں مدد دی۔یہ بھی محسوس کیا کہ اُس کی صحت بہتر ہونے کی بجائے زیادہ خراب ہو رہی ہے۔کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے اُس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

’’جانتے ہو شیلے اور بائرن جب بھی روم آئے اسی کیفے میں کافی پینے آتے ہیں۔سیورن شیلے بھی کیا کمال کا شاعر ہے۔‘‘

اور جب وہ بائرن اور شیلے کے ساتھ اپنی محبتوں کا ذکر کرتا تھا۔اُس نے بہت سے اور اپنے گہرے دوستوں کے نام لینے سے گریز کیا تھا۔اب ہانٹ کی بیوی کو تپ دق ہے۔اس کے ڈھیر سارے بچے ہیں اور اس پر قرضوں کا بوجھ ہے۔اُس نے اپنے خوبصورت سر کو مایوسی سے ’’ہونہہ‘‘ کے سے انداز میں ہلایا تھا۔بچنے اور جان چھڑانے کے کتنے خوبصورت بہانے ہیں۔لیکن یہی تو وہ کڑا مقام ہے جہاں پرکھ کی کسوٹی پر رشتے اور تعلقات پہچانے جاتے ہیں۔

اٹھنے سے قبل اسنے کہا تھا۔

’’Leigh Hunt کی یاد نے مجھے مضطرب کر دیا ہے۔مگر سیورن تمہیں تو میں جان ہی نہ سکا کہ تم کتنے عظیم ہو۔‘‘

اس کی آنکھیں احساس جذبات نے بھگو دی تھیں۔

کیفے ہاؤس کا پرانا بوڑھا اب Saxo phone بجا رہا تھا اور وہ دھیمے دھیمے When I have fears کو گنگنانے لگا تھا۔

When I have fears that I may cease to be

Before my pen has glean'd my teeming brain

اُس کی صحت دن بدن گرتی جارہی ہے۔کتنا بدمزاج اور چڑچڑا ہوتا جارہا ہے۔گالیاں دیتا ہے۔ ہر بات کو شک وشبے کی نظر سے دیکھتا ہے۔ابھی ایک نئے منظر نے دروازہ کھولا ہے کمرے میں شور ہے۔کیٹس ہاتھوں میں پکڑے تکیے کو کبھی بیڈ کی پائنتی ،کبھی اسکے سرہانے اور کبھی کمزور ٹانگوں پر مارتے ہوئے اپنے حلق اور پھیپھڑوں کی پوری طاقت سے چلاتے ہوئے کہتا ہے۔

''تمھیں کیا تکلیف ہے آخر۔میرے لئے عذاب بن گئے ہو۔

مرنے دو مجھے۔لوڈونم Laudanum کی شیشی تم نے کہاں چُھپا دی ہے؟ ذلیل انسان کیوں نہیں دیتے ہو مجھے۔کیا کرنا ہے مجھے زندہ رہ کر۔''

اُس کا سانس اکھڑنے لگا ہے۔بلغم حلق سے جیسے اُبلنے لگی ہے۔سیورن نے فوراً بڑھ کر اُسے کلاوے میں بھر کر اس کا سر جھکاتے ہوئے کہا ہے۔

''پھینکو اسے،نکالو اندر سے۔''

اس کے بازوؤں میں نڈھال سا وہ پھر ضدی بچے کی طرح کہتا ہے۔

''مرنے دو مجھے۔''

اور پھر وہ کسی کٹی شاخ کی طرح اس کے بازوؤں میں جھولنے لگا ہے۔اس نے دھیرے سے اُسے لٹا دیا ہے۔سانس کیسے چل رہا ہے۔آنکھیں بند ہیں۔ چہرہ پسینے سے تر

ہے۔سیورن اس کے بیڈ پر بیٹھا اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے سوچے چلے جا رہا ہے۔ سوچے چلا جا رہا ہے۔

بہت سے اور دن گزر گئے ہیں۔ ہر دن اُسے موت کی طرف لے جا رہا ہے۔ایسی ہی ایک غم زدہ اور المناک صبح میں وہ سیورن کو ہیجانی انداز میں کہتا ہے۔

''مجھے تھام لو۔ڈرو نہیں۔دیکھو موت مجھے لینے کے لئے آ گئی ہے۔میرے جسم کی پور پور میں درد ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ سانس جیسے میری پسلیوں میں ٹھہر گیا ہے۔میرے اندر شاید اب کچھ نہیں ۔خون کا قطرہ بھی نہیں۔شیشوں سے باہر کی دُنیا میں کتنی چہل پہل ہے؟ کتنے رنگ کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں اندر کتنا سناٹا اور کتنی خاموشی ہے؟

کچھ اور دن گزر گئے ہیں۔موسم نے تھوڑی سی انگڑائی لی ہے۔ٹنڈ منڈ درختوں پر سر سبز روئیدگی پھوٹ رہی ہے۔سیورن بے چین اور مضطرب ہے۔اُسے محسوس ہوتا ہے جیسے اُس کا سانس کہیں اٹکا ہوا ہے۔بس کسی لمحے کا منتظر ہے۔اور یہ لمحہ بالآخر تئیس (23) فروری کی شب کو جب سیورن نے اُسے اپنے کلاوے میں بھر کر چھاتی سے چمٹایا تو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب اُس کے اندر سے کوئی چیز نکلی اور پھُر سے بند کھڑکیوں کی کسی چھوٹی سی درز سے باہر نکل گئی۔

خوبصورت کمروں کے ایک پھیلے ہوئے سلسلے میں گُھستے ہوئے بے اختیار ہی میں نے سوچا تھا کہ زندگی میں جن چیزوں کیلئے بندہ سسکتا ہوا مر جاتا ہے۔موت بعض اوقات کتنی فیاضی سے وہ سب کچھ اُسے دان کر دیتی ہے۔ یہ سب جو یہاں بکھرا ہوا ہے اسکے لافانی ہونے کی خواہش کا عکاس ہی تو ہے۔

یہ سیورن کا کمرہ ہے۔اُن تصویروں کے پاس کھڑی ہوں جو کیٹس کے بھائیوں کے پوٹریٹ ہیں اور جنہیں سیورن نے بنائے۔فینی براؤن کے پوٹریٹ کو بہت دیر دیکھا ہی

نہیں اُس سے باتیں بھی کیں۔

''کبھی تم نے اپنے مقدر پر رشک کیا۔تم عام سے گھر کی عام سی لڑکی جسے شاعر کی محبت نے کتنا خاص بنا دیا کہ انجانی سرزمینوں اور دور دیسوں کی لڑکیاں اور عورتیں شاعر کو پڑھنے والے مرد اور لڑکے تم سے محبت اور نفرت کے ساتھ ساتھ تم پر رشک بھی کرتے ہیں۔

Leigh Huntاور ولیم ورڈز ورتھ کے پوٹریٹ۔کیٹس کا لائف ماسک اور اس کی نظموں کے پہلے ایڈیشن یہاں ہیں۔

بڑے کمرے میں کرسیاں ،تصویریں،خوبصورت فرش،چھت کو چھوتی الماریاں،دنیا بھر کے رومانی لٹریچر کے خزانوں سے بھری ہوئیں۔نادر اور نایاب چیزوں سے سجی ہوئیں۔ چھوٹا سا دروازہ ساتھ کے کمرے میں کھلتا ہے۔شوکیسوں میں اسکے سکرپٹ،فریم کیے ہوئے خطوط، ڈرائینگز کیٹس کی مدح میں ایک سونیٹ،اسکے سنہری بال،فینی کی انگوٹھی،آسکر وائلڈ کی تحریر،والٹ وٹمین Walt Whitman کی ذاتی لکھائی میں لکھا گیا مضمون۔ماسک جیسے بائرن نے venetian carnival پر پہنا۔الزبتھ Barrett کا تعریفی خط اور خوبصورت سینریاں سب ماحول کو اُس مخصوص فضا میں لے جاتے ہیں۔مجسمے اور دیدہ زیب فرنیچر شان میں مزید اضافے کا موجب ہیں۔

اِسے میوزیم بنا دینے کی داستان بھی بڑی عجیب ہے۔

وہ کمرے جن میں کیٹس اور سیورن رہے تھے اُن میں 1903 میں امریکی لکھاریوں کا ایک جوڑا ماں بیٹا جمیز وال کوٹ Walcott یہاں ٹھہرے اور انہوں نے یہاں کافی وقت گزارا۔دونوں کو بڑا تجسّس تھا۔کمروں کی حالت ناگفتہ بہہ تھی۔خاتون اسے خریدنا اور ایک یادگار کے طور پر محفوظ کرنے کی حد درجہ خواہش مند تھی۔جذبے بڑے طاقتور تھے مگر پیسہ پاس نہیں تھا۔انہی دنوں ایک امریکی شاعر رابرٹ انڈر روڈ جانسن نے اسے

دیکھا اس کی ابتر حالت نے اسے بہت متاثر کیا۔ روم میں رہنے والے بہت سے امریکیوں کو اس نے آواز دی۔ ان کاوشوں نے برطانوی ڈپلومیٹ رینل روڈ (Rennell Rodd) کی توجہ کھینچی۔ اُس نے اس اجلاس کی صدارت کی۔ جس نے گھر خریدنے اور اس ادبی ورثے کو محفوظ کرنے کی حکومتی سطح پر کاوشیں کی تھیں۔

1906 میں اسے ایڈورڈ ہفتم کی مالی اعانت سے خریدا گیا۔

دوسری جنگِ عظیم میں بھی اسے نازیوں کے ہاتھوں محفوظ کرنے کی حد درجہ کوششیں ہوئیں۔ چھوٹے سے سینما گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر ڈاکومنٹری دیکھی۔ گفٹ شاپ میں کتابوں کی قیمتوں کا جائزہ لیا۔ میرے حساب سے مہنگی تھیں۔ تین دن میں نے روم میں رہنا تھا۔ کتابوں کی دکانوں پر جانا بھی ضروری تھا تو جلدی کا ہے کی ہے۔ خود سے کہا گیا۔

دونوں لڑکیوں کو رخصت ہونے سے قبل خدا حافظ کہا۔ اُن کی یہ بات کتنی اچھی لگی تھی۔ یہاں آنے والے کچھ لوگوں کو علم ہوتا ہے کہ وہ کہاں آئے ہیں۔ مگر کچھ لوگ جب یہاں سے رُخصت ہوتے ہیں۔ تب جانتے ہیں کہ وہ کہاں آئے تھے۔

اس کی قبر پر کیا عمدہ لکھا ہوا ہے۔ مارگریٹ نے ہی بتایا تھا۔

یہاں وہ شخص لیٹا ہوا ہے۔ جس کا نام پانیوں پر لکھا ہوا ہے۔

کاش وہ اپنی چھوٹی سی عمر میں جان سکتا کہ صدی کی اگلی نصف دہائیاں اُس کے لئے بے پناہ شہرت لے کر آنے والی ہیں۔

اور وہ وقت بھی آنے والا ہے جب وہ سب سے زیادہ پسندیدہ اور کوٹ کرنے والا شاعر بن جائے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر تھانگ منگ شنگ سے ملاقات

بیجنگ میں مجھے کس ادیب اور کس شخصیت سے ملنے کی ضرورت ہے؟ شعیب بن عزیز سے بہتر بھلا میرا کون صلاح کار ہوسکتا ہے؟ مدعا گوش گزار کیا۔

’’ظفر محمود سے بات کرو۔ چین پر اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتا ہے۔‘‘ ظاہر ہے اب ظفر محمود کو ہی آواز دینی تھی۔ سو دی۔ انہوں نے ایک فون نمبر لکھوایا۔ تھانگ منگ شنگ کا نام بتایا۔ یہ بھی کہا کہ موصوف شعبہ پاک چین سٹڈیز پیکنگ یونیورسٹی کے سربراہ ہیں۔ اُن سے ملنا آپ کے لیے ضروری بھی ہے اور فائدہ مند بھی۔

عمران (داماد) نے سفارت خانے کے پریس آتاشی سے بات چیت کے بعد بتایا کہ موصوف پاک چین دوستی کے حوالے سے بہت متحرک شخصیت ہیں۔

پس تو آج تھانگ منگ شنگ سے ملنے جانا تھا۔ کل شام عمران نے بات کی تھی۔ وقت مانگا تھا۔ اپنا حوالہ دیا تو تصدیق مانگی جو اس نے فوراً دی اور دس بجے صبح کا وقت طے ہوگیا تھا۔

پیکنگ یونیورسٹی کہیں اللہ میاں کے پچھواڑے ہی تھی۔ عمران نے اِسے بیجنگ کا جنوب کہا تھا۔ میرے حسابوں سمت خواہ مشرقی ہو یا مغربی، شمالی ہو یا جنوبی سین ہر جا ایک سے ہوں گے سو فی صد درست تھی۔ وہی نظر نواز عمارتیں، کہیں آسمان کو چھوتی اور کہیں درمیان میں لٹکتی مٹکتی، وہی اور ہیڈ برجوں پر چڑھتے اترتے لوگ، وہی کناروں پر سائیکلوں اور سیکوٹیوں پر بیٹھی عورتیں اور لڑکیاں، وہی ٹریفک کا اژدھام، گاڑیوں کی ریل پیل، وہی میرے حاسدی دل سے اُٹھتی ہوکیں۔

یونیورسٹی بارونق جگہ پر تھی۔ شاندار عمارتوں کے سلسلے، سرسبز لان اور طلبہ کی دائیں

بائیں آنیاں جانیاں۔اپنا وقت یاد آیا تھا۔ڈھاکہ یونیورسٹی یاد آئی تھی۔جہاں کہیں چین نواز اور کہیں روس نواز لڑکیاں ماؤ اور لینن کے نعرے لگاتی تھیں۔تب سوچا کرتی تھی یہ ماؤ اور لینن کتنے بڑے لیڈر ہیں؟ کوئی بیٹھا چین میں اور کوئی روس میں ہے۔پر اجنبی ملکوں کے لڑکے لڑکیاں ان کے لیے پاگل ہو رہے ہیں۔اور تب کیا میں نے لمحہ بھر کے لیے بھی کبھی سوچا تھا کہ میں عمر کے کسی حصّے میں اِن بڑے لوگوں کے دیس جاؤں گی۔یقیناً نہیں۔

گاڑی جب پارکنگ ایریا میں پارک کی تو وقت یہی کوئی پونے دس کا تھا۔ایک دو لوگوں سے پوچھا۔کچھ صحیح چلے کچھ غلط۔ڈپارٹمنٹ تو دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔سامنے ایک سہ منزلہ عمارت تھی۔سوچا چلو ذرا گھومتے پھرتے ہیں۔ایک جانب قدرے ویرانے میں اُترتی سڑک پر ہو لیے۔پھر کال کی۔تھوڑی سی راہنمائی اور جھیل کی طرف آنے کی ہدایت کی گئی۔راستے پتھریلے تھے۔باڑیں خوبصورت اور گردونواح حسن و رعنائی سے بھرا ہوا تھا۔خصوصی طور پر وہ بلند و بالا منفرد ٹائپ کا پگوڈا جس کے عین سامنے انتظار کا کہا گیا تھا۔سامنے ایک وسیع و عریض جھیل پھیلی ہوئی تھی۔مگر کشتیاں کہیں نہیں تھیں؟ بھلا یونیورسٹی کی جھیل ہو اور کشتیوں کے بغیر۔رومانس کہاں ہوتا ہوگا؟ چینی کیا اتنے روکھے پھیکے سے ہیں۔

اب داماد سے سن گن لینے لگی۔ساتھ ہی تصویر کشی بھی شروع کر دی۔

ساس اور داماد تصویر کشی میں مصروف تھے جب وہ تشریف لائے۔درمیانی قامت پر قدرے فربہی مائل جسم۔محبت سے ملے چند تصاویر اُن کے ساتھ بھی بنوائیں۔اور آفس کی طرف بڑھے جو قریب ہی ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت میں تھا۔عمارت میں سناٹا تھا۔نائب قاصد یا چپڑاسی نام کا کوئی بندہ نہ بندے کی ذات کا یہاں وجود نہ تھا۔کمرہ اوپر کی منزل میں تھا مگر خدا کا شکر کہ سیڑھیاں انتہائی آرام دہ تھیں۔اتنی بڑی پوسٹ کے بندے کا

کمرہ چھوٹا ہی نہ تھا بلکہ سادگی میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔میز کمپیوٹر، پرنٹر اور ریسرچ کے پیپروں سے بھری کچھ کہانیاں سناتی تھی۔میرے حسابوں ان کی پوسٹ یا عہدہ اکیسویں گریڈ سے کیا کم ہوگا؟ مگر پاکستان جیسے غریب ملک میں اِس عہدے کے بندے کی دفتری شان و شوکت اور کروفرّ کا دیکھنے سے تعلق ہوتا ہے۔کمرے کے کسی کونے میں کسی چھوٹی موٹی میز پر کوئی الیکٹرک کیٹل چائے یا قہوے کے کپ کوئی ٹی بیگز کا ڈبہ کچھ نہ تھا۔

کمرے کے جائزے سے فارغ نگاہیں اب ان پر جم گئی تھیں۔''کچھ پاکستان بارے اپنے تاثرات بتایئے۔اتنا آنا جانا لگا رہتا ہے آپ کا۔''

کچھ بتانے کچھ کہنے کی بجائے سب سے پہلے انہوں نے ایک پاکستانی ادیبہ بارے پوچھتے ہوئے کہا۔''اب نام یاد نہیں آ رہا ہے۔پر بقیہ بہت سے حوالے یاد تھے انہیں۔غصیلی ہے۔ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی ہے۔بحث بہت کرتی ہے۔کالم نگاری کمال کی ہے۔شاعرہ بھی ہے۔عورتوں کے حقوق بارے بھی بڑی متحرک ہے۔''بڑی معصومیت سی تھی لہجے میں۔''کشور ناہید کی بات کرتے ہیں شاید آپ۔''''ہاں ہاں''کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

میری یادوں میں اپنا پہلی بار پاکستان جانا یاد ہے۔پاکستان جانے کا ایک کریز تھا۔میرے جانے کی خبر جب میرے قریبی عزیزوں کو ملی تو اُن کی فرمائشیں شروع ہوگئیں۔ہمارے لیے گھڑی لانی ہے۔کوئی جوتوں کی بات کرتا تھا۔1980 سے 1987 تک کے دوران مجھے یاد ہے چینیوں کی پاکستان جانے والوں سے کچھ ایسی ہی فرمائشیں اور مطالبات ہوتے تھے۔اس وقت 240 فی کس آمدنی ایک پاکستانی کی اور چینی کی 140 فی کس تھی۔مگر اب معاملات کی صورت یکسر فرق ہو چکی ہے۔آج پاکستانی فی کس 1600 اور چینی 4000 ہزار۔اور یہ بھی کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ یہی وہ پاکستان ہے جس کو ہم

1970 میں اپنا استاد مانا کرتے تھے۔1960 میں اس کے کراچی جیسے شہر کو دیکھ کر حسرت سے کہتے کہ کاش ایسا ایک شہران کے پاس بھی ہو۔ جہاں اتنی فلک بوس عمارتیں ہیں۔

ایک دو پل کی خاموشی کے بعد پھر گویا ہوئے۔چینی لیڈروں نے اپنے لوگوں کو ایک خواب دکھایا تھا۔چین کی نشاۃ ثانیہ کے حصول کا خواب۔چین کی پرانی اور نئی نسل کی امنگوں کا ترجمان جس میں اقتصادی، سیاسی، ثقافتی، سماجی اور ماحولیاتی ترقی جیسے اہم عناصر شامل تھے۔ترقی کے اوائل 1987 کے دن جب دنیا سے کٹی ہوئی اس قوم کو صرف چھ انڈے اور آدھ کلو چینی پورے ماہ کے لیے ملتی تھی۔

اگر آج ہم دنیا کی دوسری اکنامک پاور ہیں تو تعاقب میں جدوجہد بھی بے مثال ہے۔محض چالیس سال میں اس قوم اور ملک نے اپنے اہداف حاصل کیئے اور مزید کے لیئے سرگرم ہے۔ایسے ہی خواب ہماری حکومتوں نے پاکستانیوں کو بھی دکھائے۔ان کی طرف بڑھنے اور اُن کی تکمیل کرنے کو کہا اور دل سے چاہا کہ وہ کامیاب ہوں۔مگر مجھے دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستانی حکومتیں سنجیدہ نہیں ہیں۔سچ تو یہ ہے کہ پاکستان اقتصادی ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا ہے۔

میرے دل کی دنیا اِن باتوں سے بڑی اُتھل پُتھل سی تھی۔کیسی بدنصیب قوم ہیں ہم۔اس تنزلی اور زوال کی وجوہات سے میں اپنے حسابوں آگاہ تو تھی۔مگر ڈاکٹر تھانگ کا نقطہ نظر کیا تھا؟ یہ جاننا بھی تو ضروری تھا۔تو سوال ہوا اور جواب کچھ یوں تھا۔میرے حسابوں آپ کی قوم میں چند چیزوں کا فقدان ہے۔یہ ذہین ہیں۔مگر پتہ مار کر کام کرنے کی عادت نہیں۔شارٹ کٹ راستوں کے متلاشی رہتے ہیں۔ راتوں رات امیر بننا چاہتے ہیں۔ویسے اثاثوں اور پیسوں کی تقسیم تو 5 فی صد کے ہاتھوں میں ہے۔امیر غریب کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے۔سیاسی استحکام نہیں اور اِسے پیدا ہونے بھی نہیں دیا

جاتا۔قابض لوگ نظام کی بہتری کو متاثر کرتے ہیں۔

اچھی مخلص، سمجھ دار اور ایماندار لیڈر شپ کا بھی بحران رہا۔کچھ مخلص اور کرشماتی شخصیت کے لیڈر ملے بھی۔وہ آئے بھی۔انہیں کام کرنے کا موقع دینے کی ضرورت تھی۔مگر سازشوں اور غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے بساط سیاست ہی لپیٹ دی گئی۔بھئی ٹانگیں نہ کھینچو۔قومی نوعیت کے پروگرام کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتے۔ان پروگراموں کا تسلسل حکومتوں کے آنے جانے سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔آئیڈیل لوگ اور آئیڈیل نظام کہیں نہیں ملتا۔ہمارے ہاں ماؤ جیسے فکری لیڈر کے ہاں بھی غلطیوں کے ڈھیر ہیں۔مل کر چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔کہیں خود پیچھے ہٹیں۔کہیں انہیں ہٹائیں۔ایک دوسرے کو space دیں تا کہ انہیں بھی آسمان نظر آئے۔

میں پندرہ بیس سال سے پاکستان مسلسل آجا رہا ہوں۔پاکستان کو ٹھوس اقدام اٹھانے ہوں گے۔گذشتہ پانچ سالوں سے سی پیک پر جس رفتار سے ترقی ہونی چاہیے۔نہیں ہوئی۔

اگر میں صرف 2018 کی پاکستان جانے کی تفصیلات کا ذکر کروں تو یہی صرف دس کے قریب ہوتی ہیں۔کہیں مختلف سیمناروں میں اور کہیں انڈسٹریل زون کارپوریشنوں پر بات چیت کے لیے۔مگر مجھے بہت دکھ سے کہنا پڑ رہا ہے کہ پاکستان میں کوئی 110 کے قریب زون ہیں لیکن ان کی پالیسیاں ہی واضح نہیں۔سیمناروں کا رواج زیادہ بڑھ گیا ہے میری تمنا عملی طور پر سیمناروں کی ہے نہ کہ روٹین کی خانہ پریاں۔نشستند و برخاستند والی بات نہیں ہونی چاہیے۔اہلِ شعور لوگوں کو اِن سیمناروں میں پورا لائحہ عمل دیں۔وقت کا تعین، ٹھوس اقدامات اور عمل ہو۔پاکستان میں ترقی کی رفتار بہت تیز ہونی چاہیے ہے۔اب چین میں تین چھٹیاں بھی وارہ ہیں پہلے بہت کم تھیں۔

پاکستانیوں کی ایک عادت سے بھی مجھے بہت شکایت ہے کہ ابھی دفاتر میں کام پوری طرح شروع بھی نہیں ہوا کہ چائے کے لیے گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چائے اور وہ ماشاءاللہ سے دودھ والی۔ اکثر تو کڑک والی پیتے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ ہر میل ملاقاتی کی آمد پر جاری رہتا ہے۔

سچی بات ہے۔ میرا دلی تعلق اس ملک سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں اگر آپ چائنا سے محبت کرتے ہیں تو پاکستان سے بھی محبت کریں۔

☆☆☆

اِک معجزہ میری زندگی کا

ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کا عشق کب شروع ہوا؟ ماضی کو کھنگالنے اور اس میں اوپر نیچے دبی یادوں کی گٹھڑیوں میں پھولا پھرولی سے وہ صبح آنکھوں کے سامنے آگئی تھی، جب ہم نصف درجن لفنگی دوستوں کا ٹولہ کالج گراؤنڈ میں بیٹھا تھا۔

مجھے یادنہیں۔شاید کسی بات پر ہاتھ لہرایا ہوگا۔صوفیہ نے یکدم میرے دائیں ہاتھ کو پکڑ کر آنکھوں کے سامنے کیا اور صرف چند لمحے اُسے بغور دیکھنے کے بعد گویا ہوئی۔

''کمبخت یہ تُو آئن سٹائن کی ماں کہاں سے پیدا ہوگئی ہے؟''

اُس کے چہرے کی سنجیدگی اور اُس کے انداز اس درجہ ڈرامائی سے تھے کہ پورا ٹولہ بشمول میرے سنجیدہ ہوکر اُس کا چہرہ تکنے لگا۔''دیکھو! دیکھو! اس کی دماغ کی لکیر۔'' اُس نے میری ہتھیلی اُن سب کے سامنے پوری طرح کھول دی۔صاف سُتھری، گہری اور سُرخی سے بھری ہوئی اُوپر کی انتہا سے شروع ہوکر نیچے کی انتہا میں گُھس گئی ہے۔

''ارے گُھنّی کہیں کی؟ تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے۔بتایا کیوں نہیں اب تک؟

بھئی میرا چھوٹا چچا اس علم کا بڑا ماہر ہے۔ایک ہی گھر میں رہنے کی وجہ سے اکثر و بیشتر مجھے اُن سے تھوڑی بہت جانکاری ملتی رہتی ہے۔

''تم سٹوڈنٹ تو کوئی غیر معمولی نہیں ہو۔پر ایسی لکیر تو جینئیس 1.25 ملین سیل کے حامل لوگوں کے ہاتھوں پر ہی ہوتی ہے۔''

سچی بات ہے اُس نے مجھے میری ذات کے ایک پوشیدہ پہلو سے متعلق تحیّر بھرے انکشاف سے دوچار کردیا تھا۔اور یہ کیسی عجیب سی بات تھی کہ جب میں اُٹھی مجھے خود میں ایک

انفرادیت نما بڑے پن کا احساس ہوا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے اس علم کو سیکھنے کا فیصلہ کیا۔

ایک جوانی ،شوریدہ سر جذبوں کی فراوانی، اوپر سے کسی خصوصی ٹیلنٹ کی دریافت،آسمان کو تو تھگلی لگانے کو جی چاہتا تھا۔

اب کتابوں کی تلاش تھی۔اللہ مارے مُنشی عالم اور مُنشی فاضل کی سان پر چڑھے میرے گھرانے میں کتابوں کی یقیناً کوئی کمی نہ تھی۔اس موضوع پر ایک آدھ نسخے کا مل جانا کوئی مشکل امر نہ تھا۔ملا۔پڑھا۔ پیاس بڑھی۔اس مخفی علم کے تھوڑے سے اسرار کُھلنے پر ھَل مِن مَزِید کا مطالبہ ہوا۔

کیرو کی Language of the Hand کے بعد اس علم کی Lover نوئل جیکوئن کی Practical Palmistry تلاش کی۔کومٹ کو پڑھا۔مطالعہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرا ہاتھ قطعی غیر معمولی نہیں۔فطین لوگوں کی دماغی لکیر کے ساتھ ساتھ بے شمار دیگر علامات کا ہونا ضروری ہے۔

پر اِس انکشاف نے مجھ پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ مجھے چسکہ لگ گیا تھا۔ٹکا ٹکا سنبھالتی اور اس شوق کی بھینٹ چڑھاتی۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے مجھے دہلا دیا۔

یہ جاتی بہاروں کی ہی ایک شام تھی۔ہم سب کزنز اپنے آنگن میں آگ پر ہولیں (کچے چنے کے پودے) بھونتے تھے۔جب ہماری اماں گھر میں داخل ہوئیں۔بلند آہنگ آواز میں ’’سبحان اللہ،سبحان اللہ‘‘ کہتے ہوئے وہ گویا ہوئیں۔

’’مولوی صاحب چترال اپنے گاؤں سے دُلہن بیاہ کر لائے ہیں۔مانو جیسے سُلفے کی لاٹ ہے۔کمرے میں بیٹھی جگمگ جگمگ کرتی ہے۔‘‘

ہمارے محلے کی مسجد کے ادھیڑ عمر مولوی، صاحب علم، صاحب ایمان اور صاحب کردار انسان تھے۔

میں نے کالک میں لُتھڑے اپنے ہاتھ منہ صاف کیے اور اُنکے حجرے کی طرف بھا گی۔ سُرخ اوڑھنی میں اُس کے سنہری بالوں میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایسی نشیلی، ہری کچور شفاف بولتی آنکھیں کہ جن میں ڈوب جانے کو جی چاہے۔ رعب حُسن سے میری بولتی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

تھوڑی سی اور شناسائی ہونے پر میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ عام سا ہاتھ تھا کوئی خاص بات مجھے محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جلد ہی اُس کی اُردو خاصی بہتر ہوگئی۔ محلے کی عورتوں سے ہر دم رابطے میں رہتی تھی۔ ایک دن ایک خوبصورت جوان لڑکا وہاں بیٹھے دیکھا جو اُس کا کزن تھا۔ ''اسکا ہاتھ دیکھو۔''

جونہی میں چٹائی پر بیٹھی اُسنے لڑکے کا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ میں اُسوقت بائیس تئیس (22-23) کے ہیر پھیر میں تھی اور میرا پامسٹری کا شوق جنون میں بدل کر مجھے ہمہ وقت پاگل کیے رکھتا تھا۔

میں نے ہاتھ پکڑا۔ زندگی کی لکیر تو ٹھیک ٹھاک تھی۔ پر حادثاتی موت کی ایک علامت جسے تھوڑے دن پیشتر میں نے کہیں پڑھا تھا وہاں موجود تھی۔

میں اتنی احمق تو نہیں تھی۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسکی عمر تھوڑی ہے۔ یقیناً اس وقت میں نیم ملا خطرۂ ایمان اور نیم حکیم خطرۂ جان کی تفسیر بنی ہوئی تھی اور اپنے اُس محدود سے علم کی خودنمائی کے اظہار کے لیے بے قرار تھی۔ پامسٹری کے بنیادی اُصولوں کو بھول گئی تھی۔

پھر میرا اڈھا کہ یونیورسٹی میں داخلہ ہوگیا اور میں وہاں چلی گئی۔ اس شوق کا اظہار

وہاں بھی کُھل کر ہوا۔ جب واپس آئی تو اس پری وش سے ملنے گئی۔ باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ رُکی اور بولی۔

تمہیں یاد ہے میرا وہ بھائی جس کا تم نے ہاتھ دیکھا تھا، مر گیا ہے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میرا سانس رُک گیا ہے۔ ''کیسے''۔ میں ہکلائی۔

گاڑی چلا رہا تھا۔ پہاڑوں کے ساتھ تنگ کچے راستے پر نیچے گہری گھاٹیاں تھیں۔ گاڑی سمیت لڑھک گیا۔ جیسے کہیں بم پھٹ جائے اور انسان کی دھجیاں اُڑ جائیں۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ وہاں سے اُٹھی گھر آئی، پر کیسے؟ سارے میں ہاہا کار مچی ہوئی تھی۔ وجود جیسے ملامتی فرقہ بن گیا تھا اور ضمیر نے طعن و تشنیع کے تیر و تفنگ کے مورچے سنبھال لیے تھے۔ اس اس انداز میں گولہ باری ہوئی کہ میں دنوں کیا ہفتوں نڈھال رہی۔ میرے شوق و جنوں کے سارے منہ زور جذبوں کو جیسے کسی نے لگام سی ڈال دی۔

پھر انہی دنوں زندگی میں بڑی دلچسپ سی تبدیلی آ گئی۔ شادی کے ہنگاموں نے اس حادثے کی تلخی کو کم کر دیا۔ ایک عجیب سی بات کہ میں نے اپنے شوہر کا ہاتھ دیکھنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کبھی اگر خواہش مچلتی بھی تو لڑکے کی صورت آنکھوں کے سامنے آ کر اُسے گیلا سا کر دیتی۔

میرے ہاں دوسرے مہمان کی آمد آمد تھی جب ملک کے نامور دست شناس جناب ایم۔ اے ملک کی کتاب ''ہاتھ کی زبان'' مارکیٹ میں آئی۔ ملک صاحب سے میرا عقیدت و محبت اور احترام کا رشتہ تھا۔ ہاتھ ہمارے درمیان مشترکہ دلچسپی کا موجب تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے سوشل ورک ڈیپارٹمنٹ اور اردو ڈائجسٹ کے دفتر میں میری اُن سے لمبی نشستیں جمتی تھیں۔ کتاب انہوں نے اپنے دستخطوں کے ساتھ مجھے بھجوائی۔ اب بھلا مطالعہ کیسے نہ ہوتا؟ تفصیلی ہوا۔

اور ایک خوفناک انکشاف نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔

ملک صاحب نے کتاب میں غیر طبعی موت کی آٹھ یا غالباً دس علامات کا ذکر کیا تھا۔کافی کا مجھے علم تھا پر دو میں نئی دیکھ رہی تھی۔ یونہی میں نے اپنے ہاتھ پر نگاہ ڈالی۔ پل بھر کے لیے مجھے محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں مائینز بچھی کسی زمین پر پڑ گئے ہیں اور زبردست قسم کے ایک جان لیوا دھماکے نے مجھے اُٹھا کر منہ کے بل پھینک دیا ہو۔

میں نے آنکھیں ملیں۔ ہاتھ کو دوبارہ دیکھا۔میرے ہاتھوں پر اُن میں سے ایک علامت بڑے واضح انداز میں جگمگا رہی تھی۔ میں باہر تیز روشنی میں بھاگی۔ پھر ہاتھ پر نظریں جمائیں۔ کتاب پر نظریں دوڑائیں۔ پھر بھاگی۔ آٹے کے کنستر میں ہاتھ ڈالے۔ پھونک سے فالتو خشک آٹا اُڑایا اور ہتھیلیوں کو پوری توانائی سے کھول دیا۔لکیر اور نمایاں ہوگئی تھی۔

یہ صحت کی لکیر تھی۔ پامسٹری کے مطابق صحت کی لکیر اگر دل، دماغ اور قسمت کی لکیروں کو کاٹتی ہوئی زندگی کی لکیر کو چھوتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے تو جس مقام پر یہ زندگی کی لکیر کو کاٹے گی وہی ڈیتھ پوائنٹ ہوگا۔ بے شک لائف لائن کتنی ہی لمبی، صاف سُتھری، گہری اور شوخ کیوں نہ ہو۔

میرے ہاتھ پر میری صحت کی صاف، گہری، شوخ اور لمبی لکیر جس مقام پر میری لائف لائن کو کاٹ رہی تھی پامسٹری کے تعین کردہ وقت کے مطابق وہ پینتیس چالیس سال کا دورانیہ تھا۔

کتابوں کے انبار میں دبی پڑی کیرو اور نوئل جیکوئن کی Secrets of Hand Reading نکالیں۔ یہ علامت اُن میں موجود تھی اور یہ میرے ہاتھ پر بھی موجود تھی۔

میں حیران تھی یہ علامت اس سے پہلے میری نظروں سے کیوں نہیں گزری؟ مجھے اپنی قابلیت کا کوئی دعویٰ نہیں تھا۔ پر اب میں اس میں اتنی کمزور بھی نہیں تھی۔ مجھے یاد تھا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وی سی ابوسعید چودھری اور حسینہ واجد دونوں کے ہاتھ دیکھنے کا بھی مجھے موقعہ ملا تھا، دونوں کو جو کچھ بتایا تھا وہ آنے والے وقتوں نے درست ثابت کیا۔

اب ذرا پل بھر کے لیے اس صورت حال کے قلب میں جھانک کر سوچیے تو سہی۔ بلندیوں پر کمندیں ڈالنے کے عزائم رکھنے والے کو ایکا ایکی احساس ہو کہ زندگی کا پٹاخہ چل گیا ہے اور سارے منصوبوں اور ارادوں کی ہوا سے بھرا ہوا غبارہ موت کی نوکیلی سُول کے ایک ہی ہلےّ سے پچک کر لجلجی شکل میں باقی ہے۔

دو سالہ پیاری سی بیٹی میرے سامنے تھی۔ پیٹ میں ایک نیا وجود کدکڑے لگاتا تھا۔ میرے سامنے نہ شوہر تھا نہ گھر۔ میرے بچے، ماں کے بغیر بچے، جیسے میرا کلیجہ پھٹا اور آنسو یوں بہے جیسے صحت مند بکرے کی گردن پر پوری طاقت سے چُھری چل جائے اور خون کے فوارے اُبل پڑیں۔

دل کا موسم ہی باہر کے سارے موسموں کی جان ہے اس کا صحیح ادراک ہی اب ہوا تھا۔ آسمان کی نیلاہٹیں، درختوں کے ہرے کچور رنگ، پھولوں کی خوشبوئیں، خلقت کی ہماہمی اور نفسانفسی سب جیسے گھنیری اُداسیوں میں لپٹ گئے تھے۔ سوچا۔ ایم۔ اے ملک کے پاس جاؤں۔ شاید کہیں کوئی نقطہ، کوئی مربع نما نشان، کوئی مدھم سی مثلث، کوئی ستارہ ،کوئی مچھلی کا نشان، کوئی تقویت دیتی لائن جو میری نظر سے اوجھل ہو۔ پر جیسے میرا اندر کسی ایسی موہوم امید پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا کہ طاقتور مائیکروسکوپ نے ہاتھ کے چہرے کا ایک ایک نقش اُجاگر کر رکھا تھا۔

بایں ہمہ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں ''شاید'' آس کی ننھی منی کرن کی صورت میں

بھی موجود تھا۔

اُن دنوں ایم۔اے ملک صاحب نے گڑھی شاہو میو روڈ پر ایک کمرشل بلڈنگ خریدی تھی اور وہ شام کو وہیں بیٹھا کرتے تھے۔آنسو بھل بھل کرتے میری آنکھوں سے بہنے لگے تھے جب میں نے اُنہیں تفصیل سنائی۔

''ارے ارے محبت بھرا دلاسہ تھا۔چلو دیکھتے ہیں۔گھبراتی کیوں ہو؟''

انہوں نے ہاتھ کا پرنٹ لیا اور تین دن بعد اپنے یونیورسٹی والے گھر میں ہی آنے کا کہا۔مقررہ دن جب میں انکے گیٹ پر کھڑی بیل پر ہاتھ رکھنے ہی والی تھی، کہیں میرے اندر سے آواز آئی۔

اور اگر انہوں نے تمہارے اس خدشے کی تصدیق کر دی تو کیا کرو گی؟ تمہیں خدا پر بھروسہ نہیں کہ وہ تقدیروں کو بدلنے پر قادر ہے۔میرے اندر جیسے طوفان سا آ گیا۔گھنٹی بجانے کی بجائے میں یونیورسٹی کی طرف مُڑ گئی۔پاؤں میں جیسے پہیے سے لگ گئے۔کسی تنہا گوشے کی تلاش مجھے اُڑائے لیے جا رہی تھی۔اُن دنوں یہاں ویرانی اور سناٹا تھا۔رہائشی گھروں اور یونیورسٹی کے درمیان ایک سنسان جگہ پر میں ڈھیر ہوگئی تھی۔کتنی دیر سجدے کی یہ صورت رہی۔کتنا آہوں اور آنسوؤں کا طوفان بہا۔یہ سب یاد نہیں۔ہاں کچھ اگر یاد ہے تو بس اتنا کہ جب ہوش آیا اور سجدے سے سر اُٹھایا تو سرمئی سا اندھیرا فضا پر چھا رہا تھا۔

تین سال تک میں کانٹوں بھری صلیب پر چڑھی رہی۔

تقدیر اٹل ہے۔لکھا ہوا نہیں ٹلتا۔ہونی ہو کر رہتی ہے۔جیسے الفاظ کہیں پڑھتی یا سُنتی تو جیسے وحشت یوں طاری ہوتی کہ آگ لگ جاتی۔کوٹھے کے بنیروں کو چھوتے شعلے جیسے سب کچھ جلا کر خاکستر کرنے پر مائل ہو جاتے۔گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔باہر نکل جاتی۔گھر سے دور کسی ویران سے پارک کے کسی کنج میں بیٹھ جاتی۔نگاہیں فضائے بسیط کی لامحدود

وسعتوں کی جانب اُٹھتیں اور میں شکست خوردہ آواز میں اُس سے مخاطب ہوتی۔

میں فقیر ہوں تیرے در کی۔ مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹانا تو نے۔

پھر جیسے دریا میں طُغیانی آ جائے۔ میری آواز گلوگیر ہو جاتی۔ سارے جہاں کی چاہت اور محبت لہجے میں اُمڈ آتی۔ ارے میرا رب تو جہانوں کا بادشاہ، کائنات کا مالک، لوح و قلم کا وارث۔ میں اُس کے دروازے سے خالی ہاتھ جاؤں۔ نہیں نہیں یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ میرا سارا وجود جیسے مجسم نفی ہو جاتا۔ مُو مُو میں سے نہیں نہیں کی آوازیں اُٹھتیں۔ سسکیوں سے جسم لرزتا تڑپتا۔ گھنٹوں گزر جاتے۔ پھر جب اُٹھتی تو یہ ضرور کہتی۔

تو نے اگر مجھے زندگی دان نہ کی تو یہ تیرے لیے بھی کس قدر شرمندگی کی بات ہو گی؟ پھر دھیرے دھیرے جیسے اُس کا احساس اُس کا خیال میرے اندر کسی وجود کی طرح حلول کرتا گیا۔ میں محفل میں ہوتی اور پل بھر میں غائب ہو جاتی۔ اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ یا اُسے اپنے پاس بٹھا لیتی اور اُس سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ اُس نے ایک ایسے محبوب کا روپ دھار لیا تھا۔ جو میرے ہر احساس پر حاوی ہو گیا تھا۔

ٹیگور کے گیت۔ حافظ اور اقبال کی شاعری۔ فلمی گانے سبھوں میں میں اُسے فوکس کر لیتی۔ روٹھے ہو کیوں؟ تم کو کیسے مناؤں پیا؟ بولو نا۔ ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور کپکپاتے ہونٹ دُہراتے۔ بولونا۔ بولونا۔

باغوں کے ویران کُنجوں سے اُٹھ کر میں وطن کے دور دراز دشوار گزار حصوں کی طرف دوڑنے لگی تھی۔ لکھنا بھی مقصود تھا اور اُسے دیکھنا بھی۔ جی بھر کر اُسے دیکھا، سراہا، نئی جگہوں پر ماتھا زمین پر رکھا۔

اور وقت دھیرے دھیرے گزرتا گیا۔ میرے بچے بڑے ہوتے گئے۔ میں زندگی کی طرف پوری توانائی سے لوٹی تھی۔ پامسٹری سے متعلق ساری کتابیں میں نے تلف کر دی

تھیں۔ ہاتھ دیکھنا بند تھا اور اس تابوت میں آخری کیل میں نے اُس دن ٹھونکی جب میں ایک تقریب میں جناب ایم۔ اے ملک سے ملی۔ وہ آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری میں مبتلا ہو کر مہینوں زیرِ علاج رہے۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا۔

''ملک صاحب اس بیماری سے متعلق کبھی کوئی لکیر آپ نے اپنے ہاتھوں پر دیکھی ہو۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ سوچتے رہے پھر جیسے مدھم سی آواز میں بولے۔

''کچھ ایسی خاص مجھے نظر نہیں آئی تھی۔ ہاں البتہ آشوتوش پنڈت اوجھا کی کتاب پر ایک جگہ میں نے نشان دہی کی تھی کہ مجھے اپنے ہاتھ پر ایسی مدھم سی لکیر کا شائبہ پڑتا ہے۔

میرے پاس پنڈت آشوتوش کی Palmistry for all تھی اور میں نے اُسے پڑھا تھا۔

دُنیا کی شہرہ آفاق عبادت گاہوں میں جا کر مجھے احساس ہوا کہ رب کو اپنی دنیا کے مختلف النوع مذاہب اور نسلوں کی رنگا رنگی بہت محبوب ہے۔ اس کی مخلوق اپنے اپنے دُکھوں اور پریشانیوں کی گٹھڑیاں اپنے مونڈھوں پر دھرے واویلا کرتی، اُسے پکارتی، دُکھڑے سناتی اور اپنی اپنی تعمیر کردہ عبادت گاہوں میں کس کس انداز میں اُسے یاد کرنے اور منانے میں سرگرداں ہے۔ اور صرف وہی اُن کے بہتے آنسوؤں کو پونچھنے، ان کے رستے زخموں پر پھاہے رکھنے کی قدرت رکھتا ہے کیونکہ وہ سزاوارِ خدائی ہے۔

اور ہاں کہانی کا معجزاتی انجام بھی تو سُن لیجیے کہ میری وہ صاف سیدھی لمبی اور شوخ سی لکیر پہلے درمیان سے ٹوٹی پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس میں فاصلہ پیدا ہوا۔ آج وہ مجھے بتاتی ہے کہ خدا دعاؤں کا سننے والا ہے اور تقدیریں بدلنے پر قادر ہے۔

☆☆☆

پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ابھرتے ہوئے امکانات اور چیلنجز

اگر کسی نے پال کینڈی کی کتاب The Rise & Fall of Great Powers کی عملی تشریح دیکھنی ہو تو امریکہ کو دیکھ لیجئے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ ایک مسلمہ سپر پاور جس کی بنیاد نہایت ہی مضبوط اور مستحکم آئینی ڈھانچوں پر کھڑی ہے۔ اس کی دوسو سال قدیم بنیادوں کو جن کی تعمیر میں ابراہام لنکن اور تھامس جیفر یسن جیسے نابغوں نے اللہ جانے کتنا وقت اور کتنی توانائیاں صرف کی ہوں گی۔ جسے ایک لالچی، خودغرض اور پرلے درجے کے انا پرست نے جڑوں تک ہلا ڈالا۔ یقیناً کسی نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ ایک ایسا شخص جس کی نیت خراب ہو اور وہ بگاڑ پہ تلا ہو تو وہ کتنی آسانی سے آئینی وفولادی قوانین کی دھجیاں اُڑا سکتا ہے۔ اب آپ ٹرمپ صاحب کے مواخذہ والے واقعہ کو ہی لے لیجئے۔ بے غیرتی، بے شرمی اور ڈھٹائی میں ٹرمپ صاحب جیسی مثال چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ ہم کیا اپنے پھٹیچر سیاستدانوں کو روتے رہتے ہیں، لیکن داد دینی پڑے گی امریکی جمہوری سسٹم اور انتظامی اسٹیبلشمنٹ کو کہ بجائے اُس کی ہر چیز کو قالین کے نیچے چھپا کر سب اچھا کی رپورٹ پیش کرتے، اُنھوں نے کھلے عام ٹرمپ کا مواخذہ کیا۔

مواخذہ کامیاب ہوا یا ناکام یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن اہم بات یہ ہے کہ اِس

ساری کاروائی میں بہت ساری ایسی چیزیں بھی سامنے آئیں جن کو ریاستی اہم رازوں کی فہرست میں شمار کیا جا سکتا تھا، لیکن ببانگِ دہل آئین اور قانون کے تقاضے پورے کیے گئے۔اب آپ ہی بتائیں، کیا امریکہ کمزور ہو گیا؟ باوجود اس کے کہ ٹرمپ کا یوکرینی وزیر اعظم کو بائیڈن کے صاحب زادے کی کمپنی کی انکوائری پہ مجبور کرنا نہایت ہی قبیح فعل تھا، لیکن اِس کے باوجود اُس کو غدار نہیں کہا گیا۔اُس کی حب الوطنی کو مشکوک نہیں بنایا گیا۔

خدا جانے کسی سولہ سالہ الہڑ دوشیزہ کی کانچ جیسی عفت وعصمت کی مانند ہماری نیشنل سیکورٹی کیوں اتنی حساس اور کمزور ہے کہ بات بات پہ ہماری قومی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ پتا نہیں ہمارے یہاں لگی غدار پیدا کرنے والی فیکٹریاں کب بند ہوں گی۔ٹرمپ کو دیکھ کر تو ہمیں اپنے سیاستدان بلونگڑے لگتے ہیں۔بیچارے جوتیاں بھی کھاتے ہیں اور بولتے بھی نہیں۔سچ ہے بھائی طاقتور مارے بھی اور رونے بھی نہ دے۔

بہر حال امریکی الیکشن ہو چکے اور اپنی تمام تر چالاکیوں اور چالبازیوں کے باوجود ٹرمپ صاحب باہر ہو چکے ہیں۔لگ رہا ہے کہ جو بائڈن امریکہ کے چھیالیسویں صدر کی حیثیت سے 20 جنوری کو حلف اُٹھالیں گے۔

اہم پہلو یہ ہے کہ اِس وقت پوری امریکی فارن سروس اور سیکوریٹی اسٹیبلشمنٹ میں فارن پالیسی کے حوالے سے شاید ہی کوئی جو بائیڈن کے ہم پلہ ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ ٹرمپ کی Domain فارن پالیسی کبھی بھی نہیں تھی۔اس کا فوکس زیادہ تر معاشی اور اقتصادی تھا اور اُسی محدود پس منظر والی پالیسی کے نتیجے میں امریکہ کو دنیا میں تقریباً تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔

چاہے امریکا ایران نیوکلئیر ڈیل ہو۔Brexit کا معاملہ ہو یا چین کے ساتھ تجارتی معاملات میں دھونس، دھاندلی کا رویہ۔اقوامِ عالم میں امریکی انتظامیہ کی ساکھ کو

شدید نقصان پہنچا ہے، لیکن مجھے لگتا ہے کہ جو بائیڈن امریکہ کی اس گرتی ساکھ کو بہتر کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کریں گے۔ اُمید ہے کہ کم ازکم عالمی سیاست میں امریکا کی پوزیشن کو اوباماوالے دورتک ضرور لے جائیں گے۔

اب یہ نئی امریکی انتظامیہ پاکستان کوکس طرح سے ڈیل کرے گی۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔جیسا کہ میں نے کہا اہم بات یہ ہے کہ سابقہ امریکی صدور کے برعکس جو بائیڈن کے لیے پاکستان کی داخلی یا خارجی سیاست کوئی نئی چیز نہیں۔ جو بائیڈن ہمارے ملک کے با اثر اور طاقتور حلقوں کو تو پوتڑوں تک جانتے ہیں۔ پاکستان میں سول ملٹری تعلقات کی باریکیوں کو بھی بے حد اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اُس ضمن میں تاریخی طور پر اُن کا جھکاؤ واضح طور پر سویلین حکومت کی طرف رہا ہے۔

2008 میں بائیڈن لوگر بل کے نتیجے میں پاکستان کے لیئے 7.5 بلین ڈالر کی امداد منظور کی گئی۔ اہم بات یہ تھی کہ تمام امداد غیر فوجی تھی اور اِس کا مقصد سویلین حکومت کو امریکی سپورٹ فراہم کرنا تھا۔ اب پاکستان کے جس طرح کے حالات ہیں اور کہنے کو تو جمہوری حکومت ہے لیکن اسٹیبلشمنٹ کس قدر مظبوط ہو چکی ہے اس کا ہمیں بخوبی اندازہ ہے۔

یہ عین ممکن ہے کہ وہ پاکستانی انتظامیہ خاص طور پر ہماری ملٹری اسٹیبلشمنٹ کو مشکل وقت دیں۔ اگر آپ اوباما کے دورِ صدارت کو دیکھیں تو آپ کو اوباما انتظامیہ کی طرف سے پاکستان کی جانب ایک واضح سرد مہری اور روکھا پھیکا سا طرزِ عمل نظر آئے گا۔ خاص طور پر اُسامہ بن لادن والے واقعہ کے بعد تو یہ تعلقات بے حد سرسری اور رسمی حد تک محدود ہو گئے تھے۔

لیکن شاید اب ہمارے لیے افغان امن عمل ہی اُمید کی واحد کرن ہے۔ پتہ نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ جیسے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ بھی طالبان کی حمایت سے پیچھے ہٹ رہی ہے اور اب یہ افغان حکومت کے ساتھ بھی اپنے تعلقات کو بہتر بنانا چاہ رہی ہے۔عمران خان کا دورۂ کابل اسی سمت میں ایک قدم تھا۔ ماضی کے برعکس جہاں ہم نے اپنے تمام انڈے طالبان کی ٹوکری میں ڈال دیے تھے۔اب شاید تحریکِ طالبان پاکستان کے دوبارہ منظّم ہونے میں افغان طالبان کا رول دیکھتے ہوئے پاکستانی اسٹیبلشمنٹ بھی افغان حکومت کے ساتھ تعلقات میں گرم جوشی لانا چاہ رہی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ہمیں بہت طویل عرصے بعد یہ احساس ہوا ہے کہ آج کا افغانستان 1999 والا افغانستان نہیں ہے۔افغان عوام خاص طور پر شہری علاقوں کے لوگوں میں جنگ و جدل سے شدید بیزاری ہے اور وہ اب حقیقی معنوں میں آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔افغان عوام میں پاکستان سے مسلسل نفرت کی وجہ بھی شاید پاکستان کی طالبان کے لیے ڈھکی چھپی حمایت ہی ہے۔

تو اب اگر مقدر سے ہمارے اور امریکی سٹرٹیجک Strategic معاملات یک سمت ہوگئے ہیں تو شاید ہمارے امریکہ سے تعلقات بھی بہتر ہوجائیں۔میں کوئی پاک امریکہ تعلقات کی پھٹو نہیں ہوں، لیکن پاکستانی خارجہ پالیسی کے معاملات میں توازن ہونا نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ہمارے سرکاری دانشور جو مرضی راگ الاپتے رہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی دنیا میں شدید تنہائی کا شکار ہے۔آپ ہی بتائیں کہ سوائے چین اب کس ملک کے ساتھ ہمارے تعلقات میں معمول کی گرم جوشی کی کوئی رمق باقی رہ گئی ہے۔ یہ خطرناک صورتِ حال ہے۔کاش کہ ہم اپنے سدابہار دوست چین سے ہی اِس ضمن میں کچھ سیکھ لیتے۔امریکا سے بہت سارے معاملات میں شدید اختلافات کے باوجود تجارت چل

رہی ہے۔ انڈیا کو ہی دیکھ لیجئے۔اُس نے کبھی بھی کسی ایک ملک سے دوسرے ملک کی خاطر نہ تعلق استوار کیے اور نہ بگاڑے۔کوئی ہم سا بھی بیوقوف ہوگا؟ جس کے لیے تعلقات میں اندھی دوستی یا شدید دشمنی کے علاوہ مزید کسی قسم کی ترجیحات ہی نہیں۔

بہر حال میری دعا ہے کہ اللہ کرے کہ یہ تبدیلی کا عمل ہمارے لیئے کوئی اچھی خبر لے کر آئے۔اور ہم اِس اندھی جنگ سے جان چھڑا سکیں جس نے ہمارا ملک برباد کر دیا۔

آمین

☆☆☆

میرا محسن، میرا مربی ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

پہلا تعارف اردو ڈائجسٹ سے 1962 میں ہوا۔ ریڈرز ڈائجسٹ سے بچپن کی شناسائی تھی کہ بڑے ماموں اور منجھلے ماموں جب بھی چھٹیوں پر گھر آتے اُن کے ساتھ یہ رسالہ ضرور ہوتا۔ دسمبر جنوری کی میٹھی سی دھوپ میں چھت پر بچھی ننگی چارپائی پر لیٹ کر اسے پڑھنا دونوں کا محبوب مشغلہ تھا۔ جب بھی وہ ظہر یا عصر کی نماز کے لیے مسجد جاتے تو اِس کی پھولا پھرولی کرنا میرا محبوب مشغلہ ہوتا۔ گو کہ ٹاٹ سکول میں پڑھنے والی لڑکی کی انگریزی دسویں میں پہنچ جانے کے باوجود بھی بس ایویں سی تھی۔

1962 کا آوائل تھا۔ گھر میں اردو زبان میں ریڈرز ڈائجسٹ کے رنگ ڈھب کا ایک نیا پرچہ آیا۔ بڑا دلچسپ اور منفرد سا لگا۔ گو میرے فکری شعور میں ابھی وہ پختگی نہیں تھی جہاں میں اداریئے کی سیاسی تجزیاتی تحریر کو پرکھتی۔ تاہم میرے لیے اُس میں دلچسپی کا خاصا سامان بھی تھا کہ بڑے لکھنے والوں کی کہانیاں، نامور شخصیت کا انٹرویو، شکاریات، جاسوسی کہانی، کسی دوسری دنیا کا سفر نامہ، شعروادب، غرض کہ ہر نوع کا ذائقہ موجود تھا۔ الطاف فاطمہ سے محبت کا سلسلہ یہیں سے شروع ہوا۔ ادارتی ٹیم سے تعلق ذرا بعد میں پیدا ہوا۔ الطاف حسن قریشی چونکہ ہر دفعہ کسی بڑی سیاسی یا سماجی شخصیت سے تعارف کرواتے۔ تحریر اور پیش کش کا انداز بھی بڑا منفرد، جذباتی اور وطن کی محبت وسرشاری میں بھیگا ہوا ہوتا۔ اُن سے عقیدت اور محبت کا رشتہ ذرا جلدی استوار ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب کی کبھی کبھی کوئی تحریر نظر سے گزرتی۔

میرے اندر مشرقی پاکستان سے محبت، وہاں جانے اور وہاں کے بارے کچھ لکھنے

کی خواہش کا محرک اردو ڈائجسٹ اور الطاف حسن قریشی تھے جن کے سلسلہ وار مضامین اردو ڈائجسٹ میں چھپ رہے تھے۔اس وقت تک میں ایک دو کچے پکے ناول لکھ بیٹھی تھی۔ میرا تو وہ حال تھا کہ پوڈا پوڈا چڑھنے کی بجائے پٹوسی مار کر سیدھی چھت پر جا بیٹھی تھی۔ بندہ چھوٹی موٹی کہانیوں اور افسانوں سے بسم اللہ کرتا ہے پھر ناول کے چھابے میں ہاتھ ڈالتا ہے مگر نہیں جی ہماری تو ہر بات ہی نرالی تھی۔

تاہم اردو ڈائجسٹ میں لکھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔شاید یہ میری مرعوبیت تھی، ڈھاکہ یونیورسٹی میں میری کلاس فیلو ارمانیہ احمد بھی تھی۔ بہار کی اُردو اسپیکنگ جس نے مجھے بتایا کہ وہ اردو ڈائجسٹ میں افسانے لکھتی ہے۔ مجھے آج بھی اپنا تعجب سے بھرا ''ہیں'' کہنا یاد ہے۔میری آنکھوں میں رشک اور حسد دونوں جذبے بیک وقت ابھرے تھے۔میری آواز میں حسرت کا سا چھلکاؤ تھا جب میں نے کہا تھا۔

''اردو ڈائجسٹ میں چھپتی ہو تم۔'' وہ یقیناً بڑی اونچی شے نظر آئی تھی مجھے۔

ڈھاکہ میں میر پور اور محمد پور خالصتاً اُردو بولنے والوں کے علاقے تھے۔سہیلیوں کے گھروں میں جانا ہوتا تو ہر گھر کے چھوٹے بڑے ڈرائنگ روم میں اُردو ڈائجسٹ کے پرچے کا ہونا ضروری امر ہوتا۔ پرانے پرچے نفاست اور سلیقے سے بک شیلفوں میں سجے ہوئے ہوتے۔عیدالفطر پر میں نے دھان منڈی کے اُس گھر میں جانے کو ترجیح دی جہاں اُردو ڈائجسٹ کے پرچے جلدوں کی صورت محفوظ تھے اور مجھے انہیں پڑھنے کی پوری آزادی تھی۔یہیں میں نے ڈاکٹر اعجاز کو پڑھا۔اُن کے جرمنی میں قیام کی داستان نے بھی بہت متاثر کیا۔ یہ زمانہ اردو ڈائجسٹ کے عروج کا تھا۔

1971 میں سقوط ڈھاکہ ہو گیا۔الطاف حسن قریشی کے نوحے جو ''محبت کا زمزم بہہ رہا ہے'' کے عنوان سے چھپتے تھے اور میرا درد بھرا ناول ''تنہا'' دہائیاں دیتا رہ گیا کہ یارو

کچھ تو سوچو مغربی پاکستان تنہا رہ جائے گا۔ اسے تنہا مت کرو، مگر سنے کون؟

یہ 1977 کا زمانہ تھا۔ اخبار میں ایک اشتہار چھپا کہ ہفت روزہ سیاسی پرچہ ''زندگی'' جو اُردو ڈائجسٹ کے بینر تلے نکل رہا تھا، کے لیے خاتون رپورٹر کی ضرورت ہے۔ اب خود سے کہتی ہوں۔

''چلو میاں شادی شدہ زندگی کے بہتیرے مزے لوٹ لیے ہیں۔ بچوں کے گُو مُوت میں اماں کے ساتھ مددگار بھی ہے۔ تو باہر نکل۔ اپنا چھ سال کا زنگ اتار۔''

سمن آباد بس سٹاپ سے 21 ایکڑ سکیم پہنچنے تک میرے ساتھ ساتھ جذبات کا ایک ہجوم بے کراں بھی چلا کہ میں ایک ایسے مکتب فکر میں داخل ہونے جا رہی تھی جہاں ایک طرف دائیں بازو کے چوٹی کے صحافی پروان چڑھے تھے تو وہیں بائیں بازو کے لوگ بھی ٹھسے سے لکھتے اور نوکریاں کرتے تھے۔ انٹرویو ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی نے لیا۔ انٹرویو کیا تھا۔ مزے مزے کی باتیں۔ مشرقی پاکستان زیادہ زیر بحث رہا۔

خشخشی داڑھی والا یہ ہنستا مسکراتا کبھی کبھی قہقہے لگاتا تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص مجھے بڑا اپنا اپنا سا لگا کہ انہوں نے میرے ساتھ جرمنی میں اپنے ڈاکٹریٹ کے دنوں کی یادوں اور تجربات کو شیئر کیا تھا۔ لیجیے تنخواہ کام وام سب طے ہو گیا اور میں ''زندگی'' اور ''اردو ڈائجسٹ'' ٹیم کا حصّہ بن گئی۔

اس وقت سمن آباد کے پہلے گول چکر کے پاس دفتر تھا۔ دو منزلہ عمارت کا سارا نچلا حصّہ چھوٹے چھوٹے دو رویہ کمروں اور تنگ سی راہداری کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ عمارت میں داخلے کے ساتھ ہی الطاف حسن قریشی کا کمرہ، ذرا آگے ڈاکٹر صاحب اور پھر آگے عملے کے کمرے شروع ہوتے تھے۔ چند دنوں بعد پتہ چلا کہ اوپر کی منزل میں ڈاکٹر صاحب کی پہلی بیگم بڑی بھابھی جی رہتی ہیں۔

ایک دن کسی نے سرگوشی میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب کی دو بیویاں ہیں۔خاندانی بیگم اوپر کی منزل میں رہتی ہیں اور محبت کی ڈور میں بندھنے والی بیگم کوئی سو گز پرے پچھواڑے کی کوٹھی میں مقیم ہیں۔ڈاکٹر صاحب اولاد کے معاملے میں بڑے خوش نصیب ہیں۔بڑی بھابھی کے ماشاء اللہ سے چھ بیٹے اور دو بیٹیاں اور چھوٹی بیگم کے چھ بیٹے ہی ہیں۔

''ماشاء اللہ بارہ بیٹے''۔آنکھیں پھٹیں۔''اتنے بیٹے تو بادشاہوں کے ہی ہوتے ہیں۔'' تعجب بھرا لہجہ محسوس کرتے ہوئے مخاطب نے کہا۔

''بھئی ڈاکٹر صاحب بھی تو بادشاہ ہی ہیں۔''

ایک دن بڑا دلچسپ واقعہ ہوا۔ڈاکٹر صاحب بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔

''چلیے بھئی ہم آپ کو اپنی دوسری بیگم سے ملواتے ہیں۔''

لیجیے صاحب گھر پہنچ گئے۔اب جو چھوٹی بیگم پر نظر پڑی تو فضا میں خوشی سے کلکاریاں سی گونجیں۔چیخیاں پڑیں کہ وہ تو میری کالج فیلو ہی نہیں انگریزی اور ہسٹری میں کلاس فیلو بھی نکلیں۔ڈاکٹر صاحب کھڑے ہنس رہے ہیں اور ہماری چیخیاں ختم ہونے میں نہیں آرہی ہیں۔

بالعموم میں ہفتے میں دو تین دن ہی آفس میں بیٹھتی تھی۔گیارہ بجے ان کا ٹی ٹائم ہوتا۔وہ اکیلے چائے پینے کے عادی نہ تھے۔اگر ان سے ملنے والے خصوصی مہمان نہ ہوتے تو پھر حاضری کا بلاوہ ہمیں آجاتا۔اخلاق احمد دہلوی، محسن فارانی یزدانی جالندھری، آبادشاہ پوری کے ساتھ میں بھی حاضر ہو جاتی۔کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک مسحور کن مہک آپ کا استقبال کرتی۔سائڈ ٹیبل پر دھری بڑی سی ٹرے میں نفاست سے سجے کپ، چمچ، بسکٹ اور ٹی کوزی سے ڈھنپی چائے دانی اور کمرے میں گردش کرتی خوشبو مجھے کچھ یاد دلاتی۔بڑے

ماموں یاد آتے۔اُن کا گلگتی نوکر اور چائے کی پیش کش کا یہی ارسٹو کریٹک کا سا انداز۔

بڑی بھابھی چائے بنانے کی ماہر۔ڈاکٹر صاحب چائے پینے اور پلانے کے شوقین۔ ہم تو لُطف اٹھانے والوں میں سے تھے۔سو وہ کپ آب حیات کی طرح پیتے۔آدھ پون گھنٹہ اُن سے گپ شپ کرتے۔وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔اُن کے فکر وعمل پر وہی سوچ غالب تھی۔کاروان علم فاؤنڈیشن کا قیام اوراس کے لیے ان کی حد درجہ مخلصانہ کاوشیں یقیناً اُن کے ایسے ہی احساسات کی ترجمان تھیں۔کتنے دِیے روشن کیے،کوئی حساب نہیں۔اپنے کارکنوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تو میں خود گواہ ہوں۔

ملک کے نامور صحافی ہارون الرشید بھی کچھ عرصہ ’’زندگی‘‘ سے منسلک رہے۔ایک بار گھر میں سفیدیاں ہو رہی تھیں۔بہت دنوں بعد دفتر گئی۔ہارون صاحب بڑے جز بز سے تھے۔

’’اتنی چھٹیاں۔‘‘پوچھا گیا۔وجہ بتائی۔

بولے’’تو سفیدیاں کام کرنے سے روکتی ہیں۔‘‘

’’جی۔یہ تو ذرا آج جا کر بیگم سے پوچھیے۔بڑی تپ چڑھی تھی مجھے۔اب ڈاکٹر صاحب کے پاس کھڑی بول رہی ہوں۔

’’یہ کس کو آپ نے میرے سر پر لا بٹھایا ہے۔اب یہ میری تنخواہ کٹوائے گا۔‘‘

اور وہ مہربان سا شخص میرے غصّے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہتا ہے۔’’نہیں کٹے گی، بھئی نہیں کٹے گی۔پر تم بھی کسی نظم وضبط میں تو آؤ۔اتنے دن سے غائب ہو۔‘‘

’’تو کیا؟ کام تو دے کر گئی تھی۔‘‘

زندگی کے ساتھ اردو ڈائجسٹ کے لیے اکثر افسانہ لکھنا کسی سماجی یا معاشرتی مسئلے پر سروے کرنا یا کسی خصوصی نوعیت کا کوئی مضمون تحریر کرنے کو بھی اکثر کہہ دیا جاتا جس

کی ادائیگی الگ سے ہوتی تھی۔ یہ طے شدہ فارمولے کے تحت فی صفحہ والے حساب کتاب کے کھاتے میں جاتا تھا۔ جو بل بنتا میں اکثر اس سے مطمئن نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ جاتی۔ غصّے سے بولتی۔

''مضمون دیکھا ہے آپ نے میرا۔ بل ٹھیک نہیں بنا'' وہ مسکراتے اور کہتے تو بھئی ٹھیک کروا دیتے ہیں۔ اور بل اکثر میری منشاء کے مطابق بن جاتا۔

وقت بہت آگے لے گیا ہے مجھے۔ آج جب میں ڈاکٹر صاحب جیسی کرسی پر بیٹھی ایسے ہی کسی مسئلے کا سامنا کرتی ہوں تو دفعتاً وہ چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حسن سلوک کی لو سے چمکتا کچھ کہتا کچھ سمجھاتا۔

یادوں کی گزرگاہ پر اُن کی ذات سے وابستہ بہت سے روشن چراغ راستہ دکھاتے ہیں۔ ''تنہا'' مشرقی پاکستان پر لکھے جانے والے ناول کا چھپنا عذاب بن گیا تھا۔ سنگ میل مجھے اُن دنوں چھاپتا تھا، یکسر انکاری ہوا، یہ کہتے ہوئے کہ آپ نے تو سب کی کھلڑی ادھیڑ دی ہے۔ ہمیں جیل نہیں جانا اسے چھاپ کر۔ فیروز سنز کو بھی اس پر بہت سے اعتراض تھے۔ وہ حساس حصّوں کا یکسر کٹاؤ چاہتے تھے۔ جس کے لیے میں تیار نہ تھی، خون جگر سے لکھی ہوئی کتاب کا فضلہ تو قاری کو نہیں پڑھانا تھا مجھے۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب سے چھاپنے کی درخواست کی۔ کتاب چھاپ دی۔۔ شاندار تعارفی تقریب بھی اپنے خرچ پر فلیٹیز میں منعقد کروا کر خالص ادبی دُنیا میں میرا داخلہ کروادیا کہ میرے ملک کے نامور ادیب ڈاکٹر رشید امجد کا یہ جملہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ ''تنہا'' ہی سلمیٰ اعوان کو اُردو اَدب میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

یہ تہذیب و شائستگی، شرافت و نجابت، رکھ رکھاؤ والا وضع دار گھرانہ ہے۔ جہاں کارکن فیملی ممبرز کی طرح سمجھے جاتے تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ پیچھے لوٹ کر دیکھتی ہوں تو

راہداری میں گورے چٹے سانولے سلونے پیارے پیارے بچے چھٹی کے وقت گزرتے یاد آتے ہیں جو اِس وقت میرے بچوں کی عمروں جتنے ہی تھے۔طیب، زکی، محسن، علی آج بھی یادوں میں جھانکتے ہیں۔اس وقت یہ کاروباری اور طب کی دنیا کے بڑے نام بن چکے ہیں۔جتنے بڑے ہیں اتنے ہی مودب ہیں۔

نظریاتی طور پر آپ اُن سے کتنا بھی اختلاف کریں۔مارشلاؤں سے تعاون کرنے اور فائدے اٹھانے کا الزام لگائیں،مگر یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہوں نے صحافت کو نیا رنگ، نیا حسن دیا۔ان کے ہاں فکری طور پر ایک نسل کی تربیت ہوئی جو پاکستانی صحافت کے افق پر چمکتے دن کی طرح طلوع ہوئی اور ابھی بھی چمک دمک رہی ہے۔صحافتی زندگی کے پھولوں کے ساتھ اِس راہ کے کانٹے بھی انہوں نے چُنے۔دونوں بھائیوں نے جیل کی سختیاں بھی جھیلیں۔مزے کی بات مخالفوں کے ہاتھوں سے بھی اور اُن کے ہاتھوں سے بھی جن سے تعاون کا الزام تھا ان پر۔

☆☆☆

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

سچی بات ہے یہ دنیا عالم حیرت تو ہے ہی لیکن کمال یہ ہے کہ اِس عالم حیرت میں جہاں ستاروں پہ کمند ڈالی جا چکی ہیں ہماری مقتدرہ و اشرافیہ اپنی کوتاہ کوشی، کم فہمی اور ذہنی و فکری افلاس کے ایسے ایسے نمونے اور مظاہرے پیش کرتی ہے کہ سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ دور کیا جانا اب یہ جذباتی و غیر جذباتی والے معاملے کو ہی دیکھ لیں بندہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے نا۔

اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اب کیا کہیں یہی نا یا ہم شدید کند ذہن ہیں یا یہ عقل سے پیدل ہیں۔ اب دیکھیے نا چند دن پہلے کسی نے ایک بڑا دلچسپ کلپ شیئر کیا۔ سامنے پردۂ سکرین پہ میاں نواز شریف تھے اور پیچھے آواز عمران خان کی۔ بات کیا کر رہے تھے۔ حرف بہ حرف وہی جو میاں نواز شریف آجکل اپنی تقریروں میں فرماتے ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ میاں صاحب اب نام لے لے کے انگلیاں اُٹھاتے ہیں۔ تب کپتان چونکہ ایمپائر کی انگلی اُٹھنے سے اتنا نا اُمید نہیں تھا تو اُس نے صرف اشارات کی زبان اختیار کی اور انٹیلی جنس ایجنسیوں اور مقتدرات کو تختۂ مشق بنایا۔

پر بات تو ایک ہی ہے۔ ہاں فرق صرف اتنا ہے کہ تب عمران خان صاحب سڑکوں پہ تھے اور اب جناب میاں نواز شریف صاحب، نعرے وہی گھسے پٹے۔ وہ پنجابی کا

بڑا مشہور محاورہ ہے کہ روندی اں یاراں نوں تے ناں لیندی اں بھراواں دے (یعنی یاروں کے لیے روتی ہے اور بھائیوں کے نام لیتی ہے) اب جب تک اُمید باقی تھی تب تک تو سب اچھا تھا۔ایکسٹینشن کے موقعے پہ سب کی دوڑیں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ بندہ حیران ہوتا ہے کہ تب کیا پاکستانی عوام پہ ڈالروں کی بارش ہو رہی تھی کہ ''ووٹ کو عزت دو'' کے نعرے کو کسی پرانے کواٹر کے کسی بند صندوق میں دفن کر رکھا تھا۔ یہ ایک پانچ دس مہینے کے دورانیے میں کون سا ایسا نیا عذاب عوام پہ نازل ہو گیا کہ عوام کی بدحالی سے پیارے میاں صاحب کی جان پہ بن آئی۔ وہ میرؔ کا کیا خوب شعر ہے:

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں

کون نہیں جانتا کہ ہماری حکمران اشرافیہ کی نظر میں عوام کی کیا اہمیت ہے۔ پروین شاکر نے شاید یہ ہماری کم نصیب عوام اور ان سیاستدانوں کے بارے میں ہی لکھا تھا کہ:

وہ جب بھی لوٹا میرے پاس آیا
بس یہی بات اچھی ہے میرے ہرجائی کی

اب جبکہ حالات کی گردش اور ایکسٹینشن کے دھول دھپوں نے ہمارے ملک کے اصل حکمرانوں کے جسموں سے وہ چند دھجیاں بھی نوچ لی ہیں جن سے وہ طاقت کے سرچشموں کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ایک سوال جس کی بازگشت بار بار مجھے سنائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہماری اسٹیبلشمنٹ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے، کیا سیاستدان اتنے ہی مظلوم ہیں جتنا یہ جتلاتے ہیں۔ اگر سیاستدانوں کے کردار اور کارکردگی کا as a class جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ اتنے بھی مظلوم نہیں۔

اگر بھٹو عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتا اور مجیب کو حکومت بنانے کا موقع دیتا تو کیا ملک

آج ایسا ہی ہوتا۔ اگر بھٹو وزیر اعظم کے روپ میں سول ڈکٹیٹر نہ بنتا تو کیا ضیا الحق صاحب مارشل لا لگا سکتے تھے۔ کیا میاں نواز شریف اپنے من پسندوں اور اپنے تابعداروں کو ہر جگہ بھرتی کرنے کی بجائے اداروں کو مضبوط کرتے، اداروں کو اپنے پاؤں پہ کھڑا کرتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ اُنھیں اِسی طرح کی بے انصافیوں کا سامنا پڑتا۔ اگر اداروں کے سربراہوں کی تقرریاں اپنی ذاتی وفاداری اور شخصی پسند و ناپسند کی بجائے میرٹ پہ کی گئی ہوتیں تو کیا آج میاں صاحب کو یہ دن دیکھنا پڑتا۔

اگر اُس وقت جب عمران خان چار حلقوں کے نتائج کھولنے کا مطالبہ کر رہا تھا میاں صاحب اُس وقت اُس کا مطالبہ مان کر الیکشن کمیشن کو آزاد و خود مختار کر دیتے تو یہ کیسے ممکن ہوتا کہ اُن کا مینڈیٹ اُن سے چھین لیا جاتا؟ اس کہانی کے تیسرے کردار پیپلز پارٹی کا تو ذکر ہی کیا وہ تو مانو قبروں کی مجاوری کرتے اور اُن قبروں کی کمائی کھانے پہ کامل یقین کے ساتھ operate کرتے ہیں۔ مرنا تو اُن کا ہے جن کو آج ساری ناانصافیاں یاد آ رہی ہیں اور عوام کے درد سے بے حال ہوئے جاتے ہیں۔

پر افسوس کہ ہر ہرجائی کی طرح ن لیگ کو بھی عوام کی یاد تب آتی ہے جب سارے دروازے بند ہو جائیں۔ لیکن کب تک؟ آخر کب تک یہ میوزیکل چیئرز کا کھیل چلتا رہے گا۔ کل کو جب عمران خان اقتدار سے باہر ہو جائے گا تو اُس کو بھی عوام کا درد ستانے لگ جائے گا۔ آج چاہے مہنگائی اور معاشی بدحالی سے عوام کی چیخیں نکل رہی ہیں۔ کسی کو ہے کچھ خیال اس بے چاری مظلوم قوم کا۔ ویسے ان نکموں اور نااہلوں کے بھی کیا کہنے؟ ''اِک چور اُتوں چتر'' والا محاورہ شاید اُنھی جیسے کسی کردار کو دیکھ کر معرضِ وجود میں آیا ہوگا۔ اِن کے کارناموں پہ تو بات کرنا بھی وقت کا ضیاع ہے۔

اِن کے بارے میں تو تسکین کا ایک ہی خیال رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ موت برحق

ہے اور دنیا فانی ہے۔ سو بھائی لگے رہیں اِس میوزیکل چیئر کے کھیل میں۔ بقول آئن سٹائن کسی کے پاگل ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ایک ہی عمل بار بار دہرا کر ہر دفعہ مختلف نتیجے کی توقع رکھے۔

☆☆☆

میکرون تھیوڈور کی طرح مسلم اُمّہ کی بیداری کا باعث بنے گا؟

ایمانوئل میکرون اور فرانسیسی لوگوں کی حکومت نے جو کیا اس پر بات ذرا بعد میں۔ پہلے ذرا ایک اہم تاریخی واقعے کی جھلکیاں آپ لوگوں کو دکھا دوں۔ یہ انیسویں صدی کے آخری ماہ وسال ہیں۔ اڑتیس، انتالیس سالہ نوجوان تھیوڈور ہرتزل صحافت کی دنیا کا ایک بڑا نام وی آنا سے ہی نکلنے والے اخبار Nelle Freie Presse کا نمائندہ۔ پیدائش یہودی گھرانے کی مگر رجحان یہودیت کی بجائے انسانی اقدار سے محبت پر تھا۔ یہی وہ دن تھے جب فرانسیسی فوج کے ایک یہودی کیپٹن الفریڈ ڈریفس Dreyfus پر جرمنوں کے لیے جاسوسی کرنے کا الزام لگا۔

وہ چونکا تھا۔ انہی دنوں وہ پیرس اپنے کسی کیس کے سلسلے میں گیا ہوا تھا، سوچا کہ چلو دیکھوں تو سہی یہ چکر کیا ہے؟ فرانسیسی یہودی تو اس سوسائٹی میں پوری طرح رچے بسے اور اپنے فرانسیسی ہونے پر نازاں لوگ ہیں۔ کورٹ کے احاطے میں جو منظر تھیوڈور ہرزل نے دیکھا وہ اُسے سرتا پیر دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔ وہاں نفرت انگیز نعرے تھے۔ ''مار دو ان یہودیوں کو۔ دشمن ہیں یہ ہمارے۔ ان کا نام ونشان مٹا دو۔'' کیس کی سٹڈی نے اُسے بتایا کہ الفریڈ ایک کلچرڈ آدمی، فوج کا افسر، فرانسیسی معاشرے کو آئیڈیلائز کرنے والا جو ماضی کے حوالے سے بھی داغ دھبوں سے پاک تھا۔ کیس کی پیروی کے لیے وہ میدان میں کُود پڑا۔ اس کی صحافیانہ پیروی اور دائیں بائیں طبقوں کی نفرتوں، ہمدردیوں اور مشہور فرنچ ناول

نگار ایملی زولا (Emile Zola) کے اس ایک جملے I accuse نے کیس کو بین الاقوامی شہرت دے دی۔

اور بس یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ تھا جس نے تھیوڈور ہرتزل کو بابائے صہیونیت بنا دیا۔اس کی کاوشیں اوراس کی The Jews State اسرائیل اسٹیٹ بنانے کا باعث بن گئی تھی۔

ذرا آگے بڑھیئے۔صلیبی جنگوں کے دامن میں جھانکئے۔ان میں یورپ کے تمام ملکوں سے زیادہ فرانسیسیوں کا کردار نظر آتا ہے۔بنیادی طور پر فرانس مذہبی ریاست رہی ہے۔کہیں بیسویں صدی کے اوائل میں چرچ اور ریاست کو الگ کیا گیا۔

مسلمان فرانس کی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔افریقہ اور عرب ممالک کے غریب اور محنت کش لوگ جنہیں لایا گیا کہ وہ فرانس کا صنعتی ترقی کا پہیہ تیزی سے گھمانے میں مددگار ہوں۔پچاس فی صد سے اوپر کی آبادی جنہیں وہ سہولتیں میسر ہیں اور نہ ہی وہ تحفظ حاصل ہے جو نسلی گوروں کو ہیں۔کبھی ان کے حجاب پر پابندی،کبھی ان کے عبایا پر اور یہ بھی پہلی بار ہوا ہے کہ شدید ردّعمل مقامی مسلمانوں کا سامنے آیا ہے۔مورِدالزام اس بار نہ القاعدہ ٹھہری ہے اور نہ داعش۔یہاں ''تنگ آمد بجنگ آمد'' والا منظر نظر آتا ہے۔

یہ بحث کس قدر فضول اور لاحاصل ہے کہ آپ انہیں اس بات پر لتاڑیں کہ وہ عقائد اور مسلک کے اعتبار سے مسلمان ہیں۔

اب میکرون کا مسئلہ کیا ہے۔کیوں اس نے اتنی اچھل کود مچا رکھی ہے؟

ایک وجہ تو یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ کرونا کی دوسری لہر فرانس میں خاصی پریشان کن اور تباہی مچانے والی ثابت ہورہی ہے۔ہمارے عاقبت نااندیش حکمرانوں کی طرح میکرون بھی اپنے لوگوں کی توجہ اس نئے شوشے کی طرف منعطف کررہا ہے۔

ردّعمل میں بیشتر اسلامی ممالک نے غم وغصّے کا کھل کر اظہار کیا۔ تُرکی ہمیشہ کی طرح اس بار بھی آواز اٹھانے اور کھری کھری سُنانے میں آگے تھا۔ میکرون کو دماغی مریض کہہ دینا بھی طیب اردگان جیسے جی دار کا ہی کام ہے۔

اب ان رنڈی رونوں کا کچھ فائدہ ہے کہ کسی مسلک اور مذہبی عقیدے پر حملہ کرنا گویا انسانی اقدار کی دھجیاں اُڑانی ہیں۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ایسے اقدام اسلاموفوبیا فروغ کا باعث بن رہے ہیں۔ سموئیل پیٹی کو تو قتل ہونا ہی تھا کہ استاد ہوکر وہ ایک ایسی کلاس میں جہاں مسلمان بچوں کی ایک واضح تعداد تھی۔ وہ اُن کے روحانی پیغمبرﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہورہا تھا۔ مسلمان بچوں کو باہر نکال کر باقی بچوں کو وہ خاکے دکھا رہا ہے جس میں اُن کی جان سے پیاری ہستی ایک کریہہ صورت میں نظر آتی ہے۔

میکرون اور اس کی حکومت اُن قابل نفرت خاکوں کو عمارات کی پیشانیوں پر سجا رہی ہے۔ اِس ناہنجار کو تھوڑا سا ہی شعور ہونا چاہیے۔ بھارت سے پینگیں اور کشمیریوں پر ظلم و ستم، انڈیا کی حمایت۔ کوئی اسے بتائے کہ اندرا گاندھی نہرو کی بیٹی سیکولرازم کی داعی آپریشن بلیوسٹار کے نتیجے میں ہلاک ہوئی تھی۔

ہاں البتہ ایک المیہ مسلمانوں کے ساتھ تدبر اور فراست کی کمی کا ہے۔ زوال کے پاتال میں گھری اس قوم کا کردار نہیں رہا۔ نبیؐ سے خالی خولی عشق کے دعوے بہت ہیں مگر کردار کہاں ہے؟ عقیدتوں سے بھرا اسلام ہے۔ اُس فرانسیسی انسان دوست خاتون صوفی پیٹرونن (Petronin) جو چیرٹی ورکر (Charity worker) تھی۔ یتیم اور غذائی کمی میں مبتلا بچوں کے لیے کام کرتی تھی۔ جن کی ایک واضح اکثریت مالی کے شمالی علاقوں میں تھی۔ 2016 میں JNIM فوجی گروپ کے ہاتھوں اغوا ہوکر چار سال ان کی قید میں رہی۔ اِس قید کے دوران وہ جس حسنِ سلوک سے گزری وہ متاثر کُن تھا۔ جب وہ

Villacoublay ائیر پورٹ پر اُتری، مسٹر میکرون وہاں اس کے استقبال کے لیے خود موجود تھا۔خدا کی عنایت ہے۔میں اب مسلمان ہوں۔آپ مجھے صوفی کہہ سکتے ہیں، مگر آپ کے سامنے مریم کھڑی ہے۔انہوں نے واشگاف لفظوں میں کہا ہمارے تجارتی منصوبے ان غریب لوگوں کو لوٹنے کے ہتھکنڈے ہیں۔دہشت گرد مسلمان نہیں، ہم ہیں۔

نبیؐ سے عشق تقاضا کرتا ہے، ہم علم اور ٹیکنالوجی کے سمندر میں کودیں اور بہترین تیراک بنیں۔کردار کے غازی ہوں۔اتحاد اور اتفاق اپنی صفوں میں پیدا کریں۔تب کس کی مجال ہوگی کہ کوئی ہمارے نبیؐ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہو۔

☆☆☆

بلتستان کے مسائل اور پھول شہزادی

یہ روٹی اتنی کالی اور بے ذائقہ سی۔ کیوں؟ یہ آٹا کہاں سے آرہا ہے۔ بہو بولی شاید روسی یا یوکرائنی گندم ہے۔ مجھے تو اِن دنوں کاموں کے اژدہام میں اخبارات کے مطالعہ کی بھی مہلت نہ ملی تھی۔ ''ہائیں'' آنکھیں پھٹیں۔ اِس زرعی ملک کی سونے رنگی میٹھی گندم کہاں گئی؟ بہو ہنسی وہیں جہاں پہلے چینی گئی تھی۔ اِس جذباتی بوڑھی عورت کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ابھی دو دن پہلے بیٹی چین سے آئی تھی۔ پی آئی اے کی تباہی کے دکھڑوں نے ہمارے دکھ کو دو چند کر دیا تھا۔ بیجنگ سے پہلے لوکل فلائٹ سے پہلے چندو گئی۔ جہاں پی آئی اے کی خصوصی پرواز سے اسلام آباد آئی۔ ہمارا قومی سمبل چاند تارے کا علمبردار ساری دنیا میں اڑانیں بھرتا ہمارے دیس کی نمائندگی کرتا کیسے پاتال میں گر گیا ہے؟ لائق باپ کی نالائق اولاد کتنے فضول فروعی جھگڑوں میں اُلجھی ہوئی ہے۔ جاہل عورتوں کی طرح منہ پر ہاتھ پھیر کر مخالف کو چھبیاں دیتی ہے۔ چلو لندن جا کر اس گولومولو کو لے بھی آیا اُسے بندی خانے میں بھی ڈال دیا تو؟ غریب کو روٹی دال سبزی سے واسطہ۔ پھل اس کی بساط سے باہر۔ نگوڑا کیلا چلو وہ کھا سکتا ہے مگر پچاس روپے درجن بکنے والے کیلے کو دیکھا ہے کسی نے؟ اس بیچارے پر جانے کون سی زہریلی ادویات کا چھڑکاؤ ہوتا ہے کہ پکتا بعد میں ہے اندر سے سڑ پہلے جاتا ہے۔

رات بلتستان سے ایک محبّ وطن بلتی کا فون تھا۔ سوال تھا اس کے لہجے میں۔ پاکستان ماں ہے ہماری۔ پر کیسی؟ سوتیلی۔ جو اپنے بچوں کو اُن کا حق دینے کے لیے تیار نہیں۔ حالانکہ ان بچوں کے بڑوں نے اپنے محدود وسائل کے باوجود ڈوگرہ فوج سے جنگ لڑی۔ اُسے جیتا اور یہ جنت نظیر علاقہ طشتری میں رکھ کر اس ماں کو پیش کیا اور یہ ماں تہتر

73 سال سے بس اسے گولیوں ٹافیوں پر بہلا رہی ہے۔صبر پُتری تمہارے تائے انڈیا نے تمہارا بڑا بھائی مقبوضہ کشمیر کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔اُسے آزاد کرالوں پھر تم سب کو اپنی ممتا کی چھتر چھاؤں میں لے کر تمہیں اپنا وارث ٹھہراؤں گی۔اب ماں کو کون سمجھائے کہ اس ناہنجار تائے مودی نے تو ہمارا بھائی قید کرلیا ہے جس کے چھٹنے کا کوئی امکان ہی نہیں۔تو اب ہمیں تو دیکھیے،ایک تو خود کمزور اور بیمار ہوئی بیٹھی ہے۔اوپر سے بچوں کی دیکھ بھال سے غافل۔

فون سننے کے بعد دیر تک بیٹھی سوچوں میں گم رہی ۔بلتستان گلگت میری زندگی کے وہ خوبصورت اور جذباتی گوشے ہیں جن سے میری نوسٹلجیائی یادوں کی لام ڈوریاں بندھی ہوئی ہیں۔1954 کی پوہ ماگھ راتوں کے پہلے پہروں جب گھر کے سب افراد ماں جی (نانی) کے کمرے میں چارپائیوں پر کمبلوں اور رضائیوں میں لپٹے خشک خوبانی،سوکھے توت اورگریوں سے شغل کرتے ہوئے بڑے ماموں کی باتیں سُنتے تھے کہ جو شمالی علاقہ جات سے ابھی چند دن پہلے اپنی سالانہ چھٹی پر گھر آئے تھے۔اِن علاقوں کی سچی،محیّر العقول،تاریخی کہانیاں اوران کی جنگِ آزادی کے واقعات جوانہیں سرکاری دوروں کے دوران سُننے کو ملتے تھے۔

یہ بلتی لوگ سیدھے سادے مخلص اور پاکستان سے محبت کرنے والے اس خشک بنجر سنگلاخ چٹانوں والے علاقے جس پر تبّتی ،لداخی،کشمیری اور ایرانی تہذیبوں کے ملاپ کی گہری چھاپ ہے۔اُس وقت موسیقی ،فنون لطیفہ،ثقافت اور تہذیبی اثرات جیسے الفاظ تو سر پر سے گزر گئے۔بس یادوں میں کسی لفظ کی بازگشت رہ گئی یا پھر کہانی رہ گئی،جو علی شیر خان انچن اور اس کی ملکہ پھول شہزادی کی تھی۔اتنی دلچسپ کہ بہت دنوں تک اس کا خمار رہا۔

تو پھر جب 1986 میں اپنے خوابوں کی سرزمین بلتستان دیکھنے گئی اور جناب غلام وزیر مہدی جو اس وقت ضیاالحق کی مجلسِ شوریٰ کے معتمد رکن تھے، سے ملنے گئی تو

اس محبت سے لتھڑے شخص کا پہلا سوال یہ تھا۔تم چھور بٹ سے ابھی ابھی سکردو پہنچی ہو۔ چھ سات گھنٹے کا یہ طویل اور مشکل سفر مگر بہت تازہ دم لگ رہی ہو۔

آپ نہیں سمجھیں گے اِن علاقوں سے میری محبت کو۔ میں نمک خوار ہوں اُن پھلوں کی ،اُن چھوٹی چھوٹی سوغاتوں کی جو مجھے بچپن میں ملتی تھیں اور جن کا تعلق ان علاقوں سے تھا۔ واپسی کے لیے کوئی سواری ملی نہیں۔جس سوزوکی والے سے رات بات ہوئی وہ آیا نہیں۔سیاری سیکٹر سے آنے والے پاکستان آرمی کے ایک ٹرک میں لفٹ لی۔وہ بھی پچھلے حصّے میں کبھی کھڑے اور کبھی بیٹھ کر۔ دریائے شیوق کی ٹھنڈی ٹھار ہواؤں کو پھانکتے ہوئے سفر کیا۔مگر مہدی صاحب بہت خوش ہوں کہ اپنے ساتھ بہت کچھ سمیٹ کر لائی ہوں۔ یہ ساری سرشاری اُسی اثاثے کی ہے۔

اب وہ پوچھتے ہیں تو شگر میں کہاں ٹھہریں اور کیا کیا باتیں ہوئیں۔

قراقرم کے دامن میں بکھری بلتستان کی حسین وادی شگر کے اسٹنٹ کمشنر داؤد صاحب یاد آئے کہ جن کا کہنا تھا پاکستان کی حکومت کو 1948 میں نظم ونسق سنبھالنے کے ساتھ ہی الحاق کے متعلق وضاحت کر دینی چاہیے تھی۔مقامی لوگوں کو انتظامی معاملات میں شریک کرنا ضروری تھا مگر یہاں وڑوے جیاتے نکل دے جیا والی حکمت عملی تھی۔

بھٹو نے بہت سی اصلاحات کیں۔سیشن کورٹ کا اجرا،ایف سی آر اور راج گیری نظام کے خاتمے کے ساتھ مالیہ کی بھی معافی۔ یہ سب اپنی جگہ مگر آئینی حیثیت پھر بھی واضح نہیں ہوئی۔

میں ضیاالحق کی مجلسِ شوریٰ کا رکن ہوں۔انہوں نے واشگاف لفظوں میں اسے آئینی حیثیت دینے کا وعدہ کیا ہے مگر میں جانتا ہوں ایسا نہیں ہوگا۔’’نومن تیل ہوگا اور نہ رادھا ناچے گی۔‘‘ گلگت بلتستان عظیم تر کشمیر کا کاغذوں میں جو حصّہ ہے یہ کاغذوں میں ہی

رہے گا۔ مجھے تو اپنی زندگی میں اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ واقعی یہ ابھی بھی کاغذوں میں ہے۔ جانے کب تک کاغذوں میں رہے گا۔

ایک وفادار قوم جسے خوامخواہ ہی مایوسی، بددلی، بے چینی اور غیر یقینی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ ایک جرأت مندانہ قدم کی ضرورت ہے، مگر کون اٹھائے؟

پھول شہزادی یاد آئی تھی۔ شہنشاہ اکبر کی عزیز جسے بلتستان کا عظیم فرمانروا دلّی سے بیاہ کر لایا تھا۔ جس نے گنگوپی نہر بنائی اور سارے سکردو کو ہرا بھرا اور سرسبز کر دیا۔ غلّے اور چارے کی بہتات ہوئی اور لوگوں نے نعرے لگائے۔

ملکہ کا سایہ ہمارے سروں پر سلامت رہے۔ تو جب لوگوں کو روٹی ملتی ہے اور خوشحالی آتی ہے تو سلامتی کے نعرے لگتے ہیں۔ اور جب حکمران خود محلوں میں رہیں اور لوگ روٹی کو ترسیں تو پھر گو گو کے نعرے مقدر بنتے ہیں۔

☆☆☆

ناگورنو کراباخ(Nagorno Karabakh) کی حسین شہزادی کیا کہتی ہے

چیختی دھاڑتی ناگورنو کراباخNagorno Karabakh پر حملے کی خبر نے جیسے مجھے آناً فاناً کچھ یاد دلایا تھا۔ ہوش اڑا دینے والا وہ حسین چہرہ جس نے مجھے مبہوت کر دیا تھا اور جو لمحہ یاداشتوں میں ہمیشہ کے لیے قید ہو گیا تھا۔ نیرا ایگوپین Nare Agopian ناگورنو کراباخ کی رہنے والی۔ رات کٹنی مشکل ہو گئی تھی۔

صبح کمپوزر سے کہا وہ ای میل ڈھونڈے۔ ڈیڑھ دو سال کی برقی خط و کتابت کے بعد بند ہونے کا سلسلہ کوئی بارہ سال تک پھیلا ہوا تھا۔

بات 2006 کی ہے اور دن یہی جولائی کے تھے اور ماسکو میں میرا آخری دن تھا۔ جب میرے ویزا ایجنٹ نے مجھے کہا کہ اس کا بڑا بھائی مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ مجھے شدید غصّہ تھا اس پر۔ وہ ماسکو کے بااثر حلقوں میں خاصا مشہور تھا۔ کسی روسی جنرل کی بیوی سے شادی کر رکھی تھی۔ میرے پھوپھی زاد بھائی کے ساتھ اُس کی زمینوں کے بٹّے ساجھے ہونے کے ساتھ تعلقات بھی اچھے تھے مگر جب میرے بارے روس جانے بارے بات ہوئی تو آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ میرا پھوپھی زاد بھائی بہت رنجور اور صدمے کی سی حالت میں تھا۔ ہنستے ہوئے اس کی دلداری کی۔ ''پیارے اپّو لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں''۔ ہاں جب اپنے تئیں جانے کا قصد کیا تو معلوم ہوا کہ روسی ویزے سے لے کر پی آئی اے کی ٹکٹوں

اور ہوٹلوں کی بکنگ سب کی فوری اور آسان فراہمی کے ذرائع پر اِن بھائیوں کا قبضہ ہے۔کوئی کراچی اور کوئی ماسکو میں۔تو اب جس کے کارن ہوئے بیمار اسی عطار کے لونڈے سے دوا لینی پڑی کہ سفارت خانے کے چکر کاٹنے کا مجھ میں یارانہ تھا اور 2006 میں روسی سیاحتی ویزا لینا مشکل تھا۔

اور اب ماسکو میں میرے ایجنٹ نے مجھ سے اپنے بڑے بھائی بارے بات کی تھی اور میں ملنے اور نہ ملنے بارے سوچتی تھی۔پھر سوچا دفع کرو۔مل لو۔

ماسکو کے کمرشل ایریا میں فلک بوس عمارتوں کے اِس جنگل میں شیشوں کی دیواروں والے کیبنوں کی راہداریوں سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئی تھی۔ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی لڑکی جیسے قدرت کا کوئی شاہکار تھی جس نے مجھے پتھرا دیا تھا۔آگے بڑھنے کی آواز اور اشارے نے مجھے چونکایا۔

اس بڑے بزنس مین رشتہ دار کے معذرت نامے جو شاید گونگلوؤں سے مٹی جھاڑنے کے مترادف تھے،میں نے خاموشی سے سُننے اور چائے کا کپ پینے اور خدا حافظ کہنے کے ساتھ ختم کر دیئے۔ساتھ ہی اس کی ڈراپ کرنے کی درخواست کو رد کرتے ہوئے کہا کہ نہیں مجھے تو یہاں گھومنا ہے اور یہ کہ پندرہ دنوں میں میٹرو کے سفروں نے مجھے بہت ہوشیار کر دیا ہے۔دراصل مجھے تو اس لڑکی سے ملنا تھا اور وہ اپنے کمرے میں موجود تھی۔دروازہ کھول کر میں نے اجازت طلب نظروں سے اُسے دیکھا۔ہکابکّا سی آنکھوں میں حیرتوں کا جہاں لیے وہ مجھے دیکھتی تھی۔

بڑی دلیری اور جی داری سے مسکراتے ہوئے پہلی بات میں نے یہ یہی کہی اگر انگریزی سمجھ لیتی ہیں تو پھر سُنیئے،یہ حسنِ جہاں سوز مجھے گھسیٹ کر تمہارے پاس لے آیا ہے۔روسی تو نہیں لگتی ہو۔کوہ قاف کی پریاں بھی دیکھ بیٹھی ہوں۔مجھے تو تمہارے لیے کوئی تشبیہ اپنی

زبان میں سمجھ ہی نہیں آ رہی ہے تو انگریزی میں کیا کہوں گی۔

شکر تھا کہ وہ انگریزی سمجھنے اور بولنے میں ٹھیک تھی۔ ہنسی تھی۔ ''میں ہوں نیر ایگوپین ناگورنو کراباخ کی آرمینین۔''

''ناگورنو کراباخ Nagorno Karabukh یہ کہاں ہے؟'' پہلی مرتبہ یہ نام سُنا تھا۔'' آذربائیجان اور آرمینیا کے درمیان کا ایک چھوٹا سا پہاڑی علاقہ جہاں کی بیشتر آبادی آرمینیائی ہے۔ کچھ آذری لوگ اور کچھ ترک مسلمان بھی اس کے شہری ہیں۔''

میری آنکھوں میں کچھ جاننے کی خواہش پر اُس نے کہا۔

''دراصل یہ متنازعہ علاقہ ہے۔ آذربائیجان اِسے اپنا حصّہ قرار دیتا ہے۔ لوگ آزادی چاہتے ہیں اور آرمینیا سے الحاق کے حامی ہیں۔ آذربائیجان مسلم ملک ہے۔ پہلے تو یہ سارا علاقہ سوویت یونین کے پاس تھا۔ سوویت یونین ٹوٹنے کے ساتھ یہاں بھی علیحدگی کی تحریک چلنے لگی۔ دو تین جنگیں بھی ہوگئی ہیں، مگر حق نہیں مل رہا ہے۔ مجھے احساس ہوا کہ کچھ معاملہ کشمیر کی صورت سے ملتا جلتا ہے۔

باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نسطوری عیسائی ہے۔ یہ نسطوری کس مسلک سے ہیں۔ اسے بھی پوچھ لیا اور جاننے کا اضطراب بھی دکھا دیا کہ بہت سالوں سے اِس کے بارے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ مسیحیت ایک تثلیث رکھنے والا مذہب ہے۔ نسطوری عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا نہیں ہے۔ اسے کسی دوسرے جوہر سے بنایا گیا ہے اور وہ مخلوق اور تغیر پذیر ہے۔ میرے اس سوال پر کہ روس میں اس عقیدے کے کتنے لوگ ہیں۔

''بہتیرے ہیں۔ دراصل زمانوں پہلے جب کیف kyib (موجودہ یوکرائن کا دارالحکومت) روس کا حصّہ ہوتا تھا اور ولادی میر کی حکومت آئی تو شہزادہ اپنی زندگی اور ملک کو

ایک واضح مذہب دینے کا خواہش مند ہوا۔تب دنیا بھر کے مبلغین کو مناظرے کی دعوت دی گئی۔انہی میں نسطوری پادری بھی آئے اور تب ہی یہ مذہب اِن علاقوں میں پھیلا۔کچھ کا کہنا ہے کہ یہ عیسائیت کی ابتدائی شاخوں میں اولین ہے۔''

یہ دلچسپ ملاقات تھی۔وہ پاکستانی فرم کی ملازم تھی۔کارڈوں کا تبادلہ۔ڈیڑھ سال تک گاہے گاہے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا پھر بند ہوگیا۔میں نے اُسے لکھا نا گورنو کراباخ کی حسین شہزادی جنگ کے اِن دنوں میں تم مجھے یاد آئی ہو۔مجھے لکھو کیسی ہو؟اور تمہارے شہروں اورلوگوں کے حالات کیسے ہیں؟

ہر صبح میرا اپنے کمپوزر سے کوئی میل آئی ہے جیسا سوال اورنہیں جیسا اس کا جواب مجھے مایوس کرتا تھا۔اورآج جمعرات کی صبح میں پڑھ رہی ہوں۔

یاد ہیں آپ مجھے۔عورت اپنی تعریف کرنے والے کوکبھی نہیں بھولتی۔آپ کی تحریر نے بہت سے بھولے بسرے دنوں کو یاددلا دیا ہے۔

مدت ہوئی ہے مجھے ماسکو سے آئے ہوئے۔میں نے شادی کرلی تھی۔خیال نہیں تھا کہ میرا شوہر اینڈرانک Andranik اس درجہ قوم پرست نکلے گا۔اور مجھے مجبور کرے گا کہ ہمیں واپس ناگورنو جانا ہے اپنے شہر اپنے لوگوں کے بیچ۔سٹیپا نکرت Stepanakert میں سسرال اور میکہ دونوں ہی ہیں۔جذباتیت میں بھول ہی گئی کہ وطن تو آگ کے شعلوں میں گھرا رہتا ہے۔چھوٹا سا علاقہ جوفوجی دبدبے،نسلی تشدد،سول سوسائٹی کے اضطراب،مشکلات اور بغاوتوں کا شکار رہتا ہے۔کبھی یہ آرمینیائی بادشاہت کا حصّہ،کبھی رومنوں کا،کبھی پرشیہ کا،کبھی عثمانیوں،کبھی روسیوں اوراب آذریوں کا جوایک مستقل جھگڑے کا باعث ہے۔سویت طاقتور تھا تو چلو امن تھا۔مگر 1991 میں تو اس کا اضطراب اِسے جنگ میں گھسیٹ لے گیا۔اب اس کے قوم پرست کہہ لو یا باغی آرمینیا کی پشت پناہی پر

لڑتے بھڑتے رہے۔1994 میں معاہدہ بھی ہوا مگر امن پھر بھی نہیں تھا۔آذر بائیجان کی ہمارے اوپر مکمل کنٹرول کرنے کی خواہش اور آرمینیا کی ہماری نسلی تحفظ کی تمنا اور خواہش سب ہمیں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم اِن بڑی طاقتوں کی عیاریوں ،مکاریوں اور مفادات کے درمیان پس رہے ہیں۔بڑی طاقتوں کی بولیاں سمجھ نہیں آرہی ہیں۔ناگورنو کاراباخ مکمل طور پر آرمینیا کے سہارے پر ہے۔آرمینیا روس کا محتاج۔روس کے مفادات دونوں کے ساتھ جڑے ہوئے۔آذر بائیجان کے ساتھ ترکی کھڑا ہے۔ترکی تو کچھ زیادہ ہی جوشیلا ہورہا ہے۔اب پاکستان کا نام بھی سنا جارہا ہے۔کوئی عام آدمی کا نہیں سوچتا۔گھر مسمار ہورہے ہیں۔لوگ مر رہے ہیں اور کہیں تہہ خانوں میں بند ہیں جیسے میں میرے بچے اور شوہر۔ خطرے کے سائرن، برستی آگ کے شعلے جو خواب اور خواہشیں سب بھسم کر رہے ہیں۔لوگ جان بچانے کے لیئے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔اپنے گھر اپنی دھرتی انہیں چھوڑنا کتنا مشکل ہے۔کوئی ان بڑے لوگوں سے پوچھے کہ اگر یہ سب ان کے ساتھ ہوتو؟

کیا دنیا ایک اور جنگِ عظیم کا سامنا کرنے جارہی ہے۔کیا انسانیت ایک بڑے پیمانے پر پھر قتل ہونے جارہی ہے۔

☆☆☆

''صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے''

شارلٹ برونٹے کے ناول بے شک جین آئر ہو، شرلی یا ویلیٹ ہوں سب انگریزی ادب میں کلاسیک کا جو مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اُس سے انگریزی ادب پڑھنے والا کوئی فرد انکار نہیں کر سکتا۔ شارلٹ برونٹے اور ان کے فن پاروں پر تفصیلی بات کرنے سے قبل مجھے اپنے قارئین کے سامنے ایک سوال اٹھانا ہے کہ کیا ہمارے اُردو ادب میں بھی کسی خاتون کے تحریر کردہ ایسے ناول ہیں جنہیں ہم بھی اردو ادب میں کوئی مقام دے سکیں۔ معذرت کے ساتھ قرۃ العین یا اُنکا ''آگ کا دریا'' یا عصمت چغتائی اور انکے ناول افسانے یا اور بڑے نام میرے سامنے نہیں۔ میرا مسئلہ جین آئر جیسے ناول، اسکے پلاٹ، اسکی تھیم اور اُسے ملنے والی بے پایاں شہرت کے حوالے اور ساتھ ہی کم و بیش اُسی نسبت سے تعلق رکھنے والے ناولوں اور اُن سے جڑے اپنے لوگوں کے رویوں اور تعصّبات سے ہے۔ جنہیں اپنی چیزوں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی تا کہ باہر کی دنیا کا کوئی بندہ اس کا احساس نہ دلائے۔ نصرت فتح علی خان کی مثال وضاحت کیلئے کافی ہے۔

تو آیئے پہلے ذرا جین آئر کا سرسری سا جائزہ لے لیں۔ جین آئر محبت، رومانس، ایک نوجوان لڑکی کے داخلی اور خارجی اثرات کے ساتھ ساتھ ذاتی تجربات

پر مبنی ایک اثر انگیز کہانی جس کے واقعات کا بیشتر حصّہ اسکے اپنے ماحول کا عکاس ہے۔حالات کا اُتار چڑھاؤ پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہوکر اسے پرتاثیر بنا تا ہے۔فطری رنگ میں ڈھلی ہوئی، واحد متکلم انداز میں لکھی ہوئی اس نسوانی تحریر میں قاری ڈوب کر بے اختیار اس کا ہر صفحہ الٹتا چلا جاتا ہے۔یہی وہ خوبی ہے جس نے انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں چھپنے والے اِس ناول اور مصنفہ کو اتنا مقبول بنا دیا کہ اسکا شمار کلاسیک میں کیا جانے لگا۔

پروفیسر پہلا ناول تھا۔بعد میں جین آئیر،شرلی ایما اور ویلیٹ لکھے گئے۔شرلی میں بھی کہہ لیجئیے کہ شارلٹ برونٹے خود ہے اور صیغہ غائب میں کہانی کا سارا بیانیہ ہے۔یارک شائر کا ماحول اس ماحول کی ایک سچی تصویر۔جس میں لوگوں کے معاشرتی مسائل، خاندانی لڑائی جھگڑے،صنعتوں کی وجہ سے بے روزگاری اور بے سکونی کا ماحول سب کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ویلیٹ (Villette) میں اس کی اپنی تنہائی، ذات پر داخلی اور خارجی دباؤ ناول میں ہیروئن کا ویلیٹ میں تعلیم کیلئے جانا،کونسٹنٹائن ایثر یرادارے کی تفصیلات، وہاں کا ایک مختلف ماحول۔یہ سب اس کے ذاتی تجربات تھے۔

اوراب اُردوادب کی جس ناول نگار کا تذکرہ کرنا ہے وہ اے آر خاتون ہیں۔جن کے ناول شمع،تصویر اور افشاں ہیں۔

میں سمجھتی ہوں ان ناولوں نے بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اتر پردیش (یعنی یو پی) کے شہروں میں اونچے متوسط،متوسط اور نچلے طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلمان اشرافیہ کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کو جس عمدگی اور خوبصورتی سے لکھ کر محفوظ کیا وہ اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ ہے۔

ایک پردہ نشین عورت اپنے کرداروں کی اندرونی اوراس پر اثر انداز ہونے والے

بیرونی اثرات کی بنت، اپنے ماحول اور اپنی روایات کے پس منظر میں اِس عمدگی سے بنتی ہے کہ انسانی فطرت کے خیر وشر کے پہلو لئے کچھ ظاہر، کچھ باطنی رخ محبتوں اور نفرتوں میں گندھے سامنے آتے ہیں کہ ہر کردار ذہن پر ایک بھرپور نقش چھوڑتا ہے۔

کہانی اتنی مظبوط کہ بے شمار کرداروں کے باوجود کہیں جھول نہیں۔ ایک تسلسل اور روانی سے آگے بڑھ کر ناول کو حتمی انجام تک پہنچاتی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اِن تینوں ناولوں میں کوئی بڑا پیغام نہیں۔ انہوں نے کسی بڑے موضوع کا احاطہ نہیں کیا۔ انہوں نے کوئی ماورائی فلسفہ پیش نہیں کیا۔

ہاں رشتے ناطوں میں خاندانی رنجشوں، سیاستوں، توڑ جوڑ، محبتوں، نفرتوں کے جذبات کی فراوانی کے ساتھ انگریز دور حکومت کے نقوش کا بھی ذکر ملتا ہے۔ کہانی کے اندر شادی بیاہ، موت، پیدائش کے مرحلوں میں زندگی کے سبھی رنگوں کو اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کے ہمراہ بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اب یہ سب بڑے ادیبوں کو بھلے نہ بھائے اور وہ بے اختیار کہیں کہ یہ کیا رنگوں کا مینا بازار سجا دیا ہے۔ یہ کیا غم کے موقع پر بھی خرافات کا سیلاب امنڈا ہوا ہے، مگر حقیقاً یہ اُس کے اپنے ماحول کی عکاسی ہی تھی کہ اُس دور کا ثقافتی پس منظر ایسا ہی تھا۔

ناولوں کی اِس پیشکش نے اُس مخصوص دور کی مسلم تہذیب وثقافت کو اوراق میں محفوظ کیا جو تقسیم کے ساتھ زوال پذیر ہوگئی۔

''تصویر'' اور ''افشاں'' دونوں ناول بھرپور ڈرامائی تاثر کے حامل ہیں۔ تصویر میں برصغیر کی قدیم داستان گوئی کا رنگ اپنے پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ یہاں قاری کا پڑھتے پڑھتے جس طرح سانس رکتا اور اُسے پھرتی سے صفحہ الٹنے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ حقیقتاً کمال کا ہے۔ افشاں میں بھی یہ چیز نظر آتی ہے مگر قدرے کم۔

اب ذرا مصنفات کی زندگیوں کا بھی تھوڑا سا احوال بیان ہو جائے۔

یہ انیسویں صدی کی دوسری دہائی کا اختتام ہے جب کاؤنٹی یارک شائر کے شہر بریڈ فورڈ کے ایک قصبے ماورتھ میں پیٹرک برونٹے پادری کے گھر 1816 اور 1818 میں شارلٹ اور ایملی برونٹے پیدا ہوئیں۔ان کی تیسری بہن این برونٹے بھی تھی۔یہ وہ زمانہ تھا جب لڑکیوں کی تعلیم کا زیادہ رواج نہ تھا۔تاہم والد چونکہ پڑھے لکھے تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ انکی بیٹیاں پڑھیں۔بچپن ہی سے تینوں بہنوں کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔جو کتاب بھی ملتی وہ ضرور پڑھتیں پھر اس پر اظہار خیال ہوتا۔بحث مباحثے سے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھار ملنے لگا تو انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔آغاز میں یہ کام وہ چھوٹی چھوٹی ڈائریوں پر کرتیں۔کاغذوں کو سی لیتیں یوں ایک کتاب بن جاتی۔

تینوں بہنوں نے اب الگ الگ ناول لکھنے شروع کیے اور تینوں نے انہیں لندن کے ایک پبلیشر کو بھیج دیا۔جس نے دو ناول پسند کیئے اور شارلٹ کے ناول کو ردّ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو بڑا ماٹھا ناول ہے۔تاہم شارلٹ نے ہمت نہ ہاری اور جین آئر لکھا اور پبلیشر کو بھیج دیا۔ناول چھپ گیا۔اسے غیر معمولی پذیرائی ملی۔یوں لکھنے کی راہ ہموار ہوگئی۔

اب ذرا اے آر خاتون کو دیکھیئے۔پہلا سوال بھئی یہ کون ہیں؟ چھٹی،ساتویں دہائی تک تو میری طرح بہتوں کو نہیں پتہ تھا۔

ہاں کسی سے اتنا ضرور سُنا تھا کہ پاپولر فکشن لکھنے والی نادرہ خاتون کی والدہ ہیں۔ہاں بھلا ہو فاطمہ ثریا بجیا کا جنھوں نے ان کے تینوں ناولوں کے ٹی وی سیریل بنائے اور یوں انکے نام کو عوامی سطح پر پذیرائی دی۔شکل سے تو کوئی بھی واقف نہیں۔ہاں البتہ اب اتنا سا ضرور علم ہوا ہے کہ اتر پردیش انڈیا کے ایک معزز خاندان سے تعلق تھا۔ناولوں کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ کہیں اس وقت دستیاب بھی نہیں۔

شاید کسی بڑی لائبریریوں سے کھوج کیا جائے تو کہیں اسکے اُردو سیکشن میں گرد آلود پھٹی پرانی صورتوں میں موجود ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میری طرح جن لوگوں نے اِن ناولوں کو پڑھا ہے وہ ان کے اندر موجود ایک مظبوط کہانی سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے اور وہ کہانیاں انہیں اب بھی یاد ہوں گی۔

☆☆☆

راجندر سنگھ بیدی کے آخری ماہ و سال

راجندر سنگھ بیدی اُردو ادب کا ایک بے مثال نام ،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسا حقیقت پسند افسانہ نگار ہے جس کے ہاں قوت مشاہدہ اور قوت متخیلّہ دونوں جواہر اپنی بھرپور توانائی اور شدت سے موجود ہیں ۔انسانی ذات کی جتنی پرتیں اور تہیں ہیں ، اس کی شخصیت میں نفسیاتی مسائل کی جو کجیاں اور گرہیں ہیں ، وہ بیدی کی ایکسرے مشین میں فٹ آنکھ کی طرح اس کے اندر اتر کر ہر نس اور ہر ورید کی حقیقت کو جان لیتی ہیں ۔ یہ اُس کا وہ وصف ہے جس نے اُس کی ہر تحریر خواہ وہ بچوں کے لئے لکھی گئی یا بڑوں کے لئے ،اُسے لافانی بنا دیا۔ سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے اس عظیم لکھاری کی شخصیت کی اتنی جہتیں تھیں کہ اُسے ورسٹائل کہنا بے حد موزوں ہے ۔ اُردو کا بہت بڑا لکھاری تو وہ تھا ہی مگر ایک کامیاب سکرین اور ڈائیلاگ رائٹر کے ساتھ ساتھ ایک بہترین فلم ڈائریکٹر کا اعزاز بھی اس کے پاس تھا۔ ایسے بڑے کامیاب اور بھرپور زندگی گزارنے والے لکھاری کے آخری ایام کیسے گزرے؟ عروج کی بلندیوں کو چھونے والے کا زوال کیسا تھا؟

نچلے متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے بچے جن کی غربت اور مسائل ان پر دو طرح کے ردعمل کرتے ہیں کہ یا وہ بہت کمینے اور کنجوس بن جاتے ہیں یا پھر شاہ خرچ ہو جاتے ہیں ۔ بیدی بہت شاہ خرچ تھا، مگر اس شاہ خرچی کے ساتھ کچھ اور قباحتیں بھی اُس کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں ۔ شراب اور فلموں کی ہیروئنوں سے تعلقات ۔ اُس کی بیوی ستونت جسے وہ پیار سے سوما کہتا تھا بہت خوب صورت، محبت کرنے والی ، ہمدرد ، سچی ، کھری ، ہٹیلی ، کٹر مذہبی اور ضدی عورت تھی ۔ اُسے اُس کی ان دونوں باتوں سے شدید چڑ تھی ۔ ستونت کو کچھ صحت

کے بھی مسائل تھے جنہوں نے اُسے چڑ چڑی اور بدمزاج بنادیا تھا۔

1973ء بڑا منحوس سال تھا اُس جیسے کامیاب فلم ساز کے لئے کہ فلم ''پھاگن'' فیل ہوگئی اور اس کی بہت سی چیزوں کا بک بکاؤ ہوگیا۔ جس میں اس کا دفتر مع سارے سازوسامان کے تھا۔ گھر میں آئے دن کے دنگا فساد اور مالی خسارے سے تنگ آ کر وہ گھر چھوڑ کر اپنے بڑے بیٹے نریندر کے دفتر کے ایک کمرے میں رہنے لگا تھا۔

یوں بیدی ستونت کا بڑا مدّاح بھی رہا تھا کہ ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' جیسے اپنے ایک مشہور افسانے کی ہیروئن اندو اس کی ستونت کے علاوہ کوئی اور نہیں تھی کہ جس نے اس کے بہن بھائیوں کو پالا، انہیں پڑھایا لکھایا اور پھر ان کی شادیاں تک بھی خود کیں، مگر یہ تو گئے دنوں کی بات تھی کہ جب آتش جوان تھا اور جب پسینہ گلاب تھا۔ اب اُسے بیدی کے تمباکو کی بو سے اور شراب سے متلی ہوتی تھی۔ جبکہ اُس کی ہیروئنیں مکمل خودسپردگی کی تصویریں تھیں۔ انہیں بیدی کی کوئی بات کوئی حرکت بری نہیں لگتی تھی۔

بیدی اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک ہمدرد، جذباتی، نرم دل اور ماڈرن دانشور تھا۔ شراب، تمباکو، عورت سب سے جی بھر کر شغل کرتا۔ شدید جھگڑوں کی جڑ ''آنکھن دیکھی'' کی ہیروئن سُمن نے پیدا کی۔ معاملہ تو پہلے ہی خراب تھا۔ ''دستک'' کی ہیروئن ریحانہ سلطان سے معاملہ قابو سے باہر ہوگیا تھا۔

جب بھی دونوں کے درمیان تُو تُو میں میں ہوتی، بیدی کہتا۔

''تم مجھ سے نفرت کرتی ہو ستونت۔''

تب وہ چلاّتی اور کہتی۔

''ہاں ساری جوانی تمہیں تمہارے بچوں اور تمہارے بہن بھائیوں کو دے کر اب یہی تو وقت ہے تم سے نفرت کرنے کا۔''

پھر وہ غصے سے چیختے ہوئے کہتی۔

''اپنی صورت نہیں دیکھتے۔ جاؤ آئینے میں غور سے دیکھو اُسے۔ ارے مورکھ تمہاری آنکھوں کے نیچے لٹکتی یہ موٹی تھگلیاں اور داڑھی کو رنگنے کے باوجود کیا انہیں تیرا بڑھاپا نظر نہیں آتا۔ آتا ہے مگر وہ خرانٹ تجھے اُلو بناتی ہیں۔ اِن اُڈراری مارتتلیوں کو ہیروئن بننے کا لالچ نہ دو تو تم پر تھوکیں بھی نہ۔''

یہی وہ آئے دن کے جھگڑے تھے جو آغاز میں دونوں کے لئے بلڈ پیریشر کا باعث تھے تو آہستہ آہستہ دل کے دورے کا باعث بن گئے۔ ایسے ہی ایک دورے میں جب ستونت ناناوتی اسپتال (ممبئی) میں داخل ہوئی۔ ایک ہفتہ میں صحت یاب ہوئی اور جب بیدی اُسے لے جانے کے لئے اسپتال گیا، اتفاق سے اُس وقت بھی اُس کے پاس شراب کی بوتل تھی۔ ستونت نے کہا۔

''چلو اب باتھ روم میں جا کر نہ پینا میرے سامنے پی لو۔''

مگر ہوا یہ کہ بیچ میں سُمن کا ذکر چھڑ گیا۔ ستونت کو معلوم ہوا کہ بیدی اُس سے مل کر آرہا ہے۔ اُس نے غصے سے کہا۔ ''یہاں میں تمہارا انتظار کر رہی تھی کہ آؤ گے اور میں گھر جاؤں گی۔''

جھگڑا بڑھ گیا۔ تو تکار اور طعنہ و تشنیع کے گولے بارود برسنے لگے۔

''میں مر رہی ہوں اور تمہیں عیاشی سے فرصت نہیں۔''

جواباً بیدی کا چلاّنا کہ ''مرتی بھی نہیں ہو۔ مرو۔ چھوڑو میرا پیچھا۔''

اور عین اُسی وقت ستونت کو دل کا دوڑہ پڑا اور اس نے بیدی کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔

احساسِ جرم اور پچھتاوا تو تھا، مگر اس کی مدت بڑی مختصر تھی کہ جب بیدی کی

ہمسائی مسز شاہ سے اُسے پیغام ملا کہ ستونت ستر ہزار روپے کے کیش سرٹیفکیٹ اس کے پاس چھوڑ گئی ہے جو دونوں بیٹیوں کے مشترکہ نام سے لئے گئے ہیں۔ ستونت کی تاکید تھی کہ یہ بیدی کو نہ دیئے جائیں۔ جرم کا وہ احساس جو بیدی کے اندر پیدا ہوا تھا اس بات کو سنتے ہی یکدم ختم ہوگیا اور وہ پھر گالی گلوچ پر اُتر آیا۔

ستونت کی موت نے اس لحاظ اور دنیاداری کی تھوڑی بہت شرم کو بھی بالائے طاق رکھ دیا۔ فلم ''آنکھن دیکھی'' کی شوٹنگ ہوتی، سُمن اُس کے اعصاب پر سوار رہتی۔ شام کو وہ اپنے سامنے وِسکی کی بوتل رکھ لیتا، پیتا اور ملکہ پکھراج کی گائی ہوئی فیض کی غزل سنتا۔

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

اِن راتوں میں وہ ہاتھ میں پکڑی بوتل کے گھونٹ بھرتا۔ گندی اور فحش گالیاں دیتا۔ نہ کھانے کا ہوش رہتا۔ یوں ہی آڑا ترچھا سو بھی جاتا۔ کبھی ہیروئن کو روک لیتا۔ یہ اُس کی بے پناہ خود فریبی کا زمانہ تھا۔

''آنکھن دیکھی'' ختم ہوئی اور ساتھ ہی سُمن نے شادی کر لی۔ بیدی نے وہ جھٹکا کھایا کہ خودکشی کی کوشش کی، خیر بچ گیا۔ انہی دنوں میں اُس کا فلیٹ بک گیا تھا۔ چند ماہ بعد فالج ہوگیا۔ وہ معذور ہوگیا تھا۔ چلنے پھرنے، بولنے اور لکھنے میں بے حد تکلیف ہونے لگی تھی۔ ایک آنکھ پہلے آپریشن میں ضائع ہوگئی تھی۔ ایک ستم یہ بھی تھا کہ بیٹا نریندر جو خود بھی فلم ساز اور ہدایت کار تھا، ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ اب اُس کی بیماری بہت بڑھ گئی۔ اس کے جسم کے نچلے آدھے حصے میں کینسر پھیل گیا تھا۔

یوں وہ علاج معالجے کے معاملے میں بہت خوش قسمت تھا کہ سارا خرچ لندن کا ایک ادارہ برداشت کر رہا تھا۔ بہو، بیٹیاں اور اُن کے شوہر جیسے پیسوں کے چکروں میں الجھے

ہوئے تھے۔ بڑی بیٹی نریندر کی بیوی سے لڑتی تھی کہ فلیٹ کا جو روپیہ آیا ہے اس میں ان کا حصہ کہاں ہے؟ وہ انہیں کیوں نہیں ملا؟ کچھ ایسا ہی حال بہو کا بھی تھا۔

بیدی کی شخصیت کا اگر باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو اس کی بہت سی نفسیاتی الجھنوں میں زیادہ کا تعلق اس کی فلمی دنیا سے وابستگی کی وجہ تھی۔ فلمی اسکینڈلوں یا ہیروئنوں کے ساتھ دوستیوں کو وہ اپنے پیشے کی ضرورت قرار دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ ستونت اس ضمن میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کا بیٹا نریندر فلم ساز اور ہدایت کار ہوتے ہوئے بھی عورتوں سے دور رہا۔

بہرحال ایک بہت بڑا افسانہ نگار جو بشری کمزوریوں کے باوجود ایک حساس، ایک دردمند انسان جو اپنے آخری دنوں میں نیم بہوش بستر پر پڑا رہتا۔ ہوش میں آتا تو اندر کی بے چینی اور اضطراب بے کل کر دیتا۔ کبھی اٹھتا کبھی بیٹھتا۔ فالج کی وجہ سے ایک ٹانگ چھوٹی ہوگئی تھی۔ کھڑے ہونے کی کوشش میں گر پڑتا۔ تکیے پر سر پٹختا۔ اپنے پرانے ذاتی خادم سے ٹوٹی پھوٹی باتیں کرتا۔ اس پرانے وفادار نوکر جس کے نام اس نے اُس کی دیرینہ خدمات کے عوض بیس ہزار روپیہ بینک میں جمع کروا دیا تھا کہ وہ اس کے مرنے کے بعد کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کرلے۔ ایک بھرپور زندگی گزارنے والے کے لئے یہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے والی بات کتنی دکھ بھری تھی۔ مگر یہی زندگی کے شاید المیے ہیں۔

☆☆☆

اور اگر میں تب ریپ ہوجاتی تو۔۔۔

موٹر وے گینگ ریپ حادثے کو ہفتہ بھر ہونے کو آیا ہے پر دل سے ویرانی اور طبیعت پر چھایا ڈپریشن ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔تین بچوں کی ماں جو فرانس جیسے آزاد اور ترقی یافتہ ماحول میں سانس لینے والی کم ظرف حکومتی عہدہ داروں کے بھونڈے اعتراضات کی سان پر چڑھی ہے۔

رات کے ایک بجے اکیلی عورت کو گھر سے نکلنے کی ضرورت؟ پیٹرول کیوں نہیں چیک کیا گیا؟ سنسان راستے پر کیوں چڑھی؟

ابھی حادثے کا پہلا دوسرا دن تھا۔مظلوم خاتون کے بارے میں کچھ تفصیل سامنے نہیں آئی تھی۔ ہاں گوہر تاج نے میری ٹائم لائن پر اپنا نوحہ لکھا تھا۔''سُنتی ہوں ان محافظوں کی باتوں ،کو دیکھتی ہوں اِن کے کاموں کو۔''اور بوجھل روح سے میں نے اُسے مخاطب کیا تھا۔'' گوہر میری جان ہوگی کوئی میرے جیسی جنونی آوارہ ،گرد، من موجی سی عورت جو ایڈونچر اور تھرل کے شوق میں کچھ زیادہ سوچتی نہیں اور کتنی سرپھری لڑکیاں ہیں جو گواچی گاں کی طرح منہ اٹھا کر چل پڑتی ہیں۔ریاست تو ماں کی طرح ہوتی ہے۔تحفظ دینے والی،مگر کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ ساری زندگی میرے تو اپنے لچھن بس ایسے ہی رہے۔

کہیں بھول سکتی ہوں زندگی کے وہ ماہ و سال جب بیاہ نے مجھ جیسی اڑتی چڑیا کو پنجرے میں قید کر دیا تھا۔سسرال نے ناک میں نتھ نہیں نکیل ڈال دی تھی۔جس نے ناک کے نتھنے چھوڑ براچھیں بھی چیر دی تھیں۔سارے عزائم اور خواب چولھے پر پکتی ہنڈیا سے نکلتی بھاپ کی مانند فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔''صبر میری بچی صبر اِس کڑے وقت نے گزر جانا

ہے۔''ماں کا یہ ہدایت نامہ امید کی جھلک ضرور دکھاتا میرے مگر مرنے تو بہت سارے تھے۔ پہلا اور اہم یہ ہی تھا کہ بی کلاس کی اس پڑھی لکھی عورت جس کے اندر اپنے آپ کو منوانے اور شہرت حاصل کرنے کے جراثیم گو کڑے حالات کی اینٹی بائیوٹک دواؤں سے نڈھال ضرور ہو گئے تھے۔ پر مرے نہیں تھے۔ بچوں کے ذرا سے سر اٹھانے کے ساتھ ہی اب پوری توانائیوں سے دوبارہ زندہ ہو رہے تھے۔

دوسرا بڑا امر نا لڑ لگنے والے کی امن پسندی کا تھا کہ جسے زندگی کی رواں دواں ندی میں طغیانی چھوڑ ہلکے سے بھنور بھی پسند نہ تھے۔

ایک بار دورے پر کوئٹہ جا رہا تھا۔ میں نے بریف کیس تیار کیا۔ اسے پکڑایا اور کہا

''مجھے بھی ساتھ لے چلتے۔ کوئٹہ نہیں دیکھا۔ دیکھ لیتی اسی بہانے''۔ اپنے آپ پر کلون کی بارش کرتے ہوئے لڑ لگنے والے نے گھوم کر یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہو گئی ہوں۔

''لو تمہیں کہاں گھسیٹتا پھروں گا۔ میں تو وہاں کام بھی ڈھنگ سے نہ کر سکوں گا۔ دھیان تم میں ہی اٹکا رہے گا کہ کہیں کوئی رکشہ، ٹیکسی والا ہیر پھیر نہ کر جائے۔''

میں نے دھیرے سے کہا۔

''میں انجانی جگہوں، انجانے شہروں، ناواقف راستوں اور اجنبی لوگوں سے کبھی نہیں گھبراتی۔ ہمیشہ راستے نکال لیتی ہوں اور میرے ساتھ کبھی کوئی ہیرا پھیری نہیں ہوئی''۔

اور بریف کیس کو زوردار جھٹکا دیتے ہوئے اس نے طنزاً کہا۔

''عجیب عورت ہو۔ یہاں اجنبی جگہ پر سونا مشکل ہو جاتا ہے۔ میں دوروں سے جان بچاتا پھرتا ہوں۔ میرا سارا سکون غارت ہو جاتا ہے''۔

بڑی ٹھنڈی سانس بھر کر خود سے کہا تھا۔ یہاں تو بھینس کے آگے بین بجانے والا معاملہ ہے۔

شمالی علاقہ جات پر لکھنے کا منصوبہ ذہن میں سالوں سے بند پڑا تھا۔ ڈھیٹ بن کر

خدمتِ عالیہ میں عرضی پیش کی۔

''میں شمالی علاقوں کی سیاحت کے لئے جانا چاہتی ہوں۔ مجھے کچھ لکھنا ہے۔''

ہونٹوں اور آنکھوں میں طنزیہ ہنسی ابھری تھی۔

کچھ عرصے بعد مدعا پھر گوش گزار کیا۔ اس بار لہجے کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی جھلاہٹ تھی۔

میں کونسا کم تھی۔ 1985ء میں گھر کے ایک حصّے کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ ساتھ ہی ذہن میں پکتے منصوبوں نے عمل کی راہ ڈھونڈی۔ اسلام آباد چھوٹی خالہ کے پاس جانے کا اجازت نامہ لیا۔

تو پھر یہ طے تھا کہ میں نے ان علاقوں میں جانا ہی جانا ہے۔

اپنے تینوں بچوں کے ہمراہ جن کی عمریں نو، چھ اور چار سال تھیں اسلام آباد پہنچ کر چھوٹی خالہ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ آپ کا تعاون درکار ہے۔ ان علاقوں پر لکھنا میرا خواب ہے۔ اور میرا یہ خواب مجھے بے کل کیے ہوئے ہے۔

چھوٹی خالہ بہت جز بز ہو رہی تھیں۔

''کمبخت ابھی تو آئی ہو اور ابھی نئے محاذ پر نکل رہی ہو۔ وہ بھی تن تنہا، کوئی چھری تلے گردن آئی ہے تیری۔ کوئی بازو بیلنے میں آ گیا ہے۔''

میں ہنسی۔

''بازو ہی تو بیلنے میں آ گیا ہے۔ ارے کیا کروں چھوٹی خالہ؟ ایک تو اس جذبہ حب الوطنی نے مار ڈالا۔ دوسرے خودنمائی اور منفرد بننے کے جذبات نچلا نہیں بیٹھنے دیتے۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا والی بات ہو رہی ہے۔ رہی بات تنہا گھومنے پھرنے کی، ان پڑھ والدین کا یہی فائدہ ہوا تو ہے مجھے کہ اپنی ذات پر اعتماد سیکھا۔ اپنے کام خود کرنے کی عادت ڈالی۔ سہارے ڈھونڈنے اور ان کی محتاجی سے نفرت کی۔''

ان کے چہرے پر پرانی یادوں کے چراغ جل اُٹھے تھے۔ جب وہ باپ مانند اپنے بھائی جو گلگت ایجنسی کا بڑا افسر رہا تھا قیام پاکستان کے بعد اُڑن کھٹولے پر بیٹھ کر ہر سال اُن کے پاس جاتی تھیں۔ وہاں کے قصّے کہانیوں اور سوغاتوں کی نمک خوار تھیں۔

''سدا کی ہٹیلی اور ضدی ہو۔ جا اللہ کی حفاظت میں۔'' میں دو جوڑے کپڑوں اور واقف مقامی لوگوں کے ایڈرسوں کے ساتھ نیٹکو بس سروس میں جا بیٹھی۔ مقامی لوگوں سے بھری بس جس میں صرف دو عورتیں ایک میں اور دوسری ممتاز مفتی کی بھانجی عروج جو ہنی مون منانے گلگت جا رہی تھی۔

اٹھارہ گھنٹے کا طویل سفر۔ پہلا پڑاؤ چلاس۔ خوش قسمتی کہ واقف فیملی اگلے دن بابو سر ٹاپ اپنے گرمائی مستقر جا رہی تھی۔ ساتھ لے گئی۔ دو دن وہاں رہتے، مقامی کلچر کے رنگوں سے آشنائی کرتے دو دن بعد گلگت پہنچی۔

وادی یاسین نگر ہنزہ گلمت آج سوچتی ہوں کہ میرے لچھن تو سارے کے سارے اپنا ریپ کروانے والے تھے۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی میں نے۔ بس بچت ہوگئی تھی کہ اوپر والے کو مددگار کر لیا تھا۔ ہونٹوں پر رکھ لیا تھا۔ اُسے آنکھوں میں بسا لیا تھا اور اس نے بھی لاج رکھ لی۔

مضمون کی دم تقاضا کرتی ہے کہ اختتامیہ سین لکھ دوں۔

میرے چھوٹے بیٹے نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ نویں دن جب وہ قریبی گھر میں باپ کا فون سننے گئے۔ دونوں بڑے تو ماں کا پردہ رکھتے تھے۔

گھر آ کر میں نے بھی پیر پکڑ لیے تھے۔ میرا اندر تو ٹھنڈا ہوا پڑا تھا۔ سرور میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہدف حاصل کر بیٹھی تھی۔ لتّر بھی کھانے کو ملتے تو خوشی سے کھا لیتی۔

ہاں یہ ضرور ہوا میری رندھی آواز اور چھم چھم بہتے آنسوؤں کے درمیان میرا یہ کہنا کہ ڈر کی وجہ سے میرا تو کام بھی پورا نہیں ہوا۔بلتستان تو گئی ہی نہیں۔شاید اُسے گھائل کر گیا تھا۔

ٹھیک ایک ماہ بعد میں اپنی دوست کے ساتھ بلتستان جا رہی تھی، بچے میاں نے سنبھالے اور انتظام بھی اسی نے کیا۔

☆☆☆

میرے درد کا کوئی درماں ہو۔

بیل بجی تھی۔40 کے پیٹے میں ایک سنجیدہ سی لڑکی نما خاتون نے دروازہ کھولا۔دروازے پر ادھیڑ عمر کے ایک اے ایس آئی کے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل کو کھڑے دیکھ کر گھبرائے ہوئے تاثر اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے آنے کی غرض وغایت کا پوچھا۔

''آپ کوئی اکیڈمی چلا رہی ہیں؟'' اے ایس آئی نے سوال کیا۔خاتون نے تھوڑے سے تذبذب بھرے لہجے میں کہا۔''کہہ لیجیے ۔باقاعدہ اکیڈمی تو کرونا سے پہلے تھی،آج کل تو نہم دہم کے چند بچے آرہے ہیں۔وہ بھی اُن کے والدین نے بہت مجبور کیا ہے۔''

دراصل 15 پر گذشتہ پانچ دنوں سے کالیں آرہی ہیں کہ یہاں ٹیوشن ہورہی ہے۔پہلی بار ہم نے اِسے نظر انداز کیا۔دوسری بار بھی توجہ نہیں کی۔اب چھ بار مسلسل اِن کالوں کو نظر انداز کرنا مشکل تھا۔میرا خیال ہے کہ یہ آپ کے پاس پڑھنے والے بچوں میں سے ہی کوئی ہیں۔

خاتون نے گیٹ کھولتے ہوئے کہا'' آپ اندر آکر دیکھ لیں کہ ان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔بچے کتنے ہیں اور ماسک پہنے ہوئے ہیں یا نہیں؟''۔

اے ایس آئی نے کہا۔

''اِس کی ضرورت نہیں۔میڈم آپ انہیں پڑھائیں۔آپ نیک کام کررہی ہیں۔اس ملک کے بڑے غریبوں کے بچوں کو جاہل رکھنا چاہتے ہیں۔یہ عام لوگوں کا علاقہ ہے جہاں گھروں کے اندر ایک کمرے میں بیس بیس بچے بیٹھے ہیں۔جب سے لاک ڈاؤن ہوا ہے، والدین مسلسل انہیں ٹیوشنوں پر بھیج رہے ہیں۔الحمداللہ ہم بھی علاقے کی پٹرولنگ پر ہوتے ہیں۔ایک کیس کسی بچے کا رجسٹرڈ نہیں ہوا۔پڑھائیں انہیں۔علم دیں۔اس ملک کو تعلیم کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔''

خاتون کی آنکھوں میں حیرت اُبھری۔پولیس کا بندہ سوچ میں بڑا منفرد لگا تھا۔ خاتون ماہرِ تعلیم ہی نہ تھی بلکہ ملکی سیاست اور حالاتِ حاضرہ سے بھی گہری دلچسپی رکھتی تھی۔عام پولیس کی سوچ میں اِس احساس کا پیدا ہونا خوش آئند لگا۔ایک کپ چائے کی آفر کی۔پولیس والا انکاری ہوا۔مگر اس کا اصرار اُسے گھسیٹ کر اندر لے آیا۔

''آپ کا براہ راست واسطہ لوگوں سے رہتا ہے۔کورونا کی صورت ہماری معلومات کے مطابق گذشتہ ماہ سے نارمل ہی ہے۔پھر بھی سکول کھولنے میں حکومت کے عزائم اور پابندیاں ناقابلِ فہم ہیں۔آئے دن الٹے سیدھے بیان۔تین ماہ ہوگئے ہیں۔ان کی لن ترانیاں سُنتے ہوئے۔آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟۔

میڈیم نالائق لوگ اکھٹے ہوگئے ہیں۔جن کے پاس نہ تجربہ ہے اور نہ پلاننگ۔میں ڈبل ایم اے ہوں، ایم اے انگریزی اور ایم اے سیاسیات۔سارے امتحان میں نے نوکری میں ہی پاس کیے۔مقابلے کا امتحان بھی دیا۔تحریری میں پاس ہوگیا۔انٹرویو میں فیل ہوگیا۔کیوں؟ میری پُشت پر بڑی سفارش نہیں تھیں۔دو تصویریں دکھاتا ہوں۔ایک اپنے علاقے کی۔اسی سے ملتی جلتی صورت باقی جگہوں کی بھی ہے۔پوش علاقوں کو چھوڑ دیں۔پہلے ذرا کورونا بارے صورت واضح کر دوں۔

ہمیشہ کی طرح اس بار بھی بارش میں نشیبی علاقے جھیلیں بن گئے تھے۔ جہاں آنے جانے کی مشکلات کا سامنا تھا۔ وہیں بچوں کی موجیں ہوگئیں۔ یہ منظر گذشتہ بہت سالوں سے ہم دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ بچے نہا رہے ہیں۔ موج مستیاں کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر پانی اچھال رہے ہیں۔ کوئی کہے گندہ پانی تھوڑا بہت ان کے اندر نہیں جاتا تو غلط ہے، اندر جاتا ہے۔ گو واٹر پلانٹ سے گھر والے ڈرم بھر بھر لاتے ہیں مگر پھر بھی ان کی زندگیوں میں احتیاطیں نہیں ہیں۔

بندر روڈ پر گاڑیوں، رکشوں اور چنگ چیوں کا ایک طوفان آیا رہتا ہے۔ چوک پر ایک جانب لنڈا بازار کھلا ہوا ہے۔ جوتوں کی سیڑھیاں، رسیوں میں لٹکے کپڑے اور اُن پر مکھیوں کی طرح بھنبھناتے لوگ۔ بھاؤ تاؤ۔ ایک جانب ایک ٹھیلے میں رکھے بڑے سے تھال میں چپلی کباب تہہ در تہہ دھرے ہیں۔ اردگرد کھڑے تین چار لوگ نان چٹنی کے ساتھ انہیں مزے سے کھا رہے ہیں۔ مٹی گھٹا سب ساتھ ساتھ اندر جا رہا ہے۔

غریب کو جوانی تو بس ہوا کے کسی خوشگوار جھونکے کی طرح پل بھر کو ہی چھوتی ہے۔ پھر زندگی کو گھسیٹنے والے پہیے اس پر ایسے چپ ڈال دیتے ہیں کہ صورت ہی اجنبی بن کر رہ جاتی ہے۔ سچ تو یہ ہے ناخالص غذائیں اور ماحول کی آلودگی کے باوجود بچپن اور جوانی میں ان کا ایمونٹی سسٹم طاقتور رہتا ہے۔ گذشتہ دو تین ماہ میں بچے تو بچے بڑوں کا بھی کوئی خاص کیس سامنے نہیں آیا۔ کوئی بیمار بھی ہوا تو اسپتال کی بجائے عام ڈاکٹر یا دیسی ٹونے ٹوٹکوں سے خود ہی رُل کھل کر ٹھیک ہوگئے۔ بیمار کیا وہ پہلے نہیں ہوتے تھے؟

اب سُنیے تعلیم کی صورت۔ ماہرِ تعلیم شفقت محمود شعبہ تعلیم کو جدید خطوط پر استوار کر رہے ہیں۔ آن لائن کلاسز، آن لائن امتحان، انٹرنیٹ کے دیگر ذرائع کا استعمال۔ جی تو چاہتا ہے پوچھیں میاں کسِ ٹارگٹ پر ہیں۔ شفقت محمود کی بصیرت کا تو میں عینی شاہد ہوں کہ وہ تو

کُھلے عام کہتا ہے۔کتاب کا زمانہ ختم ہوگیا ہے۔انٹرنیٹ کا دور ہے۔ہم قوم کو اس میں طاق کر دیں گے۔

یکساں نصاب کا نعرہ ہے۔ اس ملک میں یکساں نصاب ۔آپ تعلیم دیتی ہیں۔کتنے نصاب ہیں؟ کہیں کیمبرج،کہیں آکسفورڈ،کہیں امریکن سسٹم،کہیں سیکنڈری بورڈ،کہیں اردو میڈیم اور کہیں مدرسہ سسٹم جس میں آگے بھی بے شمار شاخیں ہیں۔لگتا ہے جیسے کہیں آسمان سے اُتر کر آئے ہیں۔زمینی حقائق جانتے ہی نہیں۔

آن لائن کلاسز،بھڑکیں اور شیخیاں۔کیا کوئی جدید سے جدید طریقہ تدریس کلاس روم،استاد، بچے اور اُن کے درمیان اُس رشتے کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔جو ان تینوں کی مثلث سے جنم لیتا ہے۔اب ذرا آن لائن کلاسوں کی کارکردگی کا بھی جائزہ لے لیں۔ بڑے بچوں کے طریقہ امتحان کی چند مثالیں سُن لیں۔

گروپ میں امتحان۔بچوں نے مضامین بانٹے ہوئے ہیں۔جو بچہ جس مضمون میں اچھا ہے۔اسی کی تیاری۔باقی مضامین گئے بھاڑ میں،ایک دوسرے کی مدد سے پرچے کیے جا رہے ہیں۔کہیں کتابیں کُھلی ہوئی ہیں۔دس بجے صبح پرچہ ہے۔اُستاد کی کوئی مجبوری ہوگئی ہے، لیجئے رات کو نو بجے پیپر ہو رہا ہے۔

ایک ماں کے تین یا چار بچے۔مختلف کلاسیں۔اتنے سارے لیپ ٹاپ،موبائل یا کمپیوٹر نچلے متوسط طبقہ کہاں سے پیدا کرے؟ بڑے لوگوں کے پاس تو چلو یہ سب کچھ ہے۔بڑے سکولوں میں مہنگی فیسیں دینے والوں کے بچے تو پہلے ہی اس طریقے سے کافی مانوس ہوتے ہیں۔نیٹ سے ریسرچ کرنا اُن کی تعلیم اور نصاب کا حصّہ ہے۔مارے تو غریب کے بچے گئے۔

گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھنے والے، جہاں سو کی کلاس،اُوپر سے گذشتہ خادمِ

اعلیٰ نے انگلش میڈیم کر دیا۔ بجائے اس کے کہ مڈل کے بعد درجہ بندی کی جاتی کہ کونسے بچوں کے ہاتھوں میں ٹول پکڑانے ہیں؟ کونسے اعلیٰ تعلیم کے کے لیے موزوں ہیں؟ نتیجہ کیا ہے؟ کلرک بنا رہے ہیں۔ بی اے پاس بابو جو درخواست نہیں لکھ سکتا ہے۔ 10 لاکھ سالانہ پر امیر کا بچہ ڈاکٹر انجنیئر بن رہا ہے۔ نکمانالائق ڈاکٹر جسے خاک پتہ نہیں۔
یہ ہیں ہمارے حکمرانوں کی تعلیمی پالیسیاں۔

☆☆☆

گمنام گاؤں کا آخری مزار اور رؤف کلاسرہ

جہلم کی بہت سی امتیازی خصوصیات ہیں۔تاہم میں سمجھتی ہوں کہ آنے والے وقتوں میں ''بک کارنر،جہلم'' اِس شہر کا لینڈ مارک بننے جا رہا ہے۔خوبصورت کتابوں کی بہترین اور دیدہ زیب اشاعت اور اُن سے متعلق تمام انتظامی معاملات و امور کو حُسن وخوبی سے نمٹانا جناب شاہد حمید کے سعادت مند بیٹوں گگن شاہد اور امر شاہد پر ختم ہے۔ہماری معروف کالم نگار سعدیہ قریشی نے ملک کے نامور صحافی رؤف کلاسرہ کی حالیہ چھپنے والی فرانسیسی ادیب بالزاک (Balzac) کی کتاب کا تذکرہ کیا۔ہم پُرانے لوگ اچھی کتابوں کے تو رسیا ہیں۔فوراً اسے لکھا کہ سعدیہ پبلشر کا لکھو۔کرونا کا خوف بھی اب کم ہوگیا ہے، خریدتی ہوں۔اسے گگن نے بھی کہیں پڑھ لیا۔سعادت مند بچہ فوراً ہی بیچ میں کودا ''ارے نہیں آپا میں بھیج رہا ہوں آپ کو''۔

لیجیے رؤف کلاسرہ کی تین کتابیں اور جناب شکیل عادل زادہ کی سب رنگ کہانیاں سب نے میرے اردگرد بکھر کر کمرے کی فضاؤں کو خوشبوؤں سے بھر دیا۔سب رنگ اور شکیل عادل زادہ سے عشق کی کہانی کسی اگلی قسط پر اٹھاتی ہوں کہ اُس دور کی فینٹسی کو تازہ کرنے کے لیئے تو یادوں کا علیحدہ سے لمبا چوڑا کھاتہ کھولنا ضروری ہے۔سر دست تو رؤف کلاسرہ کے ساتھ باتیں کرنی ہیں۔

بالزاک کے ناول ''تاریک راہوں کے مسافر'' اور'' سنہری آنکھوں والی لڑکی'' کے چند اوراق کی ورق گردانی کے بعد انہیں ایک طرف رکھ دیا کہ پتہ چل رہا تھا ترجمہ کی اٹھان غضب کی ہے۔ یقیناً ناول کی روح، مکالموں کی برجستگی اور مواد کے حُسن کو رؤف نے مزید چار چاند لگا دیئے ہوں گے۔ ہم جیسے ٹاٹ سکولوں میں چھٹی کلاس سے انگریزی شروع کرنے والوں کو قدم قدم پر ملنے والے دھکوں اور احساسِ کمتری کے چرکوں نے یہ بات بہت جلد سمجھا دی تھی کہ انگریزی بولنے اور اس پہ قدرت رکھنے کی صلاحیت زندگی کے ہر شعبے میں اپنا قد کاٹھ بڑھانے کے لیے اشد ضروری ہے، اسی لیئے ہمیں اپنے اہداف حاصل کرنے کے لیے کولہو کے بیل کی طرح اپنی آنکھوں پر محنت و لگن کے کوپے چڑھانے پڑے۔ مشقت کی چکی میں پسنا پڑا۔ رؤف گوکل کا بچہ تھا مگر چار پانچ دہائیاں قبل دور افتادہ گاؤں سے تھا۔ اس کشٹ سے گزر کر ہی یہاں تک پہنچا ہے۔

اب ''گمنام گاؤں کا آخری مزار'' ہاتھوں نے پکڑی۔ فہرست کھولی۔ عنوانات پر نظریں تھیں۔ صفحات کھلتے گئے اور پڑھتی گئی۔ باہر اگر نویں محرم کا سوگ پھیلا ہوا تھا تو میرا اندر اس سے سو گنا زیادہ دکھ اور کرب میں گھر گیا تھا۔ میں جل رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو جیسے درد کی شدید چبھن کے ساتھ باہر آ رہے تھے۔ ہمیشہ سے میری عادت لیٹ کر پڑھنے کی ہے۔ اب کبھی اٹھتی، کبھی بیٹھتی، لگتا تھا جیسے تپتے توے پر بیٹھ گئی ہوں۔ کتاب رکھ دی تھی۔ اوپر والے سے شکووں میں اُلجھ گئی تھی۔

''ہمیں اچھے لیڈر دینے میں تیری اتنی تھڑ دلی۔ کیا تھا۔ کُن کہنے میں تیرے اتنے نخرے۔''

پھر کتاب اٹھائی۔ کہیں ایسے بھی لوگ تھے۔ ایسے بھی بچے تھے جو مدھر سی خوشبوئیں بکھیر رہے تھے۔ انسانیت کی، اعلیٰ اقدار کی، محبت کی۔ کہیں بڑے مانوس سے ادبی

چہرے جن سے ہماری بھی یاد اللہ ہے۔ کہیں گاؤں کے گھر کی یادوں کے نوسٹلجیائی احساسات کی یورش جن میں ہم جیسے بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ خود کو شامل سمجھتے تھے۔ ملتے جلتے مناظر اور حالات کی تصویریں، خوبصورت کتابیں، پیارے دوست ،مرنے والوں کے نوحے۔

ظفر الطاف جیسی عظیم شخصیت کا تذکرہ اُن سے میرا بھرپور کتابی تعارف اقبال دیوان صاحب کے 'سویرا' میں تفصیلی مضمون سے ہوا تھا۔ یہ تو بعد میں جانی تھی کہ ظفر بہت خوبصورت افسانہ نگار ندرت الطاف کے بھائی ہیں۔اور یہ کہ بچپن میں اِس جالندھری گھرانے سے ملنے اپنی نانی کے ساتھ دو تین بار گئی تھی۔

'Kite Runner' نے وہ ساری یادیں دہرائیں جو میں نے اس ناول کو پڑھتے ہوئے محسوس کی تھیں۔افغانستان کی سرزمین کے المیے۔ چرنوبل ایٹمی پاور پلانٹ کا المناک حادثہ، اس کے موجد سخاروف کے پچھتاوں کے قصّے جنہیں میں نے ماسکو کی ایک روسی جرنلسٹ کے گھر بیٹھ کے سُنا تھا۔اعلیٰ ظرف اور تھڑ دلے انسانوں کی داستانیں۔

Papa, what have you done کیسا فکر انگیز کالم ہے۔ بیوی اور بچے اگر یہ سوال پوچھنا شروع کر دیں تو مرد کتنی دیر مزاحمت کرے گا؟ اسرائیل کے ایک چیف انسپکٹر سفسر شک کی بیٹی راشیل یاد آئی تھی۔جس نے کفر قاسم جاتے راستے میں فلسطینیوں کے کیمپوں کو دیکھتے ہوئے اپنے باپ سے کہا تھا۔'' آپ لوگ ظالم ہیں۔آپ لوگوں نے فلسطینیوں سے اُن کے گھر چھین لیئے ہیں۔'' باپ کے انکار اور یہ کہنے پر کہ انہیں خریدا گیا ہے۔لڑکی نے باپ کو جھوٹا کہا اور بتایا کہ اس نے BBC پر ڈاکومینٹری دیکھی ہے۔وہ ہندوستانی بیوی بھی باعثِ مثال ہے جو کہتی ہے۔ہم برتن مانجھ لیں گے تم فیصلہ صحیح کرو۔

ہے نہ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ۔

رؤف کلاسرہ سچا، نڈر اور جی دار صحافی ہے۔اس کے کالموں کا تحریری انداز سیدھا سادہ بیانیہ رنگ میں اپنے تاثر کی اُس گہرائی کو سمیٹے ہوئے ہوتا ہے جو سیدھا ٹھک سے دل میں اترتا ہے۔

ہم جیسے شوئی لوگ جو افسانہ کہانی یا کالم لکھتے ہوئے کتنا سارا وقت صرف آغاز کی پھڑک دار لائن کے انتخاب میں صرف کرتے ہیں۔بس قاری کی نظر پڑھے اور جم جائے۔اسی طرح اختتام زور دار ہو۔اس کے ہاں ایسا کچھ نہیں ہے۔نہ تشبیہیں نہ استعارے نہ لفظوں کی جادوگری۔مگر کیا ہے؟ کہ اختتام پر کہیں آنسوؤں کے پرنالے ہیں اور کہیں بھڑکتی آگ کہ جس کی تپش آپ کو ان کرداروں کے خوبصورت بوتھے نوچ لینے پر اکساتی ہے۔اور یہی ایک کامیاب لکھاری کا کمال ہے۔ جیتے رہو رؤف کیا کمال لکھا ہے۔

☆☆☆

اہلِ بیت سب ہمارے

دمشق میں پہلا دن، پہلا کام، پہلا نشہ مزار اقدس بی بی زینب پر حاضری کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے ہی طلائی گنبدوں کی چمک نے آنکھوں کو خیرہ کیا۔

روضہ مبارک میں داخل ہونے سے قبل ایک آواز کانوں میں گونجی تھی۔

''خدا کی راہوں میں شہادت پانے والے لوگ کبھی فنا نہیں ہوتے۔''

حضرت زینبؑ۔ عفت وعصمت کی تصویر، صبر ورضا کا پیکر، خاتون جنت کی لختِ جگر، علی المرتضیٰؑ کی آنکھوں کا نور، زینبؑ نام آقائے دوجہاں ﷺ کا عطا کردہ تھا۔ بچپن بڑا محرومیوں والا تھا کہ پہلے نانا، بعد میں ماں جیسی ہستی نے جدائی کا غم دے دیا۔ شادی عبداللہ بن جعفر سے ہوئی، جو عم زاد تھا۔ کربلا میں مردانہ وار کردار ادا کیا۔ بھائیوں کے ساتھ بیٹوں کی شہادت کو صبر واستقامت سے برداشت کیا۔

جب یزید کے دربار میں لائی گئیں تو غم کا کوہ گراں دل پر اٹھائے عزم وحوصلے کی تصویر نظر آئی تھیں۔ خطاب ایسا کہ آہنی حوصلہ رکھنے والا بھی کانپ اُٹھے، مگر سوال ہے کہ ہم کیسے مسلمان ہیں کہ اُن کی زندگیوں سے کوئی سبق نہیں لیتے؟ وہ جگہیں جن کی ایک ایک اینٹ بھی باعثِ صد احترام۔ انہی پر فرقہ واریت کے جھگڑے، انہی پر گولہ بارود کی بارش۔

مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی تنظیمی دفاتر نظر آتے ہیں۔ دیواریں مذہبی اور سیاسی شخصیات کی تصویروں سے سجی تھیں۔ جناب حسن نصراللہ میرے سامنے تھے۔ بے

اختیار قدم رک گئے تھے۔ آخر کیوں نہ رُکتے؟ لبنان کی حزب اللہ تحریک کے بانی، اِس تنظیم کے روحِ رواں، ایک باعمل اور صاحب کردار مسلمان جنہیں تعظیم دینا، جنہیں سراہنا، جن کے لئے عقیدت بھرے دو لفظ بولنے بے حد ضروری تھے۔

میرے دل سے تو عقیدتوں اور محبتوں کے سوتے اُبل پڑے تھے۔ 16 جولائی 2006ء کا دن اپنی وحشت ناک خبر کے ساتھ یاد آیا تھا۔ میں نے ٹی وی پر اِس خبر کو اپنے دل پر کسی زوردار گھونسے کی مانند محسوس کیا تھا۔ اُس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ یہ مکّار بڑی طاقتیں اور لاغر، نحیف، خودغرضیوں کے حصار میں گھری مسلم اُمّہ بھی قرونِ اولیٰ کے مجاہدانہ کردار کی ایک جھلک لبنان کی اس حزب اللہ کی صورت میں عنقریب دیکھنے والی ہے۔

16 جولائی کو اسرائیل نے حزب اللہ کے ہاتھوں اپنے دو فوجیوں کے اغوا ہونے کی آڑ لیتے ہوئے لبنان پر حملہ کر دیا تھا۔ طاقتور دنیا کی بھی کیسی ڈھٹائی تھی کہ اسرائیل کی جیلوں میں تقریباً نو ہزار فلسطینی اور لبنانی قید تھے۔ ان کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ یہ حملہ اسرائیل نے امریکہ کی ہلّا شیری سے حزب اللہ اور ایران کو سبق سکھانے کے لئے کیا تھا۔

اسرائیل کا اعلان تھا۔ لبنان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ حزب اللہ اور اس کی قیادت کو کچل دیا جائے گا۔ دونوں ملکوں میں جنگ کوئی 34 دن جاری رہی۔ لبنانی عوام، اُن کے لسانی اور مذہبی گروپ، مسلم غیر مسلم سب حزب اللہ کی پشت پر کھڑے ہو گئے تھے۔

جدید ترین ہتھیاروں سے لیس دنیا کی بہترین فوج کے مقابلے پر صرف ڈھائی ہزار مجاہدین تھے جنہوں نے زیرِ زمین سرنگوں اور ٹھکانوں سے اسرائیل کے اندر جا کر اُسے بتایا کہ حزب اللہ لوہے کے چنے ہیں۔ اسرائیل کے دانت بری طرح ٹوٹ جائیں گے۔

بھاری جانی و مالی نقصان نے اسرائیلی عوام کو حکومت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ جنگ بندی پر مجبور ہوگیا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم ایہود المرت نے اپنی کنیسٹ Knesset سے خطاب کرتے ہوئے قوم سے اِس جنگ میں شکست پر معافی مانگی تھی۔اعتراف کیا تھا کہ انہیں اپنے اِس فعل پر افسوس ہے۔

اُن کا وہ کردار بھی قابل تقلید ہے جب وہ اسرائیل کی وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں شہید ہونے والوں کو دیکھنے جاتے ہیں۔اِن شہیدوں میں اُن کا بیٹا بھی ہے۔مارگیو میں قطار در قطار سفید کفنوں میں لپٹے شہیدوں میں ہر ایک کے پاس پل بھر کے لئے رکتے،اُسے دیکھتے اور آگے بڑھ جاتے۔اپنے لختِ جگر کے لئے بھی ان کے پاس بس ایک لمحہ ہی تھا۔

جنگ بندی کے بعد کا بھی بڑا مثالی کردار تھا۔متاثرہ لوگوں میں امدادی رقوم کی تقسیم،مکانوں کی مرمت اور تعمیرِ نو،خاندانوں کو گزارہ الاؤنس۔مغرب کا میڈیا بھی تعریف کرنے پر مجبور ہوا۔

ایک دنیا امنڈی پڑی تھی۔کشادہ صحن سے آگے داخلی دروازے کا پچی کاری کے کام سے مزین بے حد دیدہ زیب کام جس میں نیلا رنگ نمایاں اور بہت کھلتا ہوا نظروں سے کھُبا جاتا تھا۔بلند و بالا مینار کی بھی اپنی شان تھی۔

شنید ہے کہ اس کا بیشتر کام حکومت ایران کا مرہون منت ہے۔اندر نقرئی اور طلائی کاموں کی جھلکیاں تھیں۔ جالی سے لٹکتے منتوں کے تالے اور رنگین دھجیاں انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی کہانیاں سناتی تھیں۔ یہاں وہاں جالیوں سے لگی صورتیں آنسوؤں سے لبریز آنکھیں،فضاؤں میں گونجتے نوحے سبھی مضطرب کرتے تھے۔

آج لکھتے ہوئے وہ سارے منظر جو بہرحال امن اور عافیت کے حصار میں لپٹے ہوئے تھے۔چار پانچ سال بعد ہی خون خون ہوگئے تھے۔میری سماعتوں میں نیوز ریڈر کی

آواز گونجی ہے۔

حضرت زینبؑ کے مزار کے باہر بم دھماکے۔ساٹھ 60افراد شہید،متعدد زخمی، روضے والی گلی کلّی طور پر تباہ۔آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے میں خود سے بڑبڑائی تھی۔

''میرے معبود! تیرے محبوب کی امت پر کیسا وقت آن پڑا ہے؟ مسلمان ہونا رسوائے زمانہ ہوگیا ہے۔کلمہ گوکلمہ گو کے ہاتھوں قتل ہورہا ہے۔اسلام کے نام لیوا ملکوں کے سربراہ اقتدار کو بچانے کے لئے اغیار کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں۔''

باہر نکلی تو صحن میں سوز خوانی کی محفل نے رنگ بکھیرا ہوا تھا۔سرگودھوی لہجے میں محسن نقوی کا مشہورِ زمانہ مرثیہ کلام۔واہ واہ کہوں کہ آہ آہ کہوں۔کیا بات تھی۔آوازوں کا سوز وگداز میں ڈوبا بلند آہنگ پر یوں جیسی صورت والی ایرانی خواتین کے ایک جمگھٹے نے اِن عورتوں کے گرد گویا حصار سا باندھا ہوا تھا۔سمجھ نہ آنے کے باوجود وہ جوش وجذبے کی پوری لگن سے اس محفل میں شریک تھیں۔

کیا شاعر تھا محسن نقوی بھی۔محبت کا سفیر۔

اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے مسجدوں کا پتہ چلا۔روضہ مبارک کے دائیں بائیں دو مسجدیں۔ایک شیعہ اور دوسری سُنی۔

''اے اللہ ہمیں تو یہ عقیدوں اور مسلکوں کے فتنے اور چکر لے بیٹھے۔کوئی پوچھے کہ بھلا ایک ہی جگہ میں اپنے اپنے طریق سے نماز پڑھنے میں کیا قباحت ہے یا کوئی ممانعت ہے؟ کیوں اتنے پراگوں میں اِس جندڑی کو ڈال رکھا ہے؟ تو دونوں مسجدوں میں دو دو نفل پڑھ آتی ہوں۔دیدار بھی ہوجائیگا۔

مگر اب بیچ میں اِس ظالم وقت کا کیا کروں؟ ابھی چند دن پہلے میں نے جو تصویریں دیکھی ہیں،انہوں نے مجھے کیا کچھ نہیں یاد دلایا۔میرے تصور کی آنکھ نے اُن گول

مٹول سرخ وسفید بچوں کو دیکھا۔حسین چہروں والی طرحدار دوشیزائیں مجھے یاد آئی تھیں۔

شام کے سراقب قصبے کے رہنے والے شہریوں نے کیمیائی ہتھیاروں سے حملے کا جس طرح سامنا کیا ہے وہ انسانیت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔معصوم بچے اور عورتیں یوں لگتا تھا جیسے شادی کی کسی پرمسرت سی تقریب کے بعد تھک کر سوئے ہوں۔بے ترتیب سے ،ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے ،زندگی کی دوڑیوں سے کٹے ہوئے۔

اللہ تیس ہزار آبادی والے قصبے پر مائع کلورین کے کنستر گرائے گئے۔یہ ہیومن رائٹس کی قراردایں، یہ باراک اوباما کے بیان، روس اور امریکہ کے مابین سمجھوتے۔جہاں مفادات کا ٹکراؤ نہ ہو وہاں ایسے ہی سمجھوتے ہیں۔کہاں کی انسانیت؟ کہاں کے اصول اور ضابطے؟ بس بشار کو تھوڑی سی ڈانٹ ڈپٹ کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیے۔یاد رکھو کیمیائی ہتھیار وہ سرخ لکیر ہے جس کا استعمال عالمی برادری برداشت نہیں کرے گی۔

اوباما کہتا ہے۔

واہ کیا کہنے اِس عالمی برادری کے......

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

☆☆☆

فلسطینیوں کے گھائل کرتے لفظ

کیسا ستم ہے یہ بھی کہ جب غیروں سے کچھ دلاسا اوراشک شوئی کی امید پیدا ہوئی تو اپنوں نے تیر برسانے شروع کردیئے۔یہ وقت بھی آیا کہ یورپی یونین اسرائیل کو تنبیہ کرتی ہے۔رک جاؤ بس اب بہت ہوگیا۔بہتیرا ہڑپ کر بیٹھے ہو فلسطین کو،مزید آگے بڑھو گے تو اچھا نہ ہوگا۔مگر یہ اپنے؟ متحدہ عرب امارات اوراس کے حالی حوالی سب، کچھ اندر خانے ملے ہوئے اور کچھ اب کھل کھلا کر سامنے آگئے ہیں۔سفارتی تعلقات قائم۔معاہدے کا شور وغوغا برپا۔چاروں کھونٹ دھوم۔ہمارے ہاں بھی بہتیروں کو ہوشیاری کہ بس اب ہمیں بھی جھپی ڈالنے کی ضرورت ہے۔بندہ کیا کہے؟ ڈال لینا پر ابھی وقت کی نزاکت کا تو کچھ خیال کرو۔اردو ادب کی مایہ ناز لکھاری الطاف فاطمہ بہت یاد آرہی ہیں جو فلسطین کے غم میں اس طرح نڈھال رہتی تھیں جیسے خود فلسطینی ہوں۔وہ کہتی تھیں ہیں فلسطین کی تحریکِ آزادی میں لفظ اتنے ہی اہم ہیں جتنی تلواریں۔دنیا کے اس اتنے بڑے المیے نے انسانی احساسات کو درد وکرب کے جن متنوع تجربات سے گزارا،ان کے اظہار کی صورتوں نے

عربی ادب کووسعت اور منفرد کیا۔

فلسطینی شاعرہ ،مصنفہ اور رائٹس ایکٹیوسٹ ڈاکٹر حنان داوود عشراوی اگر ایک طرف اسرائیل کولعن طعن کرتی ہے تو دوسری طرف امریکہ کو بھی کوستی ہے۔اس کی پُکار کیسے کلیجہ چیر جاتی ہے۔ذرا سُنیں تو......

خدانہ کرے تمہیں کبھی اپنے ملک کے چھن جانے کا کرب سہنا پڑے
خدا نہ کرے تمہیں کبھی کسی قابض کی نظربندی میں رہنا پڑے
خدا نہ کرے تمہیں اپنا گھر مسمار ہوتے دیکھنا پڑے
خدا نہ کرے تمہیں اپنے ہی دوستوں کے ہاتھوں بکنا پڑے

وہ کہتی ہے......

''نیلسن منڈیلا نے کہا تھا دنیا کی آزادی فلسطین کی آزادی کے بغیر بے معنی ہے۔''

وہ لکھتی ہے۔اقوام عالم کی بے حسی اور سب سے بڑھ کر مسلم امّہ کا یہ تغافلانہ اورظالمانہ رویہ ہمارے باپ دادا اور ہم زمانوں سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ہم نے آنکھیں کھولیں اورظلم وستم کا ہی راج دیکھا۔امن تو فلسطین کی لغت سے غائب ہو گیاہے۔پندرہ سال کی عمر سے شعر کہنے شروع کردیئے تھے کہ اندر کے دُکھ کو اظہار کی ضرورت تھی۔نوعمری میں ہی میرالکھنا میرا شعر کہنا گویا میرے اندر کے دُکھوں کا اظہار تھا کہ لفظوں کی طاقت تلوار سے کم نہیں۔فلسطین کی تحریک آزادی کو اِن لفظی تلواروں کی بہت ضرورت ہے۔غاصب دنیااِن تلواروں کوکند کرنا چاہتی ہے۔مگرایسانہیں ہوگا۔

فلسطینی النکبہ (جڑسے اکھڑ جانے کا عمل) کوبھی اب نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔اِس سانحے نے جوادب،جوشاعری تخلیق کی اس میں دو رنگ اُبھرے۔ ایک شکست خوردہ اور بے خانماں قوم کے افراد کا وہ دکھ،وہ کرب جوان کی اپنی زمین سے

کٹ جانے اور اجنبی جگہوں پر بکھراؤ کی صورت میں تھا اُس کا اظہار ہوا۔ دوسرے اپنی ہی زمین پر محکوم بن جانے، ظلم وستم کا شکار بننے اور مسلم امّہ کی بے رُخی کے دُکھ کو سہنے کی صورت ہوا۔

ایسے میں جو کچھ بھی لکھا گیا نثر میں یا شاعری میں یا آرٹ کی صورت کاغذوں پر بکھرا وہ سب فلسطین کے گرد ہی گھوما۔

غسان کنفانی کا ناول **رجال فی الشمس** و رایمل حبیبی کا **الو اقعتہ الغریبیہ فی اختفا سعید ابی سخس المتشائل**۔ دونوں ناول بہت اہم سمجھے گئے ہیں کہ کنفانی جو بحیرہ روم کے ساحلی شہر عکّہ کا رہنے والا تھا صیہونیوں کے قبضے کے بعد جلاوطنی اس کا مقدر بنی۔ کبھی لبنان کے کسی چھوٹے سے گاؤں، کبھی دمشق کی کسی کچی آبادی، کبھی کویت دربدر دھکے کھاتے بیماری سے مقابلہ کرتے کہیں پینسل، کہیں برش، کہیں قلم، کہیں ہتھیار سے اپنے اندر کے دکھ کا اظہار کرتا رہا۔

فضل النجیب، ہماری الطاف آپا جن سے بہت محبت کرتی تھیں، جو کئی بار پاکستان بھی آئے تھے، نے کنفانی کے لیے ہی تو کہا تھا۔ غسان کنفانی نے فلسطین کی کہانی لکھی اور پھر اِس کہانی نے اُسے لکھ ڈالا کہ وہ زندگی اور فلسطین کی محبت میں لڑتے لڑتے اسرائیلی ایجنٹوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

کنفانی کا یہ ناول ایک ایسا شاہکار ہے جس کا انجام بندے کو زار زار رُلا دیتا ہے۔ ایمل حبیبی کی تحریر طنز و مزاح کا رنگ لیئے اسرائیل کے منہ پر جو تھپڑ رسید کرتی ہے۔ وہ بلاشبہ سراہنے کے قابل ہے۔

گلیلی کے محمد علی طلحہ ہوں یا ہیبرون کے ابوشاور، یحیٰی یخلف، ذکی دوریش یا ممتاز افسانہ نگار لیانہ بدر اور سحر خلیفہ اسی طرح کے بے شمار نام جن کی کہانیوں، ناولوں میں

ہجرت کے دُکھ، کیمپوں کی زندگی اور ظلم وستم کے تجربات رقم ہیں۔ سحر خلیفہ پانچ ناول لکھ چکی ہیں جن کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوا ہے۔ سحر فلسطینی عورتوں کو بہت دلیر اور پُر اعتماد دیکھنے کی خواہش مند ہے۔ اُس کے خیال میں فلسطینی عورت کو بہت فعال ہونے کی ضرورت ہے۔

فلسطین کے شعرا کی شاعری بھی بلاشبہ مزاحمتی ادب کی ایک قابل رشک مثال ہے اور فلسطینی اس پر نازاں بھی ہیں۔

توفیق زیاد جو فلسطینی شاعری میں سنگِ میل کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ جدوجہد اور مزاحمت سے بھری ہوئی اُس کی شاعری جسے لوگ لوک گیتوں کی طرح گاتے ہیں۔ ذرا دیکھیئے تو وہ کس طرح اُس عزم صمیم کا اظہار کرتے ہیں۔

لدا میں ......راملہ میں...... گلیلی میں ......ہم یہیں رہیں گے
تمہارے سینے پر دھری دیوار کی طرح ...... تمہارے حلق میں
ٹوٹے شیشے کی کرچ کی طرح ......ناگ پھنی کے کانٹے کی طرح
تمہاری آنکھ میں...... آندھیوں کی دھول کی طرح
اپنے بچوں میں انقلاب کا خمیر اٹھائیں گے جیسے آٹے میں خمیر اٹھتا ہے

سمیع القاسم بھی مزاحمتی شاعری کا ایک بڑا نام ہے......

جب میرے بچے پیدا ہوتے ہیں...... خوف کی لرزیدگی میں اُن کو نہلایا جاتا ہے
کہ معلوم ہے ......بہت سے کتوں کی اُن پر نظریں لگی ہوئی ہیں
جب میرے بچے پیدا ہوتے ہیں ......ان کے ننھے کفن ان کا انتظار کرتے نظر آتے ہیں

اپنی ایک اور نظم میں وہ کیسے اپنے اور لاکھوں فلسطینیوں کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے......

اگرتم میری آنکھوں کی تمام قندیلیں بجھا ڈالو...... میرے بچوں کے چہروں سے مسکراہٹ اکھاڑ پھینکو

میں مفاہمت نہیں کروں گا...... میں لڑوں گا۔آخری دم تک لڑوں گا

عکّہ اوریروشلم میں رہنے والی سلمٰی الخضر الجیوی کیا دل تڑپانے والا لکھتی ہے

میں جانتی ہوں کہ وہ مر گئے تا کہ یہ وطن زندہ رہ سکے

ہمارا وطن مقتولوں کا وطن خون میں بھیگا ہوا کھیت

میں جانتی ہوں آزادی سُرخ ہے اور یہ اسکی قیمت ہے

محمود درویش فلسطین کی پہچان اُس کا عنوان ہیں۔

تمہاری آنکھیں فلسطینی ہیں تمہارا نام فلسطینی

تمہارے خواب،خیال وتمہارا بدن،تمہارے پیر

تم حیات میں بھی فلسطینی ہو موت میں بھی فلسطینی رہو گی

اب اگر حدیل وحدان نے کہا کہ محمود درویش کی نظمیں اسرائیلی حکومت کیلئے خطرہ

ہیں اور خود اسرائیلی پارلیمنٹ میں اُس کی شہرہ آفاق نظم شناختی کارڈ پر بحث ہوئی۔

ذرا دیکھیے شناختی کارڈ میں شاعر نے کیا کہا ہے۔

لکھ لو...... میں عرب ہوں...... اور میرے شناختی کارڈ کا نمبر

پچاس ہزار ہے...... میرے آٹھ بچے ہیں...... اور نواں...... وہ گرما کے شباب میں تولّد ہونے والا ہے۔

کیا تم جل بھن تو نہیں گئے۔

آگے دیکھیے ......

صفحہ اول کے عین اوپر لکھ لو...... میں انسانوں سے نفرت نہیں کرتا

اور نہ میں اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہوں...... تاہم اگر میرا پیٹ خالی ہو

تو غاصب کا گوشت میری غذا بنے گا...... بچو میری بھوک سے بچو۔

اور میرے غصے سے بھی

موشے بینا روچ مراکش کا یہودی جس کے آبا واجداد سپین سے نکالے جانے کے بعد مراکش میں پناہ گزین ہوئے۔اس کے احساسات و جذبات کسی طرح بھی فلسطینیوں سے مختلف نہیں۔اُس کی نظم ''ہم اپنے مردے گنتے ہیں'' نے اسرائیل میں بہت شور مچایا تھا۔انتہاپسندوں کی طرف سے اُسے دھمکیاں ملیں۔مگر وہ وہی کر رہا ہے جسے وہ مناسب سمجھتا ہے۔

فلسطین کا ہر شاعر، ہر افسانہ نگار خواہ عورت ہو یا مرد ہو۔مقبوضہ یروشلم میں ہو،غزہ یا مغربی کنارے میں یا کسی بیرون ملک۔اُس کے اندر سے فلسطین نہیں نکلتا۔وہ تو سرتا پا فلسطینی ہے۔اُسکی ہر تحریر اسی فلسطین کے گرد گھومتی ہے۔

فلسطین کے سانحے سے انسانی حسیات جس جس انداز میں متاثر ہوئیں۔اُس درد و کرب نے متنوع صورتوں میں عربی ادب میں راہ پائی اور اُسے بے پایاں وسعت دی۔قانون قدرت ہے ہر رات کی سحر ہے گو یہ رات بہت طویل اور رنج وغم سے لبریز ہوگئی ہے مگر اسے طلوع تو ہونا ہے۔اور فلسطینیوں کی بھی سحر طلوع ہوگی۔انشاءاللہ

اور جب وہ وقت آئے گا عربی ادب کا دامن پھر نئے رنگوں سے بھرے گا۔

☆☆☆

بورس، اوسپ مینڈل اور سٹالن کی ہجو

انتونینا روسی جرنلسٹ پاکستانی نژاد انجینئر منصور کی بیوی ہے۔ ماسکو جاتے ہوئے منصور مجھے جہاز میں ملا تھا۔ دونوں میاں بیوی سے دوستی ہوگئی۔ انتونینا پاکستان کو اپنا دوسرا گھر مانتے ہوئے اس کے کلچر اور لوگوں سے لے کر اس کی سیاست کے اسرار و رموز سے بھی آگہی رکھتی ہے۔ اکثر اِس سے گپ شپ رہتی ہے۔ ایسی ہی ایک بات چیت کے دوران بورس پاسترنک جسے میں ہزار بارہ سولفظوں میں پھنسانے کی سرتوڑ کوشش میں تھی، زیرِ بحث آ گیا۔ شرم کرو کچھ۔ ملامتی کوڑا لہرایا۔ روسی ادب کا دیو اور تمہارے گنوے منوے لفظوں میں قید ہو جائے۔ ننگی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا؟ مزہ آیا پھٹکار کھا کر۔ تو پھر پُوچھا۔ قہقہہ اُچھلا، ٹکڑے کردو اس کے۔ عشق، یاریاں اور شادیاں، فن اور اس کی جہتیں، اوسپ مینڈل کے ساتھ سٹالن کی Epigram کا واقعہ۔ دونوں ملکوں کے موازنوں میں ہنستے ہوئے جیسے اُس نے راہ دکھائی۔ اپنے ملک کے سیاسی حالات پر نظر ڈالو۔ انقلاب سے اُمیدیں وابستہ کرنے والوں، سچ اور کھرا لکھنے والوں پر کیا بیت رہی ہے؟ پون صدی قبل کے روس کو سوچو۔ بورس پاسترنک، اوسپ مینڈل اور سٹالن کو یاد کرو۔ گو بندے اٹھوانے اور قتل کروانے کے سلسلے خیر سے ابھی بھی تھوڑے بہت جاری و ساری ہیں۔ سو انتونینا کے ہدایت نامے پر عمل کر رہی ہوں۔

بورس چوبیس برس کا تھا جب My sister life چھپی۔ یہ 1922 کا زمانہ تھا۔ حالات بہت مشکل اور وقت نازک تھا۔ یہ روسی سوسائٹی میں بہت انقلابی ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ بیسیویں صدی کی شاعری پر بہترین کتابوں میں سے ایک سمجھی گئی۔

اِس مجموعے کی تین نظموں Rupture, The racing star اور Reissner انقلاب سے متعلق امیدوں، خوابوں، کہیں اُن کے ٹوٹنے اور کہیں اُن کے جڑنے، کہیں مایوسی اور کہیں امید کے درمیان سفر کرتے احساسات کی ترجمان تھیں۔

دراصل بورس نظام کے تہہ وبالا ہونے اور مار دھاڑ سے مایوس ہوا تھا۔ اُسے تو امید تھی کہ انقلاب عام آدمی کی زندگی میں تبدیلی لائے گا۔ اُن خوابوں، اُن امیدوں کو کہیں تعبیر ملے گی جو زمانوں سے انہوں نے دیکھے تھے۔ آنے والے دنوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ غلط باتوں پر سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔

اپنی بہن جوزیفائن کو لکھتے ہوئے اُس نے اپنے دکھ کا اظہار کیا۔

''میں ولادی میر مایاکووسکائے اور نکولائی سے تعلقات ختم کر رہا ہوں کہ انہوں نے ادب اور آرٹ کو کیمونسٹ پارٹی کی خواہشات اور ضروریات کے تابع کر دیا ہے۔ میرے لیئے اُن کی دوستی کو خیر باد کہنا کسقدر دشوار اور تکلیف دہ ہے مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ میں بہت مجبور ہوں۔''

اب ذرا سٹالن کی ہجو کا بڑا دلچسپ قصہ بھی سُن لیں۔

یوں تو 1929 سے ہی سٹالن cpsu کا مستند لیڈر تسلیم کر لیا گیا تھا، مگر آہستہ آہستہ بورس پارٹی اور سٹالن سے مزید متنفر ہو گیا تھا۔ انہی دنوں اوسپ مینڈل نے سٹالن پر سخت طنزیہ نظم لکھی۔ بڑے رازدرانہ انداز میں یہ خبر دوستوں تک پہنچائی گئی۔ سُننے کے لیئے قابل بھروسہ دوست اکٹھے ہوئے۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے سبھی بند کیے گئے حتیٰ کہ

روشن دان بھی۔مینڈل نے مدھم سی آواز میں پڑھنا شروع کیا۔......

ہم زندہ ضرور ہیں مگر　　اُس دھرتی بارے سوچتے نہیں
جہاں ہم رہ رہے ہیں　　کچھ دس قدم پرے یا نزدیک
تم سن ہی نہیں سکتے ہو　　جو ہم کہتے ہیں
لیکن اگر لوگ موقع پر بات کریں　　تو وہ کریملن کا کیشیئن کے بارے ہی ہوگی
اس کی موٹی انگلیاں بھدّی ہیں　　اور پھسنے والی مچھلی کی طرح پلی ہوئی
موزوں لفظوں کی تلاش اتنی مشکل　　جتنے بھاری وزن دار پتھر
اُس کی کاکروچ جیسی مونچھیں بہت ڈراؤنی ہیں
اسکے گرداگرد چھوٹی اور موٹی گردنوں والے　　خوشامدی ٹٹو اور پٹھو ہیں
یہی اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں　　کچھ تو سیٹیاں بجاتے
کچھ میاؤں میاؤں کرتے　　اور کچھ سوں سوں کرتے ہیں
وہ اکیلا　　گرجتا، دخل در معقولات کرتا اور کش لگاتا
اپنے ہی اصولوں کو توڑتا　　حکومتی فرمانوں کو سموں تلے روندتا
اپنے جبڑوں، اپنے ماتھے اپنی آنکھوں اور بھنوؤں میں　　ہر قتل پر خوش ہوتا

نظم سننے کے بعد بورس نے بے اختیار کہا۔

''مینڈل تم نے یہ کیا لکھ ڈالا؟ ہمارے جذبات کا اتنا حقیقی ترجمان۔'' پھر وہ خوف سے لبریز آواز میں بولا۔

''مینڈل تم سمجھو تم نے کچھ نہیں سنایا اور ہم نے کچھ نہیں سُنا۔تم جانتے ہو بہت ظالمانہ چیزیں ہو رہی ہیں۔لوگوں کو ان کا جرم بتائے بغیر اٹھا لیا جاتا ہے۔دیکھو دیواروں

کے بھی کان ہوتے ہیں۔اور کچھ پتہ نہیں کب کیا کیا کہانیاں بن جائیں؟بس سمجھوتم نے کچھ نہیں سُنایا۔میری جان کچھ نہیں۔''

بورس بھول گیا تھا کہ شاعری خوشبو کی طرح ہوتی ہے جسے دیواروں ،بند دروازوں میں قید نہیں کیا جاسکتا۔یہ بنریرے کوٹھے الانگتی پھلانگتی ہواؤں کے دوش پر اڑتی کوچہ کوچہ قریہ قریہ سفر کرتی کریملن پہنچ گئی تھی۔

مینڈل کو گرفتار کرلیا گیا۔بورس سخت پریشان۔ایک گرفتاری دوسرے یہ ڈر کہ کہیں اُس پر بے وفائی کا الزام نہ لگ جائے۔سارے شہر میں وہ بھاگا بھاگا پھرا۔اپنے بارے میں وضاحتیں دیتا ہوا کہ اُس نے تو کوئی بات نہیں کی تھی۔

ایسے ہی صبر آزما دنوں میں اُس کے اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔کسی نے کہا۔

''کامریڈ سٹالن تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔''پاسترنک تو گُنگ سا ہو گیا ایسی صورت کا سامنا تو اس کے کہیں گمان تک میں نہ تھا۔ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

ایک آواز ماؤتھ پیس میں سے اُبھری۔سٹالن کی آواز،ایک جابر اور ظالم حکمران کی آواز۔رعب اور کرختگی سے بھری ہوئی آواز۔

بورس کی آواز میں گھبراہٹ،ہکلاہٹ اور احمقانہ پن تھا۔سوال ہوا تھا۔وہ مینڈل کے ساتھ کتنی ذہنی مطابقت رکھتا ہے۔کانوں کی سنسناہٹ،زبان کی ہکلاہٹ اور دل کی دھڑکنوں کی اُتھل پتھل میں اس نے کہا کہ اس کے اور مینڈل کے خیالات میں بہت اختلاف ہے اور پھر ایسا ثابت کرنے میں اُس نے کتنی ہی الٹی سیدھی باتیں کیں جنہیں کرنا گویا وقت ضائع کرنا تھا۔سٹالن نے اُس سے ادبی حلقوں میں مینڈل کی گرفتاری کا ردِعمل جاننا چاہا اور یہ کہ اُس کی رائے اس بارے میں کیا ہے؟

بورس کب اپنے حواسوں میں تھا۔فوراً ہی انکار کرتے ہوئے بولا''اب ماسکو میں

ایسے سٹڈی سرکلز کہاں رہے ہیں؟ مدت ہوگئی مجھے کسی ادبی محفل میں گئے ہوئے۔'' سٹالن نے ایک تمسخرانہ انداز میں یہ کہتے ہوئے کہ وہ ایک کامریڈ سے بات نہیں کرسکتا، فون بند کردیا۔

بہت سالوں بعد اپنے اُس وقت کے جذبات واحساسات پر اُس نے لکھا کہ اُس وقت اُسے کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ دیر بعد جب اُس کے اوسان بحال ہوئے، وہ شرمندگی اور دکھ کے پاتال میں گر گیا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے؟ اپنی بزدلی پر پیچ و تاب کھاتے ہوئے۔ اُس نے دوبارہ رابطے کی کوشش کی کہ وہ اُسے بتائے کہ وہ بہت غلطیاں اور زیادتیاں کررہا ہے۔ مگر کریملن سے ایک ہی جواب تھا۔

''کامریڈ سٹالن بہت مصروف ہیں۔''

حقیقیت تو یہ تھی کہ اس کا پچھتاوہ ختم ہونے میں نہ آرہا تھا۔ بعد میں اُس نے لمبا چوڑا خط بھی سٹالن کو لکھا۔ اُسے ہمیشہ اس بات کا تاسف رہا کہ وہ صورت حال کو ہینڈل کرنے میں بہت بُری طرح ناکام رہا۔

☆☆☆

اردگان کے لیے مسلم امہ کا لیڈر بننے کے امکانات

اِن دنوں اردوان کی انتظامیہ اعتراضات، سوالات اور ڈھیر سارے خدشات کی زد میں ہے۔ عالمی اور داخلی دونوں سطح پر محاذ کھل گئے ہیں۔ معترضین کا پہلا اعتراض ڈیڈ کے جعلی ہونے پر ہے۔ دوسرا مذہبی امور کے سربراہ ڈاکٹر علی اربباش کا ایا صوفیہ کے منتظم اعلیٰ (Pastors) اور سلطان محمد فاتح کے درمیان ہونے والی ڈیڈ کی دستاویزات ٹی وی پر دکھانے، ایا صوفیہ میں خطبہ دینے اور سلطان محمد فاتح سے منسوب یہ بیان کہ ایا صوفیہ کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنے والا مطعون، ہاتھ میں عصا کی جگہ تلوار کو تھامنا اور اس کی نمائش کرتی حکومت کے اپنے عزائم اور اس کے آئندہ ایجنڈے کا گویا شوآف ہے۔ جھنڈے پر تین ہلال کی نمائش نے تین براعظموں پر ترکوں کی حکومت کا اظہار کرتے ہوئے ڈھکے چھپے لفظوں میں گویا عرب دنیا کو ایک پیغام بھی دیا کہ اغیار کی عیاریوں کے جال میں پھنسی عرب دنیا عرب قومیت کے نعرے لگا لگا کر پون صدی میں اس کے مزے تو لوٹ ہی چکی ہے۔ اب اردوان کی خلافت کی چھتری تلے پناہ لینے میں کیا حرج ہے؟ خلامت عثمانیہ کی عظمتوں کو احیاء کی ضرورت ہے شاید۔

اپنے حسابوں تھوڑا سا تجزیہ پیش ہے۔

ڈیڈ جعلی ہے یا اصلی۔رقم ذاتی جیب سے دی گئی یا خزانے سے۔ہمارے سامنے اِس ضمن میں دو مظبوط مثالیں بمعہ ثبوت کے موجود ہیں۔دمشق کی امیہ مسجد۔تین ہزار سال پرانی جائے عبادت۔پہلے رومیوں کی، پھر یونانیوں کی اور پھر آرمینیا ئیوں کی۔ان کے حداد دیوتا کا نام تو ابھی بھی چل رہا ہے۔پھر عیسائیوں کا پگان بنا۔مسلمان فاتح بنے تو وہ بھلا اس نیکی کے کام میں کیوں پیچھے رہتے؟

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک نے اس پر عظیم الشان مسجد بنانے کا سوچا۔ہاں یہ ضرور ہوا کہ اس نے عیسائی کیمونٹی سے مذاکرات کیےاور بار بار کیے۔آغاز میں رضامندی نہ تھی۔پھر ڈھیر سارا پیسہ، نئے چرچ کی تعمیر اور شہر میں بکھرے دیگر چرچوں کی مرمت کرنے کے عوض سودا ہوا۔

اب قرطبہ مسجد کی جانب آیئے۔

قرطبہ جب موروں کے قدموں میں سرنگوں ہوا تو عبادت گاہ موجود تھی اور تاریخ بھی کچھ اوپر والی ہی تھی۔پہلے گوتھوں کا معبد، رومی آئے تو رومیوں کا ٹمپل، عیسائی آئے تو سینٹ ونسٹ چرچ اور جب مسلمان آئے تو مسجد بنی۔

اب فاتح اقوام کی نفسیات پڑھ لیں کہ ہر فاتح قوم کی رال اسی پر ٹپکی۔یقیناً فاتح قوم کی نفسیات میں کہیں مفتوح قوم کی اہم چیزوں پر اپنے نقوش ثبت کرنے کی خواہش کارفرہوتی ہے۔ہاں بابری مسجد کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔وہاں کوئی مندر نہیں تھا۔اس ضمن کا بڑا حوالہ ہندوستان کی شہرہ آفاق تاریخ دان رومیلا تھاپر کا ہے۔جس کے مطالعے کا میدان ہی ہندوستان کی قدیم تاریخ ہے۔یہاں وہی بات جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون۔انصاف کہاں ہے؟

ہاں یہاں مسلمان حکمرانوں بارے تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عبدالرحمٰن اول نے

بھی ولید بن عبدالمالک کی طرح اخلاقی اقدار کی پاسداری کی اور کہیں زور زبردستی نہیں ہوئی۔خریدنے کی کوشش ہوئی۔ پہلے انکار ہوا پھر نصف پر آمادگی اور بعد ازاں منہ مانگے داموں پر سودا ہوا۔قرطبہ کی مکمل فتح ہونے پر خستہ حال گرجوں کی مرمت اور تعمیر نو کی بھی اجازت دی گئی۔

اب غرناطہ،قرطبہ اور اشبیلیہ کے سقوط پر مسلمانوں اور مسلمانوں کی مسجدوں کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہودیوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو یاد ہی ہوگا کہ جیسے وہ نکالے گئے اور پناہ کہاں ملی؟ یہ بھی انہیں معلوم ہے۔بھول جائیں تو اور بات ہے۔

تو بھئی اب ایا صوفیہ اگر مسجد بنی تو کیا تعجب کی بات تھی۔کہ اِس شہر کی فتح کی نوید تو زمانوں پہلے پیغمبر انسانیتﷺ نے دی تھی اور سلطان محمد فاتح نے ادائیگی کی تھی تو اسے جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں۔اسے میوزیم تو بنانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

ہاں ذرا اعتراض کرنے والی آرتھوڈوکس کیتھولک دنیا کے طرزعمل کی ایک چھوٹی سی جھلک بھی دیکھ لیں۔

شاعر مشرق کا قرطبہ سے عشق بڑا ابلا خیز تھا۔انہوں نے جب قرطبہ جانے اور مسجد میں نماز پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو حکومت برطانیہ کو باقاعدہ سپین کی حکومت کو راضی کرنا پڑا۔قرطبہ کی مسجد میں سجدہ دینا جرم سمجھا جاتا اور اس کی کسی طور اجازت نہیں تھی۔ دوسری مثال 21 نومبر 1991 کی ہے جب یہاں ساڑھے سات سو سال بعد مسلم تقریب کا انعقاد ہوا اور کن جتنوں سے ہوا۔یوروپ میں بسنے والے عاشقان اقبال نے پوری دنیا سے اقبال کے عاشق اکٹھے کر لیے تھے۔اس فاونڈیشن کے منتظم اعلیٰ فرانسیسی ڈاکٹر لامان تھے۔انہوں نے سپین کے بشپ سے درخواست کی۔انکار ہوگیا۔ویٹی کن سٹی جا کر پوپ پال سے اجازت لی اور تب یہاں تقریب سجی۔

اردگان کے سامنے اب بڑے چیلنجز ہیں۔ترکی کی اکثریت سیکولرازم کی حامی ہے۔ترکی کی فوج کو اقتدار کی لت لگی ہوئی ہے۔15 جولائی 2016 کی فوجی بغاوت اس کے سامنے ہے۔کہہ لیجیے کہ صدی کی تاریخ نے ترکی کو دو عظیم لیڈر دیئے۔اتاترک اور طیب اردوان۔دونوں دو انتہاؤں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ایک سیکولر اور دوسرا بنیاد پرست۔یہ بات اردوان جیسے زیرک سیاست دان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی پذیرائی ایک زبردست لیڈر کے طور پر صرف ایک اعلیٰ منتظم اور اقتصادی ترقی کی وجہ سے ہوئی۔وہ اچھا مسلمان ہے۔اس کی بیوی حجاب پہنتی ہے۔عام ترکوں کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔

☆☆☆

ہمارے وقتوں کی عیدیں

’’ہمارے وقتوں کی عیدیں چھوٹی عید جو ہم بچوں کی میٹھی عید، بڑی عید نمکین عید پھر محرم اور رمضان کی رونقیں بھئی کیا بات تھی اُن کی۔ وائے افسوس کہ اِن خوبصورت تہواروں سے وابستہ ثقافتی قدروں پر جھاڑو پھر گیا ہے۔ تب لوگوں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے مگر ایک دوسرے کے لئے خلوص اور محبتیں تھیں۔ پڑوسی رشتے داروں سے بڑھ کر سمجھے جاتے تھے۔ دکھ سکھ اور خوشیاں سانجھی تھیں۔ روزے رکھنا ضروری اور روزے کا احترام حد سے زیادہ۔

رمضان کے آخری عشرے میں جہاں گھروں میں سفیدیاں اور پڑچھتیوں پر سجے برتنوں کی مانجھ منجھائی شروع ہوتی وہیں گھروں کی چھتوں پر سویاں بٹنے کے عمل کا بھی آغاز ہوتا۔ سارا خاندان اِس کام میں جُت جاتا۔ گھوڑی کے ہینڈل کو بچے زور لگا لگا کر گھماتے، لمبی سوئیاں رسیوں پر ڈالی جاتیں۔ سوکھنے پر بھنائی ہوتی۔ دودھ شکر کے آمیزے میں کیا لُطف دیتیں۔ نئے کپڑے چھوٹی اور بڑی عید پر ہی نصیب ہوتے۔ اسی لئے ان کی بڑی وقعت تھی۔

میں بڑی آپ پھدری سی لڑکی تھی۔زمانہ بڑا اچھا تھا۔گنوے منوے (تھوڑے سے) پیسے ہوتے۔روز مرہ کی ضروریات روزانہ کے سودا سلف لانے کے ساتھ جڑی ہوتیں۔کبھی پاؤ بھر دودھ، پاؤ بھر دہی، آدھ پاؤ گوشت، اتنی ہی سبزی اور دال کا آنا ضروری ہوتا۔ہم دو بچے خوشحال گھرانے کی سچی تصویر تھے۔میں، میرا بھائی اور میرے چھوٹے چچا جو دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔پاس ہی بازار تھا۔سودا لینے بالعموم میں ہی جایا کرتی تھی۔دوشوق پورے ہوتے تھے۔ایک تو چُنگا۔ہمارے بعض دوستوں کو شاید یہ سمجھ نہ آئے۔ دراصل کریانے کی دکان پر ہمارے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر دوکان دار کا تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے، میٹھی پُھلیوں یا کسی سنگترے کی گولی کا رکھ دینا ہوتا تھا۔اُف کوئی اس ہفت اقلیم ملنے کی خوشی کا تصور نہیں کرسکتا ہے۔دودھ دہی پر یہ چُنگا تھوڑی سی بالائی کی صورت ہوتا۔میں تو گھر آتے ہوئے راستے میں ہی کسی جگہ رُک اسے اپنے گندے مندے ہاتھوں سے پار لگا جاتی تھی۔امّاں اگر کبھی کہتیں تو چٹا کورا الزام حلوائی کے سر تھوپ دیتی۔اماں دو تین صلواتیں تو حلوائی کی شان میں ضرور ہی سُنا جاتیں۔کبھی کبھار دھیلے پولے کی بھی ہیرا پھیری کرلیتی کہ بچوں کی کہانیوں کا کرایہ دینا ہوتا تھا۔اس کے بھی بڑے چسکے تھے۔

سودا لانے میں عموماً دیر کردیتی تھی۔ونڈو شاپنگ والے کام بھی ساتھ جڑے ہوئے تھے۔یہ ونڈو شاپنگ دوکان کے تھڑے پر چڑھ کر سامنے ریکوں میں سجے ریشمی کپڑوں کے تھان، ڈیزائن اور رنگ کا تھوڑا بہت اندازہ کرنے سے تعلق رکھتا تھا۔پہلے روزے سے ہی اماں کی جان کھانی شروع کردیتی۔پھر ایک دن گھسیٹ کر دکان پر لے جاتی۔امّاں اس کی قیمت سن کر دوکان دار سے بھاؤ تاؤ میں لگ جاتی۔کبھی بات بن جاتی اور کبھی وہ انکاری ہو جاتا۔ایک بار ایسا ہوا بات نہ بنی۔امّاں نے میرا ہاتھ پکڑ کر دکان سے نکلنے کی کوشش کی۔میں نے وہ غُل غپاڑہ مچایا کہ امّاں بیچاری کو تو ماتھے پر ہاتھ رکھنا پڑا کہ کیسی

چنڈال بیٹی اللہ نے دی ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ میرے ایسے تماشے کرنے پر بے چارے دکان دار کو ہی شرم آ گئی یا ممکن ہے اُسے اپنے بچے یاد آ گئے ہوں۔ ''بہن جی آپ جس قیمت پر لینا چاہتی ہیں لے لیں۔ بچی روتی ہوئی میری دکان سے اُترے یہ مجھے قبول نہیں۔'' آج بھی یہ الفاظ یاد ہیں۔ دیدہ لحاظ اور مروّت کے زمانے تھے۔

پھر درزن کے گھر کے چکر۔ گلا ایسا بنانا ہے۔ پشت پر پھول بنانے والی ٹائیاں۔ خدا غریق رحمت کرے بیچاری ہماری درزن کو۔ عینک کے شیشوں میں سے ہنستی اس وقت بے طرح یاد آ رہی ہے۔ دن میں کوئی چھ بار اس کے گھر کا چکر لگاتی۔ جب سل کر آ جاتے تو دس بار انہیں کھول کر دیکھنا معمول ہوتا۔ عید سے ایک دن پہلے رات کو جوتے والا ڈبہ، کپڑے سب سرہانے رکھ لیے جاتے۔ ننھے سے دل میں چور کا خوف بھی تو بیٹھا ہوتا۔ نور پیر کے تڑکے مہندی کا رنگ دیکھا جاتا۔ تیل لگتا کہ رنگ گہرا ہو جائے۔ گھر کے سامنے میدان میں کھانے پینے کی چیزوں اور انواع واقسام کے جُھولے۔ عیدی کتنی ملتی۔ اٹھنی یا روپیہ۔ شام تک لور لور محلوں کی سیر کی جاتی۔ جب سارے پیسے خرچ ہو جاتے۔ کپڑے اور چہرہ دن بھر کے الم غلّم کھانے پینے کی چیزوں اور گرد و غبار سے اٹ سے جاتے۔ تب گھر واپسی ہوتی۔ اماں پھٹکارتیں تو بہتیرا۔ پر سال میں دو دن تو ایسی موجیں ماری جاتیں۔ محرم پر تو دس دن یہ سلسلہ چلتا۔ ایسی رونقیں، دودھ شربتوں کی سبیلیں، گُجیاں، ٹھوٹھیاں ڈھیروں کے حساب سے اکٹھی کرتے۔ ''کڑیو بالو چیج ونڈی دی لے ہی جاؤ'' آواز گویا ایک خوشی کا سائرن ہوتا جو بھگا کر مطلوبہ گھر لے جاتا۔

ایک اور بڑی کھٹی اور میٹھی یاد ذہن میں مچل اُٹھی ہے۔ بڑی عید کا تہوار تھا۔ ہماری امیر نانی نے ہمیں ایک روپیہ دیا۔ روپیہ ہاتھ میں پکڑا جہاں خوشی بے حساب تھی وہیں یہ فکر بھی دامن سے آ لپٹی کہ ان دنوں اماں اور نانی میں کچھ ناراضی کا سلسلہ تھا۔ ایسے میں اگر

امّاں کو پتا چل گیا تو نہ صرف ڈانٹ پڑے گی بلکہ ہاتھ آئی رقم بھی واپس کرنی ہوگی۔

حل یہی سمجھ آیا کہ دبا جاؤ ساری بات۔اب روپے کو بھنایا جس کی ریز گاری بڑی حکمت عملی سے لی۔ایک اٹھنی، ایک چونی، تین آنے اور ایک آنے کے چار پیسے۔ہمارے اکلوتے کمرے کے کونے میں پیٹی کے اوپر رضائیاں دھری تھیں۔نیچے والی رضائی کے کھُلے کنارے سے ہاتھ آگے لے جا کر دو پیسے رکھ کر باقی سارا خزانہ وہاں چھُپا دیا۔اب ہر سو موجیں ہی موجیں تھیں۔دولت کا خمار اور نشہ بھی کیا چیز ہے؟ پاؤں زمین پر ہی نہیں ٹکتا تھا۔ امّاں کو تشویش سی ہوئی یہ پیٹ بھر کر کھانا کیوں نہیں کھاتی؟ سو دن چور کا اور ایک دن سادھ کا۔بس تو ایک دن بھانڈا پھوٹ گیا۔غلطی سے بھائی کو کھانے پینے میں شامل کر لیا تھا۔

اب امّاں باز پرس کریں تو کیسے؟ بھرا پُرا گھر۔ساتھ لے باہر نکل آئیں۔گلی سنسان تھی۔ایک تھپڑ گال پر پڑا پھر تھپڑ، ایک دھموکا، ایک گھونسا۔سوال جواب کی عدالت بھی سج گئی۔آئینہ تو نہیں دیکھا مگر یہ ضرور یاد ہے کہ آنسو اس روانی سے بہے کہ گلی میں اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔نئی نویلی ساری چوڑیاں امّاں کے عتاب کی نظر ہوگئیں۔مار سے بھی زیادہ ملال رقم کی واپسی کا تھا جو نو آنے دو پیسے پر مشتمل تھی جس میں امّاں نے بقیہ ڈال کا پورا روپیہ نانی کے منہ پر مارتے ہوئے کہا تھا۔''منڈھ سے بیر اور شاخوں سے جھپیاں۔''

دراصل ہمارے ماموں لوگ اپنی چھ بہنوں میں تین سے چھوٹے تھے۔بڑی بہنیں تو تقسیم سے قبل ہی رشتہ داروں میں بیاہ دی گئیں۔نئے ملک میں ہماری نانی کے پڑھے لکھے افسر کنوارے بیٹے اونچی ملازمتوں پر لگ گئے۔نانی اور کنواری سکولوں کالجوں میں پڑھنے والی بہنوں کے مزاج ہی بدل گئے۔ہماری امّاں بڑی خودار طبیعت کی مالک تھیں۔اپنے شوہر کی 60 روپے تنخواہ میں گزارہ کرتیں اور کسی کا رُعب نہ سہتیں۔

☆☆☆

ابونواس آٹھویں صدی کا عظیم کلاسیکل شاعر

بغداد کی رات کے اِس پہلے پہر جب میں دجلہ کے پانیوں میں ڈوبی روشنیوں کے عکس دیکھنے میں گُم تھی۔ مجھے تو معلوم بھی نہ ہوا تھا کہ کب ایک وجیہہ عراقی بوڑھا میرے پاس آکر بیٹھ گیا تھا۔ اُسکا روایتی لباس، اُس کی مخمور آنکھیں، اُسکی سنہری رنگت، اُسکا بانکپن سبھوں نے میری توجہ کھینچ لی تھی۔ میں نے استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا

یقیناً آنکھوں کی زبان اُس نے پڑھ لی تھی۔ گھن گرج سی تھی لہجے میں جب بولا تھا۔

''میرے نام سے منسوب اِس اہم شاہراہ ابونواس پرتم کس ٹھسّے سے بیٹھی ہو۔ اورتم نے نہ مجھے یاد کیا، نہ خراج تحسین پیش کیا۔ حد ہوگئی ہے۔''

''اوہو''، میں سمجھ گئی تھی کہ میرا مخاطب کون ہے؟

''سچی ہے جب سے یہاں آکر بیٹھی ہوں آپ کے ہی خیال میں تو گم ہوں۔''

شاعر کا بڑھاپا جوانی کی طرح کم شاندار نہ تھا۔ شاہوں جیسا بانکپن تھا اُس میں۔

''لو میں نے تو جب عراق آنے کا قصد کیا۔ عراق سے متعلق لٹریچر اور معلومات کے جھمیلوں میں اُلجھی۔ تم تو اُسی دن سے میرے سامنے آگئے تھے اور میرے ساتھ رہنے لگے تھے۔ اور یہ بھی تھا کہ میں ابونواس روڈ پر دجلہ کے کنارے بیٹھ کر ہی تو تم سے لمبی چوڑی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ پر شہرہ آفاق عوڈسٹ (oudist) احمد مختار نے میری توجہ کھینچ لی۔ سچی عراقی موسیقی، میسوپوٹیما اور عرب موسیقی کا دل کش امتزاج ہے جس پر ایرانی روایتی موسیقی نے بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ ہاں ایک بات کہ پاکستان میں جو کچھ تم پر پڑھا وہ ادب کے حوالوں

سے تو بہت اہم تھا۔مگر مجھ جیسی کچھ تنگ نظر،تھوڑی بہت روایات کی اسیر، کچھ ماڑے موٹے اخلاقیات کے بندھنوں میں جکڑی عورت کیلئے کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔کہیں رسوائے زمانہ نظروں سے گزرا۔کہیں مذہبی اقدار کا باغی اور کہیں شہوانیت کا مارا ہوا۔پر اندر کی بات بتاؤں کہ میں نے بھی چسکے لے لے کر تمہیں پڑھا اور اپنی ادبی سہیلیوں کو بھی تمہارے شہہ پارے سنائے۔روشن خیال اور ترقی پسند عورتوں نے تمہیں جی بھر کر سراہا۔

خیر لونڈے تو تمہاری شاعری کا ایک مستقل حصّہ ہیں۔ایک ایسی نظم جسمیں عقیدے اور مذہب کی بھی جھلک ہے وہاں یہ دیوانگی کفر کی حد تک چلی جاتی ہے۔پھڑ پھڑ کرتی شاعری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی ہے۔

تمہاری ایک نظم پڑھتی ہوں۔کہنا چاہتی ہوں۔ابونواس تمہاری اس نظم کو پڑھتے ہوئے میرے اندر کے شیطان نے اگر چسکا لیا تھا تو خیر کے تربیت یافتہ پہلو نے فطرت کی خلاف ورزی پر احتجاج بھی کیا تھا۔

آمادگی پر مائل لڑکے سے مجھے پیار ہے ایک خوبصورت، پروقار،خطرناک،غزال
جس کی پیشانی نقاب میں چھپے چاند جیسی کوئلے جیسے سیاہ اور بادلوں جیسے گھنے بال
جو اپنے زیر جامے میں کاہلی سے پلسٹے مارتا ہے
نہ زیورات کا کوئی مطالبہ
اور نہ ہی پرفیوم کے لئے کوئی تقاضا
نہ کبھی چیتھڑوں سے کپڑوں میں نظر آتا ہے
اور نہ ہی کبھی حاملہ ہوتا ہے

ایک شام جب میں تمہاری ایسی ہی نظمیں پڑھتے ہوئے جہاں تم نرم و نازک لطیف سے جذبات پر بہتے بہتے گندگی کی پاتال میں اُتر جاتے تھے۔مجھے شرمندگی سی محسوس

ہوئی تھی۔اب تم جب کہتے ہو......

لڑکو آؤ سیدھے میری طرف

میں عیش و عشرت کی ایک کان ہوں

مجھے کھودو

پرانی مدہوش کرنے والی شراب

خانقاہوں میں راہب ہی تیار کرتے ہیں

شیش کباب، بھنے ہوئے مرغ

کھاؤ، پیو اور موج میلہ کرو

اور بعدازاں

تم میرے ٹول کو

شمپو کرنے کیلئے آسکتے ہو

''بہت ہوگیا۔ بہت ہوگیا علموں بی بی بس کر اب۔تھوڑی دیر کیلئے اِس موضوع سے ہٹ کر اُس کی شاعری کی اور خوبصورت پرتیں دیکھ۔لونڈے بازی پر ہی تیری سوئی اٹک گئی ہے۔

''ابونواس''

''مجھے یقیناً اپنی خوش قسمتی پر رشک آ رہا ہے کہ آٹھویں صدی کے وسط اور آخری دہائی کا عربی کلاسیکل شاعری کے ایک بہت بڑے نام کا حامل شاعر ابونواس نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا ہے اور میرے پاس آ کر بیٹھا ہے۔''

''ابونواس'' میں کچھ جھجھکی تھی۔

''کہو۔ جو کہنا چاہتی ہو۔تم ایک دبنگ بندے کے سامنے بیٹھی ہو۔''

''ابونواس میں گنہگار سی، کچی پکی مسلمان عورت جاہل سی، محدود سے ذہنی افق کی

مالک تمہاری شراب اور شراب نوشی، لونڈے بازی، پھکڑ بازی اور خدا سے مخول بازی کو اس طرح ہضم نہ کرسکی جیسے شاید باقی لوگ کرتے ہوں گے۔ اب میں بھی کیا کروں تم خمریات (Khamriyyat) (شرابنوشی) مدحققارات (Mudhakkarat) (لونڈے بازی) اور مجنیات (Mujuniyyat) (کفر بکنے) کے چکروں سے ہی نہیں نکلتے تھے۔ شاعری کا سارا تانا بانا تو ان ہی موضوعات کے گرد بُنتے رہے۔''

''بس تو اتنا سا علم لے کر بیٹھی ہو۔'' ابونواس نے اپنے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کو مضبوطی سے ایک دوسرے سے جوڑتے ہوئے درمیان میں معمولی سے خلا کا راستہ بھی بند کرتے ہوئے گہرے طنز سے کہا۔

''ایک میں کیا بغداد کے بیشتر شُعرا اور لکھاری بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ عرب دُنیا کی اکثریت کا یہی انداز تھا۔ چلو ابنِ راوندی کو چھوڑو تمہارا ایمان خطرے میں پڑ جائے گا۔ ولادہ بنت المستقفی کی شاعری کا تو جائزہ لینا تھا۔ تمہیں پتہ چلتا نویں صدی کی عورتوں کی روشن خیالی اور دانشوری کا۔ ابو العلاء المعریٰ کو پڑھنا تھا۔ اس کے ہاں اگر شہوانیت نہیں مگر مذہب پر تنقید ہے۔ خدا پر ایسی نُکتہ چینی ہے کہ تم جیسے چھوٹے ذہن کے لوگ پل نہ لگائیں اور مُرتد اور کافر کے فتوے دائر کردیں۔ جنت اور جہنم کے پسِ منظر میں لکھی گئی اُس کی مشہور نظم ''رسالت الغفران'' کہ جس سے دانتے نے متاثر ہوکر ڈیوائن کامیڈی لکھی۔

ہمارے عہد کے مفکر، دانشور، شاعر اور ادیب زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ تم لوگوں کی نسبت زیادہ روشن خیال تھے۔ وہ تمہارے محبوب فارسی کے شُعرا عُمرِ خیّام اور حافظ جن کی شاعری پر تم جیسے لوگ سر دُھنتے ہیں۔ میرے ہی تو جانشین ہیں۔ میری روایات کے امین ہیں وہ۔ یونانی اور رومی شاعروں کو پڑھو۔ دنیا کے فلاسفروں اور دانشوروں کا مطالعہ کرو۔

انکے کام بھی میرے جیسے ہی تھے۔

سچی بات ہے اگر یہ طعنہ نہ بھی ملتا تب بھی مجھے اپنے سطحی سے علم کا بخوبی احساس تھا۔میرے ہاں دعویٰ تو سرے سے ہی نہیں تھا۔دعویٰ تو سراسر جہالت ہے۔

میں نے اپنے اِن جذبات کا اظہار بڑے نرم اور شائستگی ومتانت میں ڈوبے لہجے اور انداز میں کیا۔تھوڑا سا زور اِس بات پر بھی دیا کہ شاعری کی بہت ساری اصناف میں شاعر کِس میں زیادہ گہرائی کے ساتھ سامنے آیا ہے اِسے پرکھنا تو یقیناً نقادوں کا کام ہے۔عام قاری تو لُطف کیلئے پڑھتا ہے۔

تاہم تاریخ میں درج یہ سچائی اور حقیقت بہت کھُل کر سامنے آئی ہے کہ تمہارے علم کی وسعت بے پایاں،تمہارا حافظہ قوی اور یادداشت غیر معمولی تھی۔تمہارے عہد کے نقادوں کی رائے بشمول ابو حاتم المکّی!

''کہ ابونواس کے ہاں عمیق گہرائی اور سطحی پن دونوں ہیں۔ابونواس اگر خود اس کا اظہار نہ کرے تو بسا اوقات سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

یوں تمہاری جی داری اور حوصلے کی بھی داد دینی پڑتی ہے۔ابوالعتاہیہ جیسا صوفی خدا پرست شاعر مقابلے پر ہو اور مذہبی لوگوں کی جماعتیں بھی تمہارا تیاپانچہ کرنے پر تُلی رہتی ہوں تب بھی تم کہتے تھے۔

سرور ملتا ہے مجھے اُن کاموں کے کرنے سے
جنہیں روکتی ہے مقدس کتاب میں گریزپا ہوں اُن سے
جن کی اجازت دیتی ہے الہامی کتاب بغداد کے کوچہ وبازار میں اگر
ابوالعتاہیہ کا صوفیانہ کلام گونجتا تھا کھا سوکھی روٹی کا ٹکڑا
پی ٹھنڈے پانی کا پیالہ تنہا بیٹھ اور غور کر

مقصد حیات کو سامنے رکھ یہ چند گھڑیاں بہتر ہیں
بلند و بالا محلات میں شاہوں کے حضور بیٹھنے سے

وہیں تجھ سے محبت کرنے اور تیرے چاہنے والے تجھے یوں گنگناتے اور گاتے تھے......

''ابونواس۔''

فائدہ اٹھا اپنی جوانی سے جان لے یہ باقی نہیں رہے گی
صبح و شام کی شرابیں ملا نشے کا لطف اٹھا
اور مخمور ہو

ایسا طنزیہ اور تمسخرانہ انداز تھا۔ نگاہیں جو چہرے پر جمی تھیں وہ اِن احساسات سے لبالب بھری تھیں۔ بڑی خفت سی محسوس ہوئی تھی۔ ایک تو گرمی اوپر سے شرمندگی۔ مساموں سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

''اندھا تھا ابو العتاہیہ۔ ایسے لوگ کیا کہوں۔ میں نے زندگی اُس کے حُسن و رنگوں کے ساتھ بھرپور انداز میں گزاری ہے۔ کوئی بار بار ملنے والی چیز تھی یہ۔''

میں خاموش ہوگئی تھی۔ یقیناً میں اُس وقت اُسے وہ سب نہیں سُنانا چاہتی تھی جو میرے قلب و ذہن میں شور مچائے جاتا تھا۔ چاند چہرے جیسے لڑکے، ان کے مرمریں بدن، زیر جاموں کی نرماہٹ اور اس کے جاندار بوسے۔

کچھ اپنے بارے میں بھی بتا دیں۔ خود سے ملا دیں......

ارے بھائی ہماری زندگی بس ایسی ہی اُجڑی پُجڑی سی تھی۔ میری ماں گلبان ایرانی اور پیشے کی جولاہی تھی۔ صورت کی اتنی حسین کہ ہواؤں میں اڑتے پرندے دیکھ لیں تو غش کھا کر سیدھے اُس کے قدموں میں گریں۔ نام تو میرا ماں نے الحسن ابن حینی الحاکمی

رکھا مگر گاؤں کے من چلوں نے ''ابونواس'' کہنا شروع کردیا۔

ہاں پیدا کہاں ہوا؟ کچھ پتہ نہیں۔ کسی نے دمشق کہا۔ کسی نے بصرہ اور کچھ اھواز کہتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے؟ مجھے تو خود معلوم نہیں۔ ماں نے مجھے یمن کے کسی تاجر کے پاس کیوں بیچ دیا؟ میں کبھی سمجھ نہیں سکا۔ چھوٹا سا تھا۔

یوُسف اوّل جیسا تھا۔ ذہین بھی بہت اور حسین بھی بہت۔

اُس نے مجھے دیکھا۔ ولیبہ ابن احباب نے یہ شاعر تھا۔ اُسنے مجھے خریدا اور اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ پڑھائی لکھائی، گرامر، صرف و نحو۔ کوئی دو سال بدوؤں میں بھی رکھا کہ زبان خالص ہوجائے۔

یہ ولیبہ ہی تھا جو مجھے بغداد لایا۔ یہیں میں نے شاعری شروع کی۔ مزاح سے بھرپور۔ صحرائی روایات کے برعکس، شہری زندگی کی عکاس جس میں نوخیز لڑکوں کی محبت اور شراب تھی۔

میں باغی تھا، روایات کا، اقدار کا، مذہب کا۔ سُرور ملتا تھا جب مُلاّ چیختے چلاّ تے، تھے جب لعن طعن ہوتی تھی۔

قصیدہ گو تھا اپنے سرپرستوں کا۔ برامکیّوں کیلئے کیوں نہ لکھتا۔ وہ تو نگینے تھے جو عباسیوں کو مل گئے تھے۔ عربوں کا عروج ، اُنکی فتوحات کے پھیلاؤ ، اُنکی زبان کی وسعت، مذہبی رواداری، آئین و دستور کی بالادستی یہ سب حقائق مسلّم۔ لیکن ایرانیوں کے تہذیب وتمدّن کی شائستگی، نرمی اور لطافت نے اپنا رنگ انکے رنگ میں شامل کیا اور اُسے مزید نکھارا۔

یہ حقیقت ہے کہ امین کے مرنے پر جو نوحے میں نے تخلیق کیئے وہ عربی شاعری کا سرمایہ ہیں۔ زبیدہ کے نالے اور بغداد کی گلیوں میں گونجتے نوحے میری شاعری کے صدقے

تھے جنھوں نے مامون کو فتح یاب ہو کر بھی بغداد میں داخل ہونے سے مہینوں روکے رکھا۔خائف تھا وہ۔

مامون میرا نام سُننا نہیں چاہتا تھا۔''

''ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابونواس تم آخری عمر میں تائب ہو گئے تھے۔بڑے مذہبی اور خدا پرست بن گئے تھے۔''

''یہ ہوائی تو میرے کسی دشمن نے اڑائی ہوگی۔ہاں اتنا ضرور تھا کہ جیل اور بڑھاپے نے پریشان کر دیا تھا۔انعام کے لالچ میں مدح سرائی بھی کی۔اور ہاں ایک بہت بڑی حماقت بھی سرزد ہوئی کہ مامون کے درباری مشیر نے چالاکی سے علی ابن طالب کے خلاف ہجو بھی لکھوالی اور اُسے بغداد کے کوچہ وبازار میں نشر بھی کر دیا۔''

''زہر ملا۔یا جیل میں ہی طبعی موت مرا۔بس دنیا سے جانے کا بہانہ ہی چاہیے تھا۔وہ مل گیا اور چلا گیا۔

☆☆☆

ایا صوفیہ کیا اسلام اور مسیحیت کے درمیان نیا تنازعہ کھڑا کرے گی

تو پھر ترکی کی کونسل آف اسٹیٹ نے دس جولائی کو اپنا فیصلہ سُنا دیا جو عین طیب اردگان کی توقعات اور وعدے کے مطابق تھا۔ فیصلے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد اس نے بڑی جی داری سے اس کا اعلان بھی کر دیا۔ بین الاقوامی سطح پر اس بارے جتنے بھی تحفظات، خدشات اور تنبیہی انداز اس کے سامنے تھے اس نے انہیں پرکاہ برابر اہمیت نہ دیتے ہوئے یونیسکو کی اس بات کو بھی قطعاً نظر انداز کیا کہ جہاں گود لیے اِس اثاثے کی کسی بھی تبدیلی صورت میں اُس کے ساتھ مکالمہ اور اس کی رضامندی ضروری تھی۔ پہلے چرچ، پھر مسجد، پھر میوزیم اور ایک بار پھر مسجد بننے والی آیا صوفیہ جو عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے بڑی مقدس اور اہم ہے۔ اب اس فیصلے کی روشنی میں کیا کسی بڑے جھگڑے کا باعث بنے گی؟

بڑا سنجیدہ قسم کا پہلا ردّعمل روسی آرتھوڈوکس چرچ کا سامنے آیا ہے۔ جس کا لب لباب لاکھوں آرتھوڈوکس روسی عیسائیوں کے جذبات کا خیال نہ کرنے کا تھا۔ کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار یورپی یونین نے کیا۔ امریکہ کے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ترجمان کا بیان بھی سامنے ہے کہ ترکی کے فیصلے پر انہیں بھی مایوسی ہوئی ہے۔ یونان تو خیر ہمیشہ سے ہمسائے سے الرجک رہتا ہے۔ اِس واقعے پر کیوں نہ بولے گا۔ سائپرس بھی افسردہ ہے۔ خیر سے اردگان بھی کوئی دبنے وبنے والی شے نہیں۔ طعنوں پر اُتر آیا تو کچے چِٹھے سبھوں کے کھول سکتا ہے۔

اب یہاں کچھ سوال اٹھتے ہیں۔ پہلا تو یہی ہے کہ طیب اردگان کی سیاسی جماعت استنبول میں دوبارہ اپنا بھرپور اثر چاہتی ہے؟ گذشتہ سال کی شکست نے انہیں یہ داؤ کھیلنے پر اُکسایا ہے۔عین ممکن ہے اس میں بھی کچھ حقیقت ہو۔تاہم چند حقائق پیشِ نظر رہنے چاہیں اردگان نے استنبول جیسے بڑے شہر کو جو بیسویں صدی کے اختتامی سالوں میں مسائل سے لدا ہوا، گندہ، بے ہنگم پھیلاؤ اور بنیادی سہولتوں سے محروم ایک مسائلستان بنا ہوا تھا۔اس کی میئر شپ میں دنیا کا بہترین شہر بنا اور انعام میں پورے ملک کا راج پاٹ اس کے ہاتھوں میں تھا۔اب یہ کہنا کہ اس دوران اُس نے آیا صوفیہ کو مسجد کے درجے پر کیوں نہ بحال کیا۔

میرے خیال میں استنبول، انقرہ اور دیگر بڑے شہر ماڈرن ہیں۔مسجدوں سے بھرے ہوئے مگر کھلے ڈلے، آزاد خیال، سیکولر سوچ اور ذہن کے حامل لوگ جو سیکولرازم میں ہی ترکی کی بقا سمجھتے ہیں۔ ہاں البتہ دیہی علاقوں خصوصاً ملک کے جنوب مشرقی حصوں میں مذہب کا زور ہے۔ بیشتر حکومتی لوگ مذہبی رجحان رکھتے ہیں مگر عام لوگ ترک کے قائم کردہ سیکولر نظام کی ہی حمایت کرتے ہیں۔ایسے میں اردگان کے لیے اپنے آپ کو ایک اعتدال پسند لیڈر کے طور پر پیش کرنا بے حد ضروری تھا۔یوں بھی اندرونی مسائل میں معیشت کو مظبوط بنیادوں پر استوار کرنا، کُردوں کے مسئلے سے نپٹنا اور فوج کو جو قابو سے ہی باہر تھی اس کی حدود میں رکھنا جیسے سنگین مسائل بھی اس کے سامنے تھے۔ایسے مسائل جو اولین توجہ کے مستحق تھے۔جہاں پیر جمانا اور اپنا سکہ منوانا مقصود ہو تو کم اہمیت کے واقعات پیچھے چلے جاتے ہیں۔ویسے صرف میری رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ترکی کے سفری تجربات کی روشنی نے مجھے بتایا تھا کہ ترکی کے لوگ بہت شعور رکھتے ہیں۔مغرب کے معاندانہ رویوں کو بخوبی سمجھتے ہیں۔اگر عام ترک یورپی یونین میں تُرکی کی شمولیت پر آسٹریا، یونان، ہنگری

اور مشرقی یورپ کی شدید مخالفت کے ساتھ جرمنی اور فرانس کے مخالفانہ رویوں سے بھی بخوبی آشنا ہے اور جب وہ بخوبی یہ سمجھتا ہے کہ یورپ اُس کی آبادی کے تناسب اور اسلامی تشخص سے خائف ہے جسے یقیناً ترکی کی طاقتور فوج بھی ختم نہ کرسکی تھی۔ اب ایسے میں کہ ترکی تو اپنی آبادی کے بل بوتے پر یورپی یونین کی پارلیمنٹ میں اکثریت کے ووٹ حاصل کرے گا۔ تجارتی کوٹے میں زیادہ حصّے کا حق دار ٹھہرے گا تو کیا طیب اردگان جیسا زیرک سیاست دان نہیں سمجھتا تھا۔ اِس ضمن میں اس کی ان تھک کوششیں سب ناکام ہوئیں۔ پھر جہاں اور جب جس کا زور چلے گا اس نے تو وہ کام کرنا ہے۔

اب آیئے چند دوسرے پہلوؤں پر تقابلی جائزہ ہو جائے ذرا۔

پہلا تو مسجد قرطبہ کا ہی ہے۔ جسے چرچ بنایا گیا۔ جہاں اذان دینی گناہ اور نماز پڑھنا جرم ٹھہرا۔ اب یہ کہا جانا کہ یہ چرچ تھا جس پر مسجد تعمیر ہوئی۔ نہیں یہ صدیوں پہلے گوتھوں کا معبد تھا۔ رومن غالب آئے تو رومیوں کا ٹمپل بنا۔ عیسائیوں نے اِسے چرچ بنالیا اور سینٹ ونسٹ کا نام دیا۔ مسلمانوں نے اِسے مسجد میں بدل دیا مگر ایک بات کی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عبدالرحمٰن اول نے زور زبردستی نہیں کی، سودے بازی ہوئی۔ قی،ت نصف ادا ہوئی۔ شہر کے تمام گرجا گھروں کی مرمت اور تعمیرِ نو کی اجازت بھی ہوئی اور کچھ ایسا ہی سلسلہ دمشق کی امیہ مسجد کے ساتھ ہوا۔

روایت ہے کہ با قاعدہ کھیتڈ رل تو چارلس پنجم کے زمانے میں بنا اور جب وہ اس کا افتتاح کرنے آیا تو سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ اس کے جادوئی حسن کا اُسے اندازہ ہی نہ تھا۔ اس کے الفاظ بھی تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ’’تم لوگوں نے ایک ایسا شاہکار تباہ کردیا جس کا بدل دنیا میں ممکن نہیں۔‘‘

تاریخ گواہ ہے کہ قومیں جب زوال پذیر ہوتی ہیں تو عبادت گاہیں کھنڈر بن جاتی

ہیں جن کی بنیادوں پر نئے فاتح اپنی عبادت گاہوں کو کھڑا کرتے ہیں۔ یقیناً اس میں شاید فاتحانہ تسکین کا کوئی پہلو ہو۔ وہ اکیس سالہ جیالا سلطان محمد فاتح بھی تو شہر میں داخلے کے بعد سب سے پہلے اسی کے دروازے پر آ کر اُترا تھا۔اذان گونجی تھی اور نماز ادا ہوئی ۔گویا بشارت رسول ﷺ کی تکمیل ہوئی۔ چار مینار بنے۔توپ کپی پیلس عثمانی سلاطین کی رہائش گاہ تھی ۔چند قدم کے فاصلے پر نماز کی ادائیگی اسی مسجد میں ہوتی رہی۔ نیلی مسجد بعد میں بنی۔

اب یہ اردگان کا دل جانتا ہے کہ اس سارے قضیئے کی آڑ میں اس کے سیاسی عزائم ہیں یا وہ عثمانی سلاطین کی پیروی میں کسی قابل فخر کام سے خود کو تاریخ میں امر کرنا چاہتا ہے۔تاریخ میں تو بہرحال وہ لکھا جارہا ہے مگر کسی منفرد کام سے مزید کا تمنائی ہوسکتا ہے۔عدنان میندریس کی طرح۔اتاترک کا ساتھی جس نے اقتدار میں آنے کے بعد عصمت انونو کے ترکی زبان میں دی جانے والی اذان کے حکم کو ختم کیا تھا۔ میرے جیسی بے عمل سی مسلمان عورت نے استنبول میں ایمی نونو میں کھڑے جب سامنے مسجد سے مغرب کی اذان کی دلکش آواز سُنی تھی تو سارے سر پیر میں وہ لطیف اور گداز سا ارتعاش محسوس کیا تھا جس نے مجھے اس لڑی میں پروئے ہوئے ہونے کا احساس دیا تھا جو مسلم امہ ہے۔ بلا سے کہ ابھی یہ مطعون ہے، نانہجار ہے اور بڑی ہی بے حس گردانی جاتی ہے مگر دین اور دنیا کا سبق بتاتا ہے کہ خدا دنوں کو قوموں کے درمیان پھیرتا ہے۔ کسی دن اُٹھ کھڑی ہوگی انشاءاللہ ایا صوفیہ میں سجدہ دینے کی کِسے حسرت نہیں۔ میرے جیسی بڈھی بھی کرونا سے نپٹ کر اُڈی اُڈی جائے گی ۔تو بہرحال جناب اب اس پر کتنا شوروغوغا برپا ہوتا ہے۔ عالمی میڈیا اس ایشو کو اسلام اور مسیحیت کے درمیان ایک جنگ کے آغاز کا نقطہ قرار دیتا ہے۔ یا خاموشی اختیار کرتا ہے دیکھیں پردہ غیب سے کیا ظہور ہوتا ہے۔

☆☆☆

سوشل میڈیا کا یہ طوفان

سوشل میڈیا کے جتنے بھی پلیٹ فارمز ہیں مجھے نہیں پتہ کہ ان کے لیئے کوئی ضابطہِ اخلاق بھی وضع ہے یا نہیں۔ ہاں البتہ سائبر کرائمز کے لیئے ضرور کچھ سزائیں ہیں۔ یہاں سوال اٹھتا ہے کہ دورِ جدید کی یہ سوغاتیں ہمیں ویسٹ سے ملی ہیں۔ان کے ساتھ جو اچھائیاں اور غلاظتیں لپٹی ہوئی ہیں وہ ویسٹ کے لیے تو قابلِ قبول ہیں کیونکہ یہ اُن کی چیزیں ہیں۔

ان کے ہاں کے کُھلے ڈلے معاملات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ بڑے رچّے بچے سے لوگ ہیں۔خود کو اپنے حالات اور ماحول کے مطابق چوڑا کرنے اور تنگ کرنے کا شعوری ادراک رکھتے ہیں۔

اصل مسئلہ تو ہمارے ساتھ ہے یعنی ہم پاکستانیوں کے ساتھ، جو اناڑی کے ہاتھ استرا آجانے پر کہ وہ اپنے ہی گالوں کو چھیل ڈالتا ہے یا پھر رہٹ کی ٹنڈوں سے بہتے پانی کو ہاتھوں کی اوک بنا کر پیاس بجھانے والے دیہاتی کے پاس پیالہ آجانے پر کہ وہ پانی پی پی کر ہی آپھر جاتا ہے والا معاملہ ہے۔

آرٹسٹوں اور فلم ٹی وی سٹاروں کے ساتھ اخلاق سے گرے واقعات تو آئے دن ہی سُنتے رہتے ہیں، مگر ابھی جن دو واقعات نے بہت سے سوالیہ نشان ہمارے سامنے کھڑے

کر دیئے ہیں وہ لمحہ فکر یہ ہیں۔

لاہور گرامر سکول کی طالبات کے ساتھ اساتذہ کے گھناؤنے کھیل تماشے ہی والدین کے لیئے اضطراب کا باعث بنے ہوئے تھے کہ اسلام آباد کی فاسٹ یونیورسٹی کے طلباء کی اخلاقی گراوٹ کا جو کردار سامنے آیا ہے اس نے اور مضطرب کر دیا کہ ہم جا کہاں رہے ہیں؟ واقعے کی تھوڑی سی تفصیل گوش گزار ہے۔

یہ فون تھا ہماری ایسی ملنے والی خاتون کا جن کا تعلق بڑے وضع دار اور مذہبی گھرانے سے ہے۔ جنکی گھریلو روایت میں والدین اور بڑوں کا احترام لازمی ہے۔ گھر کا پہلوٹی کا پوتا فاسٹ یونیورسٹی کا طالب علم ہے۔ لاک ڈاؤن کا سیاپا شروع ہوا تو کوئی بیس پچیس طلبہ نے وٹس ایپ پر اپنا ایک گروپ بنایا۔

چند دنوں بعد کچھ لڑکوں نے ایک ایسی ویڈیو شیئر کی جسے محض فحش مواد والے کھاتے میں ہی ڈالا جا سکتا تھا۔

صالح گھروں کے سلجھے ہوئے بچوں نے اس پر شدید اعتراض کیا۔ تو تو میں میں اور گروپ سے علیحدگی کی دھمکی کے ساتھ انہیں فوراً سے پیشتر ہٹانے کا مطالبہ بھی کیا۔ کچھ لڑکوں نے بیچ میں پڑ کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اور اس یقین دہانی کا بھی عہد ہوا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہوگی، مگر ابھی کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ اس شیطانی ٹولے نے فیکلٹی کی لائق ترین میرٹ پر کام کرنے والے فیکلٹی کے میل و فی میل اساتذہ کے سروں کے نیچے ایسے شرمناک دھڑ لگا کر وائرل کر دیئے۔

یونیورسٹی میں کہرام مچ گیا۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ نے فوراً نوٹس لیا۔ تحقیقاتی کمیٹی نے معاملے کی پوری ذمہ داری سے تفتیش کی۔ ڈاکٹر سمیرا سرفراز کی سرکردگی میں تمام امور کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا۔

ثبوتوں اور اُن کے ساتھ جڑے حوالوں کی روشنی میں جو سزائیں تجویز ہوئیں انہیں دینا ازحد ضروری سمجھا گیا تھا۔فیکلٹی کا کہنا تھا کہ ایسی پریکٹس نہ ہوئی تو پھر آپ خرابیوں کو پھلنے پھولنے کے راستے کھول دیتے ہیں۔

کمیٹی نے فیصلے اعترافی بیان کی روشنی میں کیئے تھے۔اور کہیں اس احساس کو غالب آنے نہیں دیا کہ جہاں کہا جا سکے کہ طلباء ساتھ زیادتی کی گئی ہے کہ وہ بہرحال ابھی بچے ہیں۔

یونیورسٹی لیول پر اساتذہ اور طلباء میں باہمی تعلقات میں احترام اور ایک حد کے اندر بے تکلفی کا عنصر ضرور ہوتا ہے مگر بے تکلفی اور مذاق کی اپنی حدیں ہیں جنہیں پار کر کے اخلاقی گراوٹ کے پاتال میں گر جانے کو اس میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

اب یونیورسٹی کو قانونی نوٹس دیئے جا رہے ہیں کہ طلباء کو دی گئی سزائیں واپس لی جائیں کہ اس کے پاس سزائیں دینے کا اختیار نہیں۔ہم بھی کیسے لوگ ہیں کہ جو غلط کاموں پر بچوں کی پیٹھ ٹھونکتے ہیں۔

سچی بات ہے ایک اچھی شہرت رکھنے والی یونیورسٹی کے لیئے یہ معاملہ انتہائی سنجیدگی کا حامل تھا۔میمز انٹرنیٹ سے فوری ہٹانے کے پس منظر میں خواتین اساتذہ کے مقام اور تقدس کی حرمت کا احساس تھا۔

یونیورسٹی کے ایک سابق ہونہار طالب علم کی گفتگو بڑی چشم کشا ہے کہ جس نے چھوٹتے ہی کہا ہے۔

ہمارے وقتوں میں فاسٹ کمپیوٹر سٹڈیز کی ایک بہترین یونیورسٹی شمار ہوتی تھی۔جس میں طلبہ کی کردار سازی اوّلین اہمیت کی حامل تھی۔

طلبہ تنظیمیں اور غیر نصابی سرگرمیاں جوان اذہان کو صحت مند سوچ اور باادب با

نصیب جیسے مدرسۂ فکر کو پروان چڑھانے میں نمایاں کردار ادا کرتی تھیں۔تاسف اور دُکھ بھرا لہجہ تھا طالب علم کا کہ جس نے کہا تھا کہ اب اس سوشل میڈیا نے اُن سب قدروں پر پانی پھیر دیا ہے۔ایک مخصوص سوچ اور نظریئے کی پرموشن نے اداروں کو متاثر ہی نہیں تباہ کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔

یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر ایوب علوی ایک فرض شناس، انتہائی ایماندار اور بہترین منتظم سمجھے جاتے ہیں۔میرٹ پر اُن کے ہاں ذرہ بھر لچک کی گنجائش نہیں۔اُن کا یہ وصف یہ مرحوم ڈاکٹر اعجاز احسن کی طرح بدنامی کی حد تک شہرت رکھتا ہے۔

چند ماہ قبل بھی وہ ایسی ہی آزمائش سے گزرے تھے جب ایک بڑے عہدے دار کے بگڑے ہوئے صاحبزادے نے نچلے متوسط کلاس کے ایک طالب علم کو کسی چھوٹی سی بات پر سیخ پا ہوتے ہوئے اُسے زناٹے کا تھپڑ مارا۔

غریب بچہ اپنی اور مخالف کی حیثیت سے آگاہ تھا۔خاموش گال سہلا کر رہ گیا۔بات چونکہ صریحاً زیادتی والی تھی اس لیئے وی سی تک جا پہنچی۔تحقیقی کمیٹی کی رپورٹ پر طالب علم کو ایک ٹرم کے لیئے یونیورسٹی سے نکال دینے کا نوٹس دیا گیا۔بڑے باپ کا بیٹا دباؤ اور سفارشیں شروع ہو گئیں۔مگر ایک پختہ انکار۔

والدین نے متاثر لڑکے کے والدین سے رجوع کیا۔لڑکا اور اس کے والدین وی سی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ وہ لڑکے کو معاف کرتے ہیں اور یونیورسٹی بھی اس کی سزا ختم کر دے۔

وی سی نے تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔اس کو معاف کرنے والے آپ کون ہیں؟ ہاں ہمارا قیمتی وقت اور محنت ضائع کرنے کی پاداش میں اب آپ کے بیٹے کو بھی ایک ٹرم کے لیئے یونیورسٹی نکالے گی۔

اب پھر ملک کی مقتدر شخصیتوں کا ان پر بہت دباؤ ہے مگر وہ استقامت سے کھڑے صرف ایک بات کہتے ہیں۔ایسی مادر پدر نںگی آزادی تعلیمی اداروں کو برباد کردے گی۔ہمیں مظبوط ہاتھوں سے اپنی اقدار کی حفاظت کرنی ہے۔

☆☆☆

چٹھی میرے خان کے نام

وہ سب اس کی چاہنے والیاں تھیں پر اب بہت مایوس تھیں ۔سماجی فاصلے کا خیال رکھتے ہوئے اس کی ہجو لکھنے ایک گھر میں اکٹھی ہوئی تھیں ۔اظہاریہ کا طریقہ کیا ہوگا؟اس پر بحث ہونے لگی ۔ایک نے رنجور لہجے میں کہا۔''ٹویٹر،فیس بُک بہتر رہیں گے''۔''ارے نہیں برقی خط بھیجو''۔

ایک اور بولی۔''چٹھی لکھو لمبی چوڑی سی کچھ تو ہمارے احساسات کی ترجمانی ہو۔''جوانی اور بڑھاپے کے سنگم پر کھڑی دلکش خاتون نے قلم ہاتھ میں پکڑا۔تھوڑی دیر خلاؤں میں گھورتے ہوئے کاپی پر جھکی اور اُونچے سے بولتے ہوئے لکھا......

''میرے پیارے مانے''

''وٹ اے ناسینس''،نیلی جینز پر سرخ ٹاپ اور ہم رنگ سکارف والی چلائی تھی۔

''دیکھو آزادیِ اظہارِ رائے سے محروم مت کرو مجھے۔یہ ُمانے'تو بس یونہی ایک یاد کے طور پر دماغ کے کسی کونے کھدرے سے پُھڑک کر باہر آ گیا ہے۔لو ذرا اِسے بھی سُن لو۔''

ایک ماڈرن لڑکی کی شادی عمران نامی فوجی سے ہوئی۔نئے جوڑے کا میس میں استقبالیہ تھا۔دُولہا نے دُلہن کے شانوں پر ہلکورے کھاتے بالوں اور چہرے پر لپا پُتا غازہ سرخی دیکھ کر کہا۔

ضیا کے زمانے میں افسروں کی تربیتی ٹرینگ میں Religious Motivation کا ایک پروگرام بھی شامل کیا گیا تھا۔دینی کتب کے مطالعے نے مجھے مشرف بہ اسلام کر دیا ہے۔پلیز سر پر دوپٹہ رکھنا اور اِس سرخی غازے کو بھی ذرا ہلکا کر لو وگرنہ

میرے کنوارے یاروں نے واپس میس جا کر میرا تو الگا نا ہے۔''یار اس مانے نوں بڈھی (بیوی) تے بڑی ٹیٹ ملی ہے۔

''ہمارے مانے کے مقدر میں بھی بڈھیاں بڑی ٹیٹ ہیں۔'' چند لمحوں کے لیئے وہ سب اداس ہو گئیں۔ پھر فاختائی سوٹ والی نے کہا'' ارے لعنت بھیج۔ گولی مار اِس موضوع کو۔لکھنا شروع کر۔'' اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اپنے ماسک کو ٹھیک کرتے ہوئے اس کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

دراصل ہم گلیمر پر مرنے والی عورتیں پرچی والے حادثے کو بُھلا ہی نہیں پاتی تھیں۔ ہائے کتنی سُبکی کی بات تھی۔ دل سے ہی نہیں اُترتی تھی۔ یہ سری پائے کھانے والا ہمارا گولا مولا سا گلو بادشاہ دُنیا کے تھانیدار کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو لفظ نہیں بول سکتا تھا۔ ہے نا ڈوب مرنے کی بات۔

دیکھ لینا ہمارا خان سرپٹ بھاگتے گھوڑے کی طرح بولے گا اور سب کو پٹا کر رکھ دے گا۔ ہائے ہمیں کیا پتہ تھا کہ جلسے جلوسوں میں تقریریں کرتے کرتے اُسے بولنے کا ایسا فوبیا ہو جائے گا کہ جو منہ میں آئے گا بولتا چلا جائے گا۔ نہ سوچے گا نہ سمجھے گا۔

گروپ کی سب سے زیادہ گوری چٹی نے بات اُچکی۔''ارے میاں اب تم محلے کے کوئی غیر ذمے دار لونڈے لپاڑے تو ہو نہیں، جس کی یاوہ گوئیوں کا کوئی نوٹس نہ لے۔ جس جگہ اللہ سائیں نے تمہیں بٹھایا ہے اس کو تو دیکھو۔ اس کی نزاکت اور عظمت کا تو خیال کرو۔ اب وہ زمانہ تو نہیں ہے نا جب تم سٹیج پر چڑھ کر سیاست دانوں کے گڑھے مردے اکھاڑتے، احتساب کے نعرے لگاتے، باہر کے بینکوں سے اُن کے اثاثے لانے کی دبنگ باتیں کرتے، تالیاں پٹواتے اور بیچارے لوگوں کو اُمیدوں کے سنہرے خواب دکھاتے تھے۔

اب دو سال ہونے کو ہیں کہاں گئے وہ بلند و بانگ دعوے۔موئی مکھی نہیں آئی۔چلو چھوڑو اِس کو بھی۔ پر یہ جو تم اول فول بولتے رہتے ہو ان کا تو کوئی خیال کرو کہ تمہاری ہر بات کو پکڑا جاتا ہے۔اس کے اندر چھپے معنی یا حماقتوں پر رائے زنی ہوتی ہے۔اب اسامہ بن لادن کے ذکرِ خیر کی کوئی تک تھی کہ وہ شہید ہے یا دہشت گرد ہے۔اِس قصہ کو چھیڑنے کی ضرورت اور وہ بھی ایک ایسے وقت جب ملک اور قوم اتنے گھمبیر مسائل میں گھرے ہوئے ہوں۔

دُنیا میں پٹرول کی قیمتوں میں کمی آئی مگر یہاں پہلے ملنا بند پھر 70 روپے پھر 100 روپے۔مہنگائی اور بار برداری کا چولی دامن کا ساتھ۔تیل سستا تو چیزیں بھی سستی۔مگر یہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔آٹا مہنگا۔چینی مہنگی۔بس انسان سستا۔کرونا کا عذاب جسے سنجیدگی سے لیا ہی نہیں جا رہا۔ہر سمت موت کا خوف اور دہشت بکھری ہوئی اور تمہیں اُسامہ بن لادن سوجھ رہا ہے۔اس کی شہادت پر تم اپنا ٹھپہ لگا کر کسے خوش کرنا چاہتے تھے۔

یوں اگر تمہیں خارجہ اُمور پر بولنے کا اتنا ہی شوق ہے تو بیبا کام کی بات بولتے۔وقت کے سامنے جو چیلنج کھڑا ہے۔اس پر رائے دیتے کہ امریکہ اور پاکستان کیسے مل کر افغانستان میں امن قائم کر سکتے ہیں؟ سرمایہ کاری اور تجارت کو کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے؟ کہیں مودی کو سمجھانے بابت بات کرتے ہو۔ہمسائیوں کے گھاگ اور شاطر سیاست دان تمہاری ایسی بچگانہ باتوں پر ٹھٹھے ہی لگاتے ہوں گے۔یعنی مودی جیسے گھاگ سیاستدان کو سمجھانے چلے ہو۔

صوفی تبسم یاد آ رہا ہے۔جس کی ’’عیار بلی کو سمجھانے آئے چوہے کئی ہزار۔پر بلی نے اک بات نہ مانی روئے زار وزار۔‘‘ ہمارے پیارے اتنی سی بات نہیں سمجھتے ہو کہ غریب کی بات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔کمزور معیشت کا حامل ملک جس کا داخلی استحکام بھی

کمزور۔اس کے سربراہ کی بات کوکس نے توجہ دینی ہے۔ہانگ کانگ کی واپسی کی کہانی پڑھ لینی تھی۔

اب سیاہ سوٹ والی نے بازو بین کے سے انداز میں لہرائے اور بولی لکھواُسے لکھو ارے او مورکھ کچھ اپنے چاہنے والوں کا بھی سوچتے ہو جو بیچارے بوکھلائے پھرتے ہیں۔سُنو تمہیں پیار کرنے والے تمہاری کمپین جی جان سے چلانے والے ایک نامی گرامی شخصیت معاف کرنا جہانگیر ترین نہیں،ایک اور دل جلے نے کہا ہے۔

اللہ نے تمہیں اقتدار عزت لٹانے کو دیا ہے۔اب ذرا اُن کی بھی سُن لو جو تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔ساتھی رفیقِ کارکا تو وہ حال کہ بس نہیں چل رہا ہے کہ تمہیں کسی کھوہ کھائی میں دھکا دیں اور خود تمہاری کرسی پر وزیراعظم کا تاج پہن کر بیٹھ جائیں۔

سنہری بالوں والی اضطراری کیفیت میں جھٹکے سے اُٹھی۔پھر کرونا کے خوف کے باعث رُک گئی اور چلائی۔لکھواُسے لکھو۔تمہاری انا کا غرور اور خود پر احمقانہ تکبر تمہیں سیاسی شعور اور بلوغت ہی نہیں دے رہا ہے۔تمہاری اتحادی پارٹیوں میں بہتیرے تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔

پرویز الٰہی کو پنجاب کی وزارتِ اعلیٰ دیتے جس کی شہرت اچھے وزیراعلیٰ کی رہی ہے۔اہم تنظیمی معاملات پر اُن سے مشورے کرتے۔پر مشورے کرنا تو بڑی بات تمہیں تو کسی سے ملنا بھی پسند نہیں اور ہاں وزیروں شزیروں کا حال بھی کتنا پتلا ہے۔بیانوں پہ زور اور کاموں میں چور والی بات ہے۔

ابھی جہاز کے حادثے میں وزیرِ ہوا بازی کی باتوں کو تم نے سُنا؟ کہاں سُنا ہوگا۔پائلٹوں کے جعلی لائسنس اب بولو دُنیا میں ہمارا تماشا بن رہا ہے یا نہیں۔کوٹھے پر چڑھ کر اعلان کرنے کی ضرورت تھی۔جہاز میں شہید ہونے والے پائلٹ کے والد کا تو تیسرے

دن ہی دُکھ بھرا بیان آ گیا تھا۔ جس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تھا خدا کے لیئے میرے بیٹے کی لاش پر سیاست مت کرو۔ پھر وہ سب چپ ہو گئیں۔ آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک نے رندھی آواز میں کہا۔ کاش تم نے کچھ ہوم ورک کیا ہوتا۔ کاش تم اچھے لوگوں کا انتخاب کرتے۔ پھر کاش کاش کی کتنی ہی دُکھ بھری آوازیں تھیں۔

☆☆☆

طارق عزیز کے نام کا میوزیم بنانے کی ضرورت

پاکستان سے دیوانگی کی حدتک پیار کرنے والا پاکستان کا بیٹا، پاکستان زندہ باد کے نعرے کوحرز جان بنانے والا کس موسم میں، کن دنوں میں ہم سے جُدا ہوا۔لاہور شہر کیا پورا پنجاب املتاس کے کچے پیلے رنگے لانبے گچھوں سے بوجھل اُداسیوں اور مایوسیوں کی سوگواریوں میں لپٹا پڑا ہے۔کرونا کا عفریت شہر کی رونقوں کو نگلے ہوئے ہے۔لاہور کے بیشتر علاقے سیل ہیں۔اس کے جنازے میں تو خلقت نے امنڈ آنا تھا۔اس کے چاہنے والوں کو ہاتھ ملتے اور جنازے میں شرکت نہ کرنے پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے دیکھا اور سنا گیا۔

اس کی ذات کا کوئی ایک پہلوتھوڑی تھا۔وہ تو ہمہ جہت تھا۔پی ٹی وی کے پہلے اناؤنسر کا اعزاز اس نے اپنے نام ہی نہیں کیا بلکہ آنے والوں دنوں میں سکرین کا یہ ہیرو اپنی منفرد پہچان بنانے میں کامیاب اپنے پروگرام کے ذریعے ہر خاص و عام پاکستانی کے دل میں گھر کر چکا تھا۔اس کی آواز کی گھن گرج شعروں کے نگینوں سے سجا اس کا موہ لیتا انداز گفتگو،اس کی پھرتیاں چستیاں لوگوں سے بھرے ہال میں بس اس کا وجود سارے ماحول پر چھایا نظر آتا تھا۔نیلام گھر محض ایک پروگرام نہیں تھا یہ ایک تربیت گاہ تھی یہاں تاریخ ،جغرافیہ،سائنس،سیاست سب پڑھائے جاتے تھے۔یہ جنرل نالج کی کلاس تھی جو ہنستے ہنساتے علم کے دروازے کھولتی تھی۔

اُن زمانوں میں بھلا کونسی ایسی ادبی، سماجی یا سیاسی شخصیت تھی جو اس کے پروگرام میں نہیں گئی۔ بڑی میٹھی سی یادوں کی لام ڈور ہے جو یکے بعد دیگرے دامن دل سے لپٹی جارہی ہے۔ پہلی خوبصورت یاد نے دستک دے دی ہے۔ بیٹی بیاہنے کی عمر میں تھی۔ ایک دن میرے بھائی فون پر اپنے جاننے والے کا رشتہ بتاتے ہوئے کہتا تھا۔ لڑکی انہوں نے دیکھی ہے۔ بس اب وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ حیرت تھی میرے لہجے میں جب پوچھا کہ لڑکی انہوں نے کب اور کہاں دیکھی ہے؟ ارے بھئی کہیں آپ طارق عزیز کے نیلام گھر میں بیٹی کے ساتھ گئی ہونگی۔ بس انہوں نے دیکھا اور پسند کرلیا تھا۔ رنگت میں نے بتا دی کہ چنبیلی جیسی ہے۔ اب آپ خود سوچئے کہ ماں کے لیے سجدۂ شکر والی بات ہی تھی نا کہ ماں بیٹی ٹرالیاں سجا سجا کر پیش کرنے سے بچ گئیں۔

دوسری یاد اس کی ہم پاکستانیوں کا سر بلند کرنے والی تھی۔ اب قصہ سنئیے ذرا۔ پہلے چھٹی ملی تھی پھر تھوڑی دیر بعد ہی ہوا میں تیرتی اُس دل کش و دلربا حسینہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی تھی۔ یہ ڈاکٹر شائستہ نزہت تھی جو فون پر مجھ سے مخاطب تھی۔

''وزیراعلیٰ پنجاب جناب پرویز الٰہی بھارت کے شہر پٹیالہ میں ہونے والی ورلڈ پنجابی کانفرنس کے مہمان خصوصی ہوں گے۔ آپکا نام اُن کے ساتھ جانے والے وفد میں شامل کیا گیا ہے۔ کاغذات فوراً بھجوائیے''۔

کاغذات کی خانہ پُری مکمل ہونے پر جانے کا اذن ملا۔ اپنے اپنے اٹیچی کیسوں کو دھکیلتے ہندوستانی علاقے میں داخل ہو گئے۔ تو دیکھا طارق عزیز اور مایہ ناز کارٹونسٹ جاوید اقبال بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ طارق عزیز بھلا انہوں نے ہمیں کیا پہچاننا تھا۔

آگے بڑھ کر وفورِ شوق سے سلام داغا۔ جاوید اقبال سے بھی ہیلو ہائے ہوئی۔ مزے کی بات جگہ بھی اسی گاڑی میں ملی جن میں دونوں دوست تھے۔ اب ہماری

بونگیاں دیکھیں۔

ہائے منظروں میں کتنی اپنائیت اور یکسانیت ہے؟ ذہن تو فوراً ہی اپنے اور ہمسائے کے تقابلی جائزوں میں جُت گیا۔اب اپنے اِن احساسات میں دونوں دوستوں کو شامل کرنا بھی ضروری سمجھا۔جالندھر میں سے گزرتے ہوئے طارق عزیز سے کہتی ہوں۔آپ کی جنم بھومی بھی تو جالندھر ہے کیا محسوس کررہے ہیں؟ایک متین سی مسکراہٹ طارق عزیز کے لبوں اور آنکھوں میں بکھر جاتی ہے اور وہ جوابی حملہ کرتے ہیں۔''اپنے احساسات بارے بتایئے۔''

''سچی بتاؤں۔'' جذب بھرا لہجہ تھا میرا۔اس وقت جی چاہ رہا ہے کہ دروازہ کھول کر چھلانگ ماروں اور بھاگتی بھاگتی اُس گاؤں چلی جاؤں جسکے ہجر میں میں نے اپنی ماں اور ماسیوں کو آہیں بھرتے دیکھا تھا۔جواُنکا دیس تھا۔جنکی گفتگو کی ہر تان ''دیس'' کے ذکر پر ٹوٹتی تھی۔

طارق کھلکھلا کر ہنس پڑے۔''جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔'' ساتھ میں دو عدد شعر بھی سُننے کو ملے۔اب رات ہوگئی تھی۔رات میں پٹیالہ کا حُسن تو کیا نظر آتا۔البتہ بس میں بیٹھے لوگوں کے تبصروں نے خوب ہنسایا۔ رات کو بڑا ہنگامہ رہا۔سرکاری وفد کے دو بسو ں کے مسافروں کیلیئے تو کہیں پٹیالہ میں ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔گاڑیوں میں لدکر 69 کلومیٹر پرے چندی گڑھ جانا پڑا تھا۔راستے میں منو بھائی کی پھلجڑیاں تھیں۔شاید پی کچھ زیادہ گئے تھے۔ طارق عزیز اور اُنکے ساتھی جاوید کی گھمبیر سی خاموشی تھی۔لگتا تھا تھکاوٹ اور نیند غالب آئی ہوئی ہے۔

مقالوں کی بھرمار میں معتدل سوچ رکھنے والے کلدیپ نائر کی طرف سے جو تجاویز پیش ہوئیں وہ فی الوقع بڑی جامع اور قابلِ عمل تھیں۔پٹیالہ یونیورسٹی کے سینئر

پروفیسر مانک میاں نے اپنی تقریر میں سب ایشوز پر بات چیت کرنے پر زور دیا۔ پوربی پنجاب اپنے کلچر میں کس قدر امیر ہے۔ اسکا اندازہ اُس شام ہوا جب لڑکیوں نے گِدّا ڈالا۔ سُچا، سچا اور کھرا روایتی گِدّا، پاؤں کی مخصوص بیٹ اور سٹائل آواز کا کھرج، تالی کا ردّھم اور مکمل روایتی کاسٹیوم۔ ہمارے گاؤں میں اب یہ سب نظر نہیں آتا۔ بیچارے سادہ لوح دیہاتیوں کی سوچیں مشرف بہ اسلام ہوگئی ہیں۔

بھنگڑے، راجستھانی رقص اور کتھک ناچ سبھوں نے دل خوش کیا۔ سب سے بڑھ کر ہنس راج ہنس کے خوبصورت گانوں اور نصرت فتح علی خان کے حضور انکا نذرانہ عقیدت۔ سبھی کچھ اچھا تھا۔ وائس چانسلر سے لے کر پروفیسروں اور طلبہ و طالبات کے رویّے اور شاندار کلچرل شو۔ بس اگر کچھ کھٹکا تھا تو وہ باتیں تھیں جو سرِ عام ہوئیں۔

پنجاب کی ڈپٹی وزیر اعلیٰ میڈم بٹھل سے لے کر بعض ذمہ دار لوگوں کی باتوں کہ جنہیں لکیر کے کھینچنے کا دُکھ تھا۔ روایات اور رہتل کے ایک ہونے اور ایک ویہڑے کے دو ویہڑے ہو جانے کا قلق تھا۔ کچھ ایسی تجاویز، کچھ ایسی باتیں کہ یہ پھر دوسے ایک ہو جائیں۔ ہمارے جیسے لوگوں کیلئے جنگی شعور کی آنکھ آزاد فضاؤں میں کُھلی تھی بڑی تکلیف دہ تھیں۔

اگلی شام طارق عزیز کا خطاب تھا۔ پاکستان کے نمائندے نے اپنی پاکستانیت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے جذبات کو بہت خوبصورتی اور حُسن دیا۔ وہ بول رہے تھے۔ اِس درجہ دل پذیر۔ انداز بیان کہ محاورے کی زبان میں وہ سماں کہ سوئی گرے تو آواز آئے والے ماحول کی کیفیت تھی۔ میں پوربی پنجاب کے کلچر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ مگر کلچر کا تعلق زمین اور رہتل کی ایک جیسی بے شمار چیزوں کی مماثلت کے ساتھ ہی نہیں جڑا ہوتا۔ مذہب جیسا اہم فیکٹر بھی اس پر اثر انداز ہوتا ہے۔ دونوں حصوں کے کلچر کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بات ہمارے مدّنظر ہونی چاہیے۔ تاہم ہمیں اپنے ثقافتی ورثے کو محفوظ کرنے کی اشد ضرورت

ہے جواب معدوم ہوتا جا رہا ہے۔

یورپ کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے کہا۔جنگیں مسائل کا حل نہیں ۔ چھوٹے چھوٹے ملک ایک دوسرے سے جڑے ہوئے کس سرعت سے ترقی کی منزلیں طے کر گئے ہیں ۔اور ہم ہیں کہ ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچ رہے ہیں ۔ایک دوسرے کو مان لینے میں ہی ہماری عافیت اور نجات ہے۔آیئے ایک دوسرے کو احترام دیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھیں ۔

جذبائیت کے بہاؤ میں مجمع کو بہالے جانے کا فن انہیں فطرت نے وویعت کیا تھا جس کے وہ شہنشاہ تھے مگر اس شام ان کی اس خوبی کے ساتھ سیاسی شعور، دلائل اور دنیا کے حوالوں سے باتوں نے وہ سماں باندھا کہ جس کے لیے کہا جاتا ہے فلاں نے میلہ لوٹ لیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اس شام کا میلہ انہوں نے لوٹا تھا۔اجنبی دھرتی پر۔

ہال میں انہیں سُنتے ہوئے ہماری آنکھیں بھیگ رہی تھیں انہوں نے ہمارے وسوسوں، اندیشوں پر مرہم کے پھاہے رکھ دیئے تھے۔ہم کھل اٹھے تھے۔ہم نے بے اختیار کہا تھا۔

’’طارق عزیز،ہمیں آپ پر فخر ہے۔‘‘

پاکستان کے بیٹے نے پاکستان کو وہ سب کچھ لوٹا دیا ہے جو اُسے ملا تھا۔اب یہ پاکستان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے امر کر دے۔

اس کے نام کا میوزیم بنانے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

ابن عربی، اسلامی تھیالوجی کا مستند نام

اس تحریر کو لکھنے کا محرک حسن نثار کا، 16 جون کا کالم ہے۔ اُن کے قارئین اُن سے ابنِ عربی کے بارے کچھ جاننے کے خواہش مند تھے۔ ''ارے'' خود سے کہا میں تو اُس عظیم ہستی کے مزار پر حاضری کی سعادت حاصل کئے بیٹھی ہوں۔ کیوں نہ اپنے ''ہم سب'' کے قارئین کو تھوڑی سی سیر اور تھوڑی سی معلومات دوں۔

شام میں پندرہ دن گزارنے کے بعد عراق جانے سے ایک دن پہلے جبل قاسیون Mount Qassyoun جانے کا پروگرام فائنل ہوا تھا۔ جبل قاسیون کو جب جب میں نے دمشق میں چلتے پھرتے دیکھا۔ مجھے تو پہاڑ پر کہیں ٹھہرے ہوئے اور کہیں متحرک کئی منظر نظر آتے تھے۔ اب اللہ جانے یہ سراب تھے یا حقیقی۔ بہر حال ایک منظر تو بڑا واضح ہو کر کئی بار آنکھوں کے سامنے آیا تھا۔ سفید عمارت، سادہ سی کھڑکیوں اور سبز چھت کے ساتھ نظر آتی تھی۔

پہلی بار اس منظر کے نظر آنے پر میں نے قریب سے گزرنے والے ایک پڑھے لکھے اور سمجھداری کی کسوٹی پر پورا اُترنے والے شخص کو بلا تکلف روک لیا تھا۔ ادھیڑ عمری کے

پیٹے میں مرد نے رک کر صاف ستھری انگریزی میں بتایا تھا کہ یہ محی الدین ابن عربی کا مزار مبارک ہے۔ایک اور نے یہ بتایا تھا کہ اسی پہاڑ پر وہ مقام بھی ہے جہاں دنیا کا پہلا جرم ہوا تھا۔قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔جاتے جاتے اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہاں کچھ اور بھی یادگاریں ہیں۔اگر گئیں تو وہ سب دیکھ لیں۔ٹیکسی والے کے تین ہزار سیرین لیرا کے مطالبے پر میں چیخی۔

لڑکے نے دونوں ہاتھ فضا میں دائیں بائیں لہرائے۔پہلے ابن عربی اص صلاحیہ As Salhiyyah، پھر قاسیون اور پھر یادگار۔اُس نے دونوں بازووں کا دائرہ سا بناتے ہوئے بہت سا سفر، پہاڑی سفر کا مفہوم کچھ بے ربط سے جملوں اور کچھ تمثیلی انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی۔یقیناً وہ اس میں کامیاب ہوا کہ ہم بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اتنی جگہیں۔پیسے بہت مناسب اور کمی بالکل نہیں۔

منت طرلوں سے 2500 سیرین لیرا پر فائنل ہوا۔اس نے پھر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ پہلے وہ صلاحیہ کو اٹر جائے گا۔صلاحیہ کواٹر کے بعض حصے بہت خوبصورت، ماڈرن اور شاندار تھے۔ہاں البتہ بعض قدرے ماٹھے تھے۔یہاں صدیوں پہلے وہ لوگ آباد ہوئے جو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کے ظلم وستم سے پناہ ڈھونڈتے یہاں آئے۔پہاڑیوں کے دامنوں اور اس کی ڈھلانوں پر کہیں چھوٹے موٹے گھروں اور کہیں خیموں کی صورت پھیلتے اور آباد ہوتے چلے گئے۔ان کا زیادہ پھیلاؤ دریائے Tora کے ساتھ ساتھ ہوا جو دراصل دریائے برادہ کی ہی ایک شاخ تھی۔

آنے والے وقتوں کی دہائیوں میں وہ کُرد جنگجو بھی جو صلاح الدین کے ساتھ آئے تھے۔یہی کوئی بارہویں صدی میں وہ بھی یہیں سکونت پذیر ہوگئے۔یوں اِسے کچھ لوگ کردوں کا علاقہ بھی کہتے ہیں۔المہاجرین بھی اسی کا نام ہے۔دھیرے دھیرے

مسجدیں، مدرسے، اسپتال اور بہت سی شاندار عمارات بنتی چلی گئیں اور یوں یہ دمشق کا ہی ایک حصّہ شمار ہونے لگا۔

لڑکا اچھا ڈرائیور تھا۔تنگ تنگ گلیوں میں سے بھی گاڑی کو لہراتا ہوا نکال کر لے جاتا۔بعض جگہوں کے منظر نظروں پر بڑے گراں گزرتے تھے کہ بے ڈھبے سے مکان، تنگ گلیاں، ان میں بہتی نالیاں، دوڑتے بھاگتے پھرتے بچے۔گلیوں میں ہی کریانے، پنساری کی دکانیں اُن میں خریداری کرتے نچلے متوسط طبقے کے لوگ۔گاڑی رُکی اور پتہ چلا کہ مزار تک پیدل جانا ہوگا۔من وعن وہی درباروں والا منظر تھا۔جب میں دائیں بائیں دیکھتے ہوئے راستے پر آگے بڑھتی تھی۔اپنے وقت کا، اپنے بعد آنے والے وقتوں کا بہت بڑا عالم بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔میں اُن کی کتاب زندگی کے ورق پلٹتی تھی۔

شیخ محی الدین ابن عربی کی آبائی جگہ مرسیاMursiya، سپین کا ایک علاقہ تھی۔سن پیدائش یہی کوئی 1165ء اور وفات 1240ء کی ہے۔والد مرسیہ کے دربار سے جڑے ہوئے تھے۔ ماموں اپنے وقت کے جید عالم تھے۔سلطنت معاویہ کا دربار عالموں، مفکروں، فلسفیوں اور صاحب کمال وفن کے لوگوں سے بھرا رہتا تھا۔ابتدائی تعلیم تو مرسیہ میں ہوئی۔ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق بچپن ہی سے بہت نمایاں تھے۔ آٹھ سال کی عمر میں اشبلیہ نقل مکانی ہوئی۔وہاں کے علمی اور ادبی ماحول میں تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔اس وقت اُندلس یورپی اثر کے تحت اندرونی مقامی سیاست میں بہت بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔اس کے باوجود اندلس علم وادب اور فکری تحریکوں کا مرکز تھا۔

جوان ہوئے تو شہروں اور ملکوں ملکوں پھرنا اور صاحب علم لوگوں سے ملنا شروع کردیا۔سینتیس 37 سال میں حج کیا۔پھر نہ اُندلس گئے اور نہ مراکش۔کچھ وقت میسوپوٹیمیا اور ایشیائے کوچک میں گزارا۔ رجعت پسند عالموں نے ان کی روشن خیالی کی بہت

مذمت کی۔قاہرہ میں بھی اُن کے نظریات وخیالات کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔نکالے جانے پر اصرار تھا۔ساٹھ سال کی عمر میں وہ دمشق آئے اور پھر یہیں انہوں نے ڈیرے لگا لئے۔

اپنے وقت کے ابنِ عربی جو اسلامی تھیالوجی (Theology) پر ایک اتھارٹی کی سی حیثیت رکھتے تھے۔یہ شخصیت اپنے عہد کے دانشور،فلاسفر،لکھاری،مذہبی رہنما،صوفی شخصیت اور سائنس دان تھے۔اِس وقت کی پوری اسلامی دنیا میں وہ زیر بحث تھے۔کچھ سائنس دانوں کو ان کے مابعدطبیعاتی Metaphysical نظریات سے اختلاف تھا۔کچھ حامی تھے۔کچھ کا خیال تھا کہ وہ اسلام کے عظیم ترین فلاسفر ہیں۔کچھ کا خیال اُن کے دہریے ہونے پر تھا۔کچھ اور کا کہنا تھا کہ اُن کی فکری سوچ اور تحریر کی تحریک دراصل خدائی تحفہ ہے۔صوفی ازم اُن کے خیال میں ذہنی پریشانی کا واحد علاج ہے۔فلاسفی شک کی طرف لے جاتی ہے۔ابہام پیدا کرتی ہے۔مگر خدا سے براہ راست رابطہ ہی روح کوسکون دیتا ہے۔

انہوں نے اپنے اِس نظریئے پر بہت سی کتابیں لکھیں۔دنیا کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں کتابیں اور مضامین اُن کی زندگی،اُن کی کتابوں،اُن کے افکار وخیالات پر لکھے گئے۔یہ کام زیادہ عربی،انگریزی،جرمن،سپینش،فرنچ اور فارسی میں ہوا۔بہت سے ماہر شرقیات اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ابن عربی کی تحریروں نے بہت سے فلاسفروں،دانشوروں اور صاحب علم لوگوں کو متاثر کیا جیسے ریمنڈ لولیو Raymond Loleo اور دانتے۔دانتے کی ڈیوائن کومیڈی کے بارے تو یہ تاثر بھی ہے کہ وہ اُن سے بہت متاثر ہے۔جاپانی ماہر شرقیات Ezotsu کا کہنا ہے کہ Taoism فلاسفی،صوفی ازم اور تصوف کے میدانوں میں ابن عربی سے بہت متاثر ہے۔

میں نے کتاب بند کر دی تھی کہ زندہ کھلی کتاب کے سامنے اُسے پڑھنے اور دیکھنے کے مقام پر تھی۔ڈرائیور کو میں نے کہتے سُنا تھا کہ قاسیون کا پہاڑی سلسلہ بس یہیں سے

شروع ہو جاتا ہے۔ زائرین کی بہتات اور وہی مخصوص ماحول جو صوفیائے کرام کے درباروں اور مزاروں کا خاصہ ہوتا ہے اپنی پوری رنگینیوں سے یہاں کارفرما تھا۔ملحقہ مسجد بہت خوبصورت، خاص طور پر مینار کی کندہ کاری نظروں کو کھینچتی تھی۔مزار سطح زمین سے نیچے ہے۔کئی پوڑے اُتر کر جانا پڑا تھا۔جب زینہ اُترتی تھی تو سامنے دیوار میں پتھر پر کندہ شعر نے روک لیا تھا۔میں نے کاپی کھول کر اس میں درج کیا۔

فلکل واحد یسموبه　　　وانا الباقی العصر ذاک الواحد

اندر کا منظر بہت خوبصورت تھا۔شیشے میں مقید مزار مبارک اپنی رعنائیاں بکھیر رہا تھا۔قیمتی قالین بچھے تھے۔فانوسوں کی روشنی ماحول کو جگمگ جگمگ بناتی تھی۔نم آنکھوں سے اٹھے ہوئے بے شمار ہاتھوں میں ہمارے ہاتھ اور آنکھوں میں اُتری نمی بھی اس ماحول میں شامل ہوگئی تھی۔آپ کے پہلو میں آپ کے دو بیٹے سعید الدین وعمادالدین کے مزار ہیں۔عقبی سمت میں کچھ قبریں ہیں۔ملحقہ دروازے دوسرے کمروں میں کھلتے ہیں۔کہتے ہیں کہ جب آبادی کا پھیلاؤ ہوا تو مزار کہیں ملبے کے نیچے آ گیا۔یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ آپ کی پیشن گوئی تھی کہ جب سین شین میں داخل ہوگا تب محی الدین کی قبر ظاہر ہوگی۔روایت ہے کہ جب عثمانی سلطان سلیم نے شام فتح کیا۔یعنی سلیم کا سین شام کے شین میں داخل ہوا تو اس نے آپ کے مقبرے کے مقام پر کسی عمارت کے لئیے کھدائی کروائی تو لوح مزار نکل آئی۔ہم نے نفل پڑھے۔فاتحہ خوانی کی۔مدرسہ بھی دیکھا۔پتہ نہیں کتنے لاکھوں ذہنوں کی سیرابی ہوئی۔یہاں بھی نفل پڑھے اور باہر آ گئے۔مجاوروں نے مت مار دی تھی۔نسرین کے پاس ٹوٹی ریز گاری تھی۔وہی دے کر جان چھڑائی۔

☆☆☆

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی قبر محفوظ ہے

کیا کروں کوئی ایک سیاپا ہے۔کوئی ایک رنڈی رونا ہے۔جدھر دیکھتی ہوں ادھر کرونا کی آگ ہے جو ہر گھر کے اندر داخل ہوگئی ہے۔اسپتالوں کے حالات کا کیا ذکر کروں اب جلنا،کڑھنااوراپنا خون آپ پیناوالا معاملہ ہے۔ٹی وی چینلز نے اِس قوم کو پاگل کر دینا ہے۔فضول لا یعنی خبروں کو اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو سات آٹھ بار دہرانا لازمی ہے۔ذرا دیکھیئے اور سر دُھنیے۔شہروز سبزواری نے بالآخر ماڈل صدف کنول سے نکاح کرلیا۔ کتنا بڑا کام؟ پہلی شادی کی خبر،طلاق کا ذکر۔ایک بار دو بار دل پر پتھر آنکھوں پر جبر کر کے گنتی کی۔سات بار۔ہائے جی چاہتا تھا اختیار میں ہوتو لترّوں سے وہ ٹھکائی کروں کہ نانی یاد آجائے۔نواز شریف ریسٹورنٹ میں خواتین کے ساتھ چائے پیتے دیکھے گئے۔پورے چھ بار،ایک بوریت کن تسلسل کے ساتھ۔نواز شریف اپنے بیٹے حسن کے ساتھ واک کررہے ہیں۔تو بھئی ہم شادیانے بجائیں۔آخر کیا کریں۔

ماسک پہننے پرعوام کو تاکید،نہ پہننے پر جُرمانے کی نوید۔میرے خود پسند،انا پرست اور سر پھرے خان کو تو دیکھو۔ملک کے فوجی سربراہ اور غالباً اس کے آئی ایس آئی کے درمیان کِس شان سے کھڑا ہے۔دونوں فوجیوں کے منہ پر ماسک ہے اور یہ ہمارا احمق ، دلیر اور شجاع لیڈر بغیر ماسک کے گویا اس حکم نامے کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔پتہ نہیں کیا چاہتا ہے؟سمجھ سے قاصر ہے۔اب میں کیا کروں۔کرونا کا ’’ک‘‘ اڑاتی ہوں تو باقی رونا رہ گیا ہے۔کچھ ذاتی معاملات میں کچھ قومی معاملات میں۔

چلو ذات اور ملک کے دکھ پر رونا تو کچھ سمجھ میں آتا ہے پر یہ مسلم امہ کی بے حسی، اُن کے حکمرانوں کی وحشت و بربریت پر جلنے کڑھنے اور رونے کا ٹھیکہ بھی ہم نے از خود ہی لے لیا ہے۔ 27 مئی کو عمر بن عبدالعزیزؒ جیسی عظیم ہستی کے مزار مبارک کی بے توقیری کی خبر میڈیا پر گردش کر رہی تھی اور ہم جھوٹے سچے مسلمانوں کے دلوں پر چاقو چھریاں چل رہی تھیں۔ ایک دوسرے پر الزام تراشیوں کے سلسلے شروع تھے۔ کسی نے تبصرہ کیا سیرین ملیشا اس کارِ عظیم کے عوض ثواب کمانے کے لیئے بڑی مضطرب تھی۔ ایران کی بھی بڑی ہلا شیری تھی۔ اتنے خون خرابے کے بعد بھی بشار کی انا کا بت ویسے ہی تنا کھڑا ہے۔ کہیں اس کی سوچ میں کوئی مثبت تبدیلی کچھ بھی نہیں۔ فروری میں بھی علاقے کو تاراج کرنے کی کوشش ہوئی۔ کمبختو کچھ تو سوچو۔ اس گندی اور ظالم جنگ نے اگر کسی کو نقصان پہنچایا تو وہ اپنے لوگ شامی ہی تھے نا۔ پر کچھ تو اپنوں اور کچھ کرائے کے ٹٹوؤں نے طلائی سکوں کے عوض دین کی ٹھیکیداری شروع کر دی۔ علوی، دروز، کرد، آسیری سب شامی ہونے کے باوجود کافر تھے۔ گولیوں سے بھونے جانے کے قابل۔ یہ بھی نہ سوچا کہ ملک دنیا بھر میں اپنے قابلِ فخر تاریخی ورثہ کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ توڑ دو، پھوڑ دو، جلا دو، مسمار کر دو یہی نعرے انہی پر کام۔

ڈاکٹر ہدیٰ کو میل کی کہ اس سے صورتِ حال جانوں۔ ڈاکٹر ہدیٰ کا تعلق حلب سے ہے۔ وہ میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ حلب کی ہیومن رائٹس کی سرگرم رکن بھی تھیں۔ میری اُن سے ملاقات دمشق میں اعظم پیلس میں ہوئی تھی۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا۔ ڈھیروں باتیں کیں۔ شام کی خانہ جنگی کے دوران ڈاکٹر ہدیٰ، دمشق یونیورسٹی کے ڈاکٹر زکریا، ابوفاضل اور چند دیگر لوگوں سے مسلسل رابطہ رہا تھا۔ شام کا جنگ کے دنوں کا چہرہ میں نے انہی لوگوں کی وساطت سے دیکھا تھا۔ میں نے ہدیٰ کو برقی تار بھیجی۔

پر ہوا یوں کہ بیچ میں آصف فرخی نے اپنا رونا ڈال دیا۔ تین دن تک تو طبیعت ہی درست نہ ہوئی۔

دراصل شام کی سیاحت کے دوران میں نے ادلب کو بھی دیکھا۔ مرکزی شاہراہ سے کچھ ہٹ کر پہاڑیوں میں گھرا ہرا بھرا بحیرہ روم کی ہواؤں میں لپٹا۔ کیا بات تھی شہر کی اتنا خوبصورت کہ جتنا جھوٹ بول لو۔ سارے شام کو دانہ دُنکا دینے کا اعزاز اپنے کاندھوں پر اُٹھائے ہوئے۔ مرۃ النعمان کچھ ہی دور تھا۔ یہاں ابوالعلا المعری جیسا بے مثال شاعر ایک عظیم مفکر اور فلاسفر جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ دانتے نے ڈیوائن کومیڈی المعرٰی کی ''رسالتہ الغفران'' سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ شہر شاعر سے محبت کرتا محسوس ہوتا تھا کہ ہر خوبصورت جگہ اور پارکوں میں رومن آرٹ کے شاہکار پیڈسٹلوں پر سجے اس کے مجسمے نظر آتے تھے۔ بلا سے وہ مرتد تھا، ملحد تھا، مگر علم و آگہی کا پیکر تھا۔ اس کی سوچ اور فکر اپنے وقت سے صدیوں آگے تھی۔ وہ دسویں گیارھویں صدی کا شاعر نہیں بیسوں اکسویں صدی کا شاعر تھا۔ مگر شام کی خانہ جنگی میں چھوٹے ذہنوں نے اس کا بڑا ذہن توڑ دیا تھا اور یہی کچھ اب ہو رہا ہے

ڈاکٹر ہدیٰ لکھتی ہیں۔......

فرقہ واریت، تنگ نظری اور تعصب کا زہر تو اب شام اور مشرقِ وسطیٰ میں کیا پوری دنیا میں پھیلا نظر آتا ہے۔ ملک کے دونوں بڑے فرقوں کی انتہا پسند قوتیں کچھ زیرِ زمیں اور کچھ بظاہر تھوڑا کھلی، تھوڑا ڈھنپی طرز پر سرگرم عمل ہیں۔ فروری کے اوائل میں بھی مراۃ النعمان اور دیر شرقی کے گرد ونواح میں بربریت کا مظاہرہ ہوا تھا۔ ترکی، ایران اور دیگر بیرونی طاقتیں سب کے ایجنٹ کام کر رہے ہیں۔ حادثے کی خبر سب سے پہلے ترکی نے ہی دی۔ بعد میں الجزیرہ نے نشر کی۔ حکومت نے احتجاج کیا۔ سیرئین ملیشیاء کو باغیوں اور

شر پسندوں کی سرکوبی کے طور پر ڈھانپا گیا۔ یہ امر بہرحال باعثِ اطمینان ہے کہ یہ برگزیدہ ہستی دونوں فرقوں کے لیے متنازعہ نہیں ۔مگر ہمسایوں کی سیاستیں اور خود حکمران کی حماقتیں ان کا کیا رونا روئیں؟ ۔متضاد خبریں ہیں۔حکومتی سطح پر تردید اور اندر خانے سنگین صورت ۔ ترکی تو گویا شام کی حکومت کی جڑیں کاٹنے کو ادھار کھائے بیٹھا ہے۔نصرہ الفرنٹ اور کچھ دہشت گرد ٹولوں کی کاروائی جان پڑتی ہے۔گردونواح اور مقبرے کی بیرونی دیوار کو نقصان پہنچنے کی خبریں ہیں۔تاہم مقبرہ محفوظ ہے۔

☆☆☆

”ناں! آصف مسکرانے پر تمہارا کچھ خرچ ہوتا ہے“

اپنی اب تک کی زندگی میں ایسا وقت تو کبھی نہیں آیا تھا جب ہر صبح آنکھ کھلنے کے ساتھ ایک اندوہناک سے دکھ، مایوسی، ناامیدی اور خوف کی لہریں سارے شریر میں سرتا پیر دوڑنے لگتی ہوں۔ صبح صادق کی سپیدی بدترین حالات میں بھی اکثر امید کا پیغام ہی دیتی ہے۔ یکم جون کی رات کوئی تین بجے آنکھ کھل گئی۔ رات کے اس پہر کی اذیت کو کم کرنے کے لیے موبائل کھولا۔ جیسے کلیجے پر گھونسہ پڑا۔ آصف فرخی کے دنیا سے چلے جانے کی خبر تھی۔ ”نہیں نہیں نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کے کون سے مرنے کے دن تھے۔ ہم جیسے بوڑھے لوگ بیٹھے ہیں۔“ اب اضطراری حالت میں حمید شاہد کی پوسٹ پر لکھ رہی ہوں۔ ”حمید یہ کیسے ہوا؟“ سعدیہ قریشی سے پوچھ رہی ہوں۔

اتنا متحرک، ادب کی مایہ ناز لیجنڈری شخصیت جس کا اوڑھنا بچھونا ادب تھا۔ دنیا کے بہترین ادب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے والا ادیب، افسانہ نگار، مترجم، دنیا زاد جیسے منفرد اور اعلیٰ معیار کے ادبی پرچے کا مدیر اور شہر زاد جیسے ادارے کا پبلیشر، ادبی میلے سجانے والا، انگریزی کا کالم نگار۔ اس کی ذات کے بے شمار پہلو اور ہر پہلو میں وہ کم وبیش بہترین۔

ڈان کے ادبی میگزین Books and Authors کے صفحات اس کی خوبصورت تحریروں سے سجے ہوتے۔ ڈان میں چار لوگوں کو پڑھنا میرے لیے اتوار کے دن ناشتے کی طرح ہی ضروری ہوتا۔ اُردشیر کاوس جی، سیرل المیڈا، انتظار حسین اور آصف فرخی۔

یکم جون کی اِس رات کو میرے لیے سونا دشوار ہو گیا تھا۔ خود سے پوچھتی تھی میں کِس سے اس کی ناگہانی موت کی بات کروں۔ کشور ناہید سے، فاطمہ حسن سے، زاہدہ حنا سے، حمید شاہد سے۔ فجر کی اذان ہوئی اور جیسے ضبط تو قابو سے باہر ہو گیا۔

کچھ ہی پہلے کا ملنا یاد آیا تھا۔ وہ کمزور لگتا تھا۔ شیشوں کے عقب سے جھانکتی آنکھوں اور ہونٹوں پر سناٹا سا تھا۔ خیر سنجیدہ تو وہ ہمیشہ ہی رہتا تھا۔ پر جانے اس دن کیا ہوا جب وہ نیلم اور مجھ سے ملنے ہمارے پاس آیا۔ علیک سلیک اور خیر و عافیت جیسے رسمی جملوں کے بعد مجھ سے رہا نہ گیا۔ ''آصف خدا کے لیے مسکرایا کر، ہنسا کر ناں اس پر تمہارا کچھ خرچ ہوتا ہے۔'' اور وہ مسکرایا۔ ہمارے ساتھ بیٹھا خوب باتیں کیں اور ہم نے تصویریں بنائیں۔

انتظار حسین سے بڑی گہری محبت اور عقیدت کے ساتھ پسرانہ قسم کی گہری انسیت بھی تھی۔ اُن کی وفات پر رشتہ داروں نے میت فوراً شاہ جمال والی امام بارگاہ میں رکھ دی۔ صبح کے کوئی نو بجے جب میں گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ کونے میں مجھے آصف فرخی تنہا خاموش کھڑا نظر آیا۔ فاصلے پر اصغر ندیم سید کھڑے تھے۔ ایک دو اور لوگ تھے۔ اصغر ندیم سید سے ملنے کے بعد میں آصف کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ گہرے دکھ اور یاس کی چادر میں لپٹا ہوا یوں جیسے اُس کا قیمتی اثاثہ کوئی لُوٹ کر لے جائے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے علیحدگی بھی اس کے لیے ایک گہرا جذباتی صدمہ تھا۔ جس ادارے کو اس نے بہت نایاب قسم کی کتابوں کے تحفے دیئے۔ اس نامی گرامی ادارے کو ادب نواز ہونے کا ٹائیٹل دلوانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُس سے یوں آناً فاناً علیحدگی سوہان روح تھی۔

پر ایک اور محاذ پر وہ بڑا گھائل تھا۔ یہ اس کی ذات کا اس کے اندر کا محاذ تھا۔ پتہ نہیں بڑے اور جنونی لکھاریوں کی بیویوں کو یہ آگاہی کیوں نہیں ہوتی ہے کہ وہ جن کے لڑ لگی

ہیں وہ عام لوگ نہیں ہیں۔منفرد اور خاص ہیں۔کچھ کام لینے ہیں قدرت نے اُن سے۔بلاشبہ اُن کے ساتھ بشری کمزوریاں بھی جڑی ہوئی ہیں۔تاہم دل کو بڑا اور ظرف کو اعلیٰ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔پشت پر تعاون دینے والا ہاتھ اور گھر کا سکون اہم ہے جو انہیں بکھرنے نہ دے۔بیشتر بڑے لکھنے والے کم عمری میں دنیا سے چلے گئے۔اُن کی موت کے بڑے اور اہم عوامل میں یا محبوبہ تھی یا بیوی۔

دنیا زاد اس کا وہ عشق تھا جس کے معیار پر وہ کبھی سمجھوتا نہیں کرتا تھا۔جسے منفرد بنانے میں وہ عالمی اور ملکی سطح کے سیاسی اور سماجی نوعیت کے اہم اور حساس معاملات پر دنیا بھر کے ادیبوں کو اپنے پرچے میں اکٹھا کر لیتا تھا۔اِس کتابی سلسلے کا ایک نمبر ہی نہیں کبھی کبھی دو دو نمبر نکال کر انہیں تاریخی اور ادبی دستاویز بناتا۔اس کا یہ کام کسی معرکے سے کم نہیں تھا۔

سالوں پہلے یاد پڑتا ہے اس کا پہلا فون شمال کے شورش زدہ علاقوں بارے میری کوئی لکھی گئی کہانی بارے تھا۔میں نے اُسے بتایا تھا کہ کہانیاں چار پانچ ہیں تو سہی مگر وہ امن کے دنوں کی ہیں۔اُن کی تہذیبی و تمدنی اور علاقائی مسائل کے پس منظر کو ابھارتی ہوئی۔

اُس کی تنقیدی آنکھ میں بلا کی وسعت تھی۔روس کے سفرنامے کا ایک باب پیٹرز برگ کا موتی ''پیٹر ہاف'' بھیجا۔اب فون پر سوال جواب۔یہ کیا بھیجا ہے آپ نے۔کیوں کیا ہوا؟ فنون میں چھپنے والا آپ کا ہر سفرنامہ پڑھنا میرے لیے ضروری ہے۔آپ کے اِس مضمون میں عمارت کا حسن اور فطرت کا حسن تو بہت ہے مگر انسان کہاں ہیں؟ میں جیسے سناٹے میں آگئی۔اس نے کتنے اہم نکتے کی طرف اشارہ کیا تھا۔اس کا ایک لائن کا یہ جملہ مستقبل میں میرے لیے ہمیشہ راہنما بنا۔

شام کی خانہ جنگی شاعری کے کے لیے رنگ و آہن کے آئینے میں ایک طویل مضمون تھا جسے اس نے نہ صرف چھاپا بلکہ تعریف بھی بہت کی۔

اسپین سے واپس آئی تو سپینش شاعر گارشیا لورکا کی شاعری اور شخصیت نے اتنا متاثر کیا کہ اس پر تفصیلی کام کیا۔ دنیا زاد کو بھیج دیا۔ مضمون آدھا چھاپا شاعری والا حصّہ اڑ گیا۔ پوچھا تو سُننے کو ملا۔ دراصل شاعری والا حصّہ کمزور ہے،'' آصف شاعری کے اس ترجمے کو انتظار صاحب نے دیکھا اور بہت پسند کیا ہے۔ ترجمے میں میرا گرو بورس پاسترنک ہے جو نفسِ مضمون کا رس نکالتا اور پھوک چھوڑ دیتا ہے۔''

دراصل ہمارے درمیان ایک وقت ایسا بھی آ گیا تھا جب تعلقات میں کھچاؤ اور لاتعلقی کا عنصر آ گیا۔ وجہ بس چھوٹی سی غلط فہمی ہی تھی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا کبھی مجھے پسند نہیں رہا۔ میں نے بھی کچھ توجہ نہ کی اور نہ ہی صفائیاں دینے کی کوشش کی۔

کچھ ماہ سے میرے اندر جیسے ایک خلش سی تھی کہ اِس بار جب وہ لاہور آئے گا تو اُس سے کھل کر بات کروں گی۔ مجھے تو اپنی زندگی کے لالے تھے اور جانتی نہیں تھی کہ گنگا الٹی بہہ نکلے گی۔

آصف تم تو ہمارے بیٹے جیسے تھے۔ تمہارے جانے کے ابھی دن نہیں تھے۔'' کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور'' والی بات مجھے نہیں کہنی۔ یہاں مجبوری ہے۔ جس کا اسٹیشن آ گیا اُسے تو ہر صورت اترنا ہی اُترنا ہے۔ بس دعائیں اور ڈھیروں دعائیں اور پیار تمہارے لیے۔

☆☆☆

نیپلز سے خط،

Great People to Fly With

ایک اور المناک حادثہ۔ کتنے اور ستم میرے دیس میری اِس نیم بسمل جسم و جان پر۔ وہ بھی کِس کمال کا تخلیق کار تھا۔ وہی عمر قریشی، جس نے اسے Great people to fly with کا سلوگن دیا اور وہ بھی کیا عظیم مسافر تھی اپنے وقت کی ورلڈ کورٹ سوسائٹی کی جان، سپر پاور کی خاتون اول جیکولین کینڈی جس نے اس میں سفر کیا اور اختتام سفر پر پائلٹ اور عملے کو گلے لگا کر اِس سلوگن پر اپنی مہر ثبت کی۔ یہ کتنا بڑا اعزاز تھا۔

ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا۔ نوے کی دہائی کی نامور انگریزی کی جرنلسٹ زرقا بشیر نے مایہ ناز کینسر سپیلشٹ پاکستانی ڈاکٹر طارق شفیع کی لندن میں کرونا سے موت کی اطلاع دی تھی۔ ڈاکٹر طارق بہت خوبصورت لکھاری اور ہماری دوست بیگم ممتاز شفیع کے صاحب زادے تھے۔

آج مسینجر پر زرقا کا نوحہ پھر میرے آنسوؤں کا امتحان لے رہا تھا۔

سلمٰی آپا خالد شیر دل میرے میاں احمد کے بیچ میٹ ہی نہیں بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ بہترین انسان اور بہترین افسر۔ اِس جہاز میں میرے بیٹے کا نوجوان دوست بھی عید منانے گھر جا رہا تھا۔ اِس میں ہمارے بہت قریبی دوست گھرانے کے بچے بھی تھے جو لندن میں قرنطینہ گزارتے ہوئے تنگ آئے پڑے تھے۔ باپ پاکستان میں تھا۔ اس کے بلاوے پر عزیزوں کے ساتھ عید منانے آگئے۔ کراچی کی ڈائریکٹ فلائٹ نہ ملنے پر پہلے

لاہور اُترے اور اب اِس فلائٹ سے کراچی جا رہے تھے۔

دل کیسا اجڑا اجڑا سا تھا۔ ان باکس کو بھی ایسے ہی کھول لیا۔ پتہ ہوتا تو نہ کھولتی۔

نیپلز سے آیا ہوا خط منتظر تھا۔ مسٹر ایڈمنڈ وکا۔ آپ کے طیارے کے حادثے کی خبر دیکھ کر میں بہت دکھی ہوا ہوں۔ کیا بات ہے؟ آپ کی اس ایرلائن میں بہت حادثے نہیں ہونے لگے ہیں؟ کیا اِس کا اب وہ معیار نہیں رہا؟ دراصل میں نے پاکستان میں بہت اچھا وقت گزارا ہے۔ شاید اسی لیے اِس ملک سے متعلق ہر چھوٹی بڑی خبر ہمیشہ میری نظر میں رہتی ہے۔ یوں بھی اسلام آباد سے کراچی تو مہینے دو مہینے میں جانا آنا لگا رہتا تھا۔ یہ سفر پی آئی اے سے ہی ہوتا تھا۔ مجھے یہ ایرلائن بہت پسند تھی۔ اس کی میزبان لڑکیاں بہت دل کش اور مسکراہٹوں سے لبالب بھری ہوتی تھیں۔ کھانے بھی بڑے مزے کے اور عملہ بھی بڑا مستعد ہوتا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس کی ایسی عادت ہوگئی کہ میں کرسمس پر گھر جانے کے لیے بھی کبھی کبھی اسی میں سفر کرنے لگا۔

ٹپ ٹپ آنسو ہاتھوں پر گرنے لگے تھے۔ پھر جیسے فوارہ سا پھوٹ نکلا۔ مسٹر ایڈمنڈ وکون ہیں؟ تھوڑا سا تعارف تو ضروری ہے نا۔

میں روم میں تھی اور ابھی تھوڑی دیر قبل پنتھین (Pantheen) چرچ میں اٹلی کے مایہ ناز مصور رافیل کی قبر پر اُس کے لیے فاتحہ پڑھ کر باہر نکلی تھی۔ قریبی میکڈونلڈ سے فش برگر لا کر اُسے کھاتے ہوئے رنگ رنگیلے لوگوں کو دیکھتے ہوئے عجیب سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔

جب ایک عجیب سی بات ہوئی۔ ایک اونچے لمبے کوئی ساٹھ 60 باسٹھ 62 کے پیٹے میں ایک شخص نے قریب آکر پوچھا کہ میں کہاں سے ہوں؟ حیرت کے چھلکاؤ سے لبریز آنکھوں سے میں نے مخاطب کو دیکھا۔

’’پاکستان‘‘۔ہائے میرے لہجے میں پور پور شرمندگی اور خوف رچا ہوا تھا۔ دہشت گردی کے حوالے سے نا۔

’’ارے‘‘ مرد کی باچھیں کھلیں۔

’’آپ کے تربیلا ڈیم کی تعمیر میں میرے ہنرمند ہاتھوں کا بھی خاصا دخل ہے۔‘‘

اب میری باچھیں کھلنے کی باری تھی۔

مسٹر ایڈمنڈ وکوئی چار سال پاکستان میں رہا۔چار سالہ یادوں کی لو اُس کی نیلی مائل بھوری آنکھوں میں جیسے فانوس کی طرح جگمگاتی تھیں۔

’’ہم کبھی ویک اینڈ اور کبھی پندرہ دن بعد اسلام آباد جایا کرتے تھے۔‘‘اسلام آباد کے چند ایلیٹ کلاس گھرانوں سے اُس کے مراسم تھے جن کا ذکر اس نے اِس وقت محبتوں بھرے رچاؤ سے کیا تھا۔بیگم سرفراز اقبال کا نام بھی اس نے لیا تھا۔

وہ نیپلز سے تھا۔روم کسی کام سے آیا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میرا نیپلز آنے کا کوئی پروگرام ہے۔

میں نے اپنی اکیلے ہونے کی مجبوری اُسے بتائی۔بڑی بے ساختہ سی دعوت تھی جو اس نے فی الفور دے ڈالی۔

’’میرا گھر ہے وہاں۔میرے پاس ٹھہریئے۔پاکستانیوں کی محبتوں کا میں مقروض ہوں۔‘‘

اتنی خوبصورت بات۔میری آنکھیں پل بھر میں گیلی ہوگئیں۔

’’ارے نیپلز بہت خوبصورت جگہ ہے۔دو باتیں تو اس کی بڑی مشہور ہیں۔پیزا اور صوفیہ لورین۔یقیناً دونوں کی آپ بھی مدّاح ہوں گی۔دونوں کی جائے پیدائش نیپلز ہی تو ہے۔اس کے رنگین پرانے شہر کا تو بس دیکھنے سے تعلق ہے۔‘‘

اُس نے اپنی نگاہیں دائیں بائیں پھینکیں اور پھر میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''بھئی بڑی پرانی تاریخ ہے اس کی بھی۔ آپ لکھاری ہیں۔ اُس شہر کو تو ضرور دیکھنا چاہیے۔''

کوئی گھنٹہ بھر ہم لوگوں نے باتیں کیں۔ اپنا نام پتہ، موبائل نمبر، ای میل سب اُس نے میری ڈائری میں لکھے اور موبائل میں بھی فیڈ کر دیئے۔ ہمارے درمیان ای میل پر ہیلو ہائے کا یہ سلسلہ کبھی کبھار ضرور رہتا تھا۔ میں اُسے کرسمس اور ایسٹر پر وش کرنا کبھی نہ بھولتی۔ کرونا کو اٹلی جس طرح بھگت رہا ہے اس پر بھی ہمارے درمیان بات چیت ہوئی تھی۔

اور آج اُس کی ای میل نے مجھے زار زار رُلا دیا تھا۔

اس کو بنانے والے اسے میرٹ پر اٹھانے اور اسے باکمال لوگ لاجواب پرواز کا ٹائیٹل دینے والے تو کہیں قبروں میں جا سوئے۔ جی چاہتا ہے سہیل وڑائچ کی طرح ایر مارشل نور خان کو خط لکھوں۔ اسے مزید سنوانے والے اصغر خان کو آواز دوں کہ وہ آ کر دیکھیں تو سہی۔ لالچی گدھ اس کے وجود کی ایک ایک بوٹی نوچ کھانا چاہتے ہیں۔ اس کے جسم میں کسی بھی بیماری اور خرابی کی صورت میں اس کا علاج کرنے کی بجائے بھاری رقوم کے جعلی بل بنوا کر سستی چیزوں سے اس کا ماڑا موٹا علاج کروا کر اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ دنیا بھر میں اس کے دفتروں کی قیمتی جگہیں اور اشیا پر ان کی بھوکی اور للچائی نظریں ہیں۔ اس کے بہترین منجھے ہوئے تجربہ کار پائلٹ باہر والے لے اڑے۔ اس کے ہاں میرٹ تو کہیں رہا ہی نہیں۔

CEO اور وزیر ہوا بازی پریس کانفرنسیں کر رہے ہیں۔ وضاحتیں دے رہے ہیں۔ شفاف تفتیش کی یقین دہانی کروا رہے ہیں۔ کوئی پوچھے اِس سے قبل جو طیارے کریش ہوئے ان کے بارے کوئی رپورٹ آئی۔ چترال کا حادثہ تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن کی بات

ہے۔وہ حکومت دوسری تھی۔ہمارے وزیر ہوابازی کا کیسا بھونڈا دفاع تھا۔کوئی پوچھے کیا ادارہ بھی کوئی دوسرا تھا؟

باتوں اور قیاس آرائیوں کے نئے دروازے کھل گئے ہیں۔کچھ ذمہ دار اور تجربہ کاروں کا کہنا ہے کہ پائلٹ کی غلطی تھی۔رفتار تیز تھی۔کنٹرول ٹاور سے کہا گیا تھا کہ رفتار کم کریں۔جہاز کا انجن زمین سے ٹچ کر گیا تھا کیونکہ پہیے کھلے نہیں تھے۔پھر اوپر اٹھا۔اس وقت تک آگ لگ چکی تھی۔یہ سب اندازے ہیں۔صحیح کیا ہے۔یہ کبھی معلوم نہیں ہوگا۔

بورڈ میٹنگز، بڑے لوگوں کی آنیاں جانیاں سب کھیل تماشے ہوں گے مگر نتیجہ صفر ہی رہے گا۔یہ یقین ہے۔

☆☆☆

اماں، جس پر لکھتے لکھتے یہ دن آ گیا

میں اوراماں دو پکی گوڑی سہیلیاں اوپر تلے کی جیسے دو بہنیں ایک گھر میں مثل دو سوکنیں میرے بہت سے رشتوں کی ابتدا اور انتہا ان کی ذات سے شروع ہو کر ان پر ہی ختم ہوتی تھی صبح اگر پانی پت کا میدان گرم ہوتا تو شام کو ہم گھٹنے سے گھٹنا جوڑے اپنا ''کیتھارسس'' سیشن جاری کرتیں پھر دل کی چال چلتی اماں کو برین ہیمرج ہو گیا اور میں نے پورے پچیس دن ان کا گُو مُوت اُٹھایا۔

تب میں نے خود سے کہا چلو یہ تندرست ہوں گی تو کہوں گی کہ ہمارا آپ کا حساب کتاب برابر ہوا پر وہ مجھے دکھ اور کرب کے لا متناہی سمندر میں دھکیل کر خود فرار ہو گئیں۔

میں چھم چھم روتی ہوں اور لمبے لمبے سجدے کرتی ہوں۔

پر مجھے یقین ہے کہ وہ اگر جنت کی کھڑکی سے جھانک کر میرے آنسوؤں کو دیکھ لیں تو ضرور کہیں گی چل ہٹ جھوٹی کہیں کی۔

یاروں کے لیے روتی ہے اور نام میرا لیتی ہے
اغراض کے لیے جھکتی ہے اور احسان مجھ پر دھرتی ہے

چنبیلی کے پھولوں جیسی رنگت والی میری اماں جن کے تیکھے خدو خال انہیں بہت دلکش بنائے ہوئے تھے، بیاہ کر جس کے لڑ لگیں وہ نہایت اکھڑ مزاج شخص تھا۔ اُسکی موٹی موٹی باہر کو اُبلتی ہوئی آنکھوں میں شاید کبھی نرمی اور حلاوت گھلی ہوئی نظر آئی ہو۔ سدا غصہ اور تناؤ ہی موجیں مارتا رہتا۔

کنوار پنے میں جب وہ ابھی اپنے میکے گھر میں قاری صاحب سے گلستان و بوستان پڑھ رہی ہوتیں، میرے ابا اپنے گھر کی چھت کی منڈیر پر بیٹھے کبوتروں کے غول اُڑانے میں مصروف ہوتے۔ جونہی گلی میں سک سُرمے والے پاگامے کی آواز گونجتی، ابا منڈیر سے آدھا دھڑ گلی میں لڑھکا دیتے اور آواز لگانا نہ بھولتے۔

''پاگامیاں! میری ووہٹی نوں سک (دنداسہ) دیندا جائیں۔''

اور پاگاما زور سے ہنستے ہوئے کہتا۔

''کنجر دیا! پیسے توں دیویں گا یا تیرا پیو۔''

اور وہ سینے پر زور سے اپنا ہاتھ مارتے ہوئے کہتا۔

''میں دیواں گا، میں!''

اردگرد کے گھروں میں بسنے والیاں شریکے کی چچیاں تائیاں یہ مکالمے سنتیں، ہنستیں اور اماں تک سب کچھ پہنچا دیتیں۔ بیچاری اماں شرم سے سر نہ اُٹھا پاتیں۔

ان کے گھر میں ایسی باتیں کب تھیں۔ ان کا دانا باپ جوانی ہی میں اپنی دانائی کے بل پر گاؤں کا چودھری بنا ہوا تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے تک اہم فیصلوں میں اس جوان آدمی کی رائے کو خاص اہمیت دیتے تھے۔

ان کے بھائی صبح سویرے پانچ کوس کا پینڈا مار کر جالندھر سکول میں پڑھنے جاتے اور واپس آ کر یا کتابوں سے گھلتے یا باپ کے ساتھ کھیتی باڑی میں اس کا ہاتھ بٹاتے۔

ابا، اماں کا بہت قریبی رشتے دار تھا۔ لاڈلا اور بگڑا ہوا بچہ۔ اوپر تلے کے تین بیٹوں کی موت کے بعد بچا تھا اس لیے ماں بہنوں نے ہتھیلی کا پھپھولا بنا ڈالا تھا۔ بارہ سال تک گودیوں میں اُٹھائے رکھا۔ اسکول میں پڑھنے جاتا تو میری دادی پیچھے پیچھے دس چکر لگاتی۔ بیس بار منشی جی کے کانوں میں یہ ڈالتی: ''بڑا مہنگا پُتر ہے جی۔ اس سے پہلے تین اللہ کو

پیارے ہو گئے ہیں، یہ بچا ہے۔''

یوں وہ تیسری میں تین باراور چوتھی میں چار بار فیل ہوکراب کوٹھوں پر کبوتر بازی نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

مزاج کے تند، ہنر سے عاری اور تعلیم سے بے بہرہ انسان کے ساتھ اماں نے کیسے گزارہ کیا میرے مشاہدوں کی تلخ یادیں ہمیشہ میرے ذہن میں ہلچل مچائے رکھتی ہیں۔

بڑی صابر عورت تھیں۔ قدرت نے جب ماں کا شرف بخشا اور بیٹا بیٹی سے نوازا۔ دونوں بچے گہری سانولی رنگت لے کر دنیا میں آئے تھے۔ شریکے کی کم وبیش سبھی عورتوں نے طنزاً کہا۔

''ارے سارے خانوادے میں ایسا کوئی نہیں۔ یہ کالے میراثی کس پر گئے ہیں۔''

دراصل وہ بھی کسی حد تک ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ ہمارا ابا بڑا تگڑا جوان تھا۔ پینتالیس انچ چوڑی چھاتی کسرتی بدن اور پٹھانوں جیسا سُرخ وسفید رنگ۔ ایسے میں جب ابا نے بھی ناک بھوں چڑھایا اور بڑی بوڑھیوں نے ہمدردانہ انداز میں اماں کے سرہانے بیٹھ کر گوہر افشانی کی۔

''اب یہ تو تمہاری ساس کو چاہیے تھا کہ تمہیں بتاتی کہ پوری چاندراتوں میں ملاپ کرنے اور پیٹ ہو جانے پر نو مہینے نہار منہ دہی کھانے سے بچہ خوبصورت ہوتا ہے۔''

اور میری ماں نے کتنے افسردہ لہجے میں اپنی چچیا ساس سے کہا تھا۔

''یہ سب تو مقدر کی باتیں ہیں۔ اس میں انسان کا کمال اور اسکی کاریگری کیا۔ کون ماں چاہتی ہے اُس کے بچے خوبصورت نہ ہوں۔''

تقسیم کے بعد لٹ لٹا کر پاکستان آئے تو اماں کے میکے والوں نے ایک کمرہ جس

کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا، اماں کو سر چھپانے کو دے دیا۔ چھوٹے موٹے کام پر ابا کو بھی لگا دیا۔

اب لاکھ اماں، ابا کے حُلیے کو اچھا رکھنے پر زور دیتیں، وہاں وہی خستہ حال لنڈے کی پینٹ اور بے ڈھنگی سی قمیض، کندھے پر چارخانی لینن کا انگوچھا اور پاؤں میں پھٹا پرانا جوتا۔

پتہ نہیں انہیں ابا کو اچھے کپڑے پہنانے کا شوق تھا یا وہ اپنے میکے والوں سے شرمندہ رہتی تھیں۔ ان کے بھائی افسر آدمی تھے۔ کلیدی ملازمتوں پر بیٹھے تھے محل نما گھر میں رہتے تھے۔ ایسے میں شاید وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ابا ان کے لیے شرمندگی اور خفت کا باعث بنے۔ وہ ابا کے کپڑوں کو سوڈے کے کھارے پانیوں میں غوطے دے دے کر ان پر ڈنڈوں کی بارش کر کے صاف کرتیں، نیل لگاتیں اور جب وہ کپڑے ہاتھوں میں پکڑ کر پہنانے کے لیے شوہر کے آگے کھڑی ہوتیں وہ انہیں ہاتھ مار کر جھٹک دیتا۔ اماں مسکینی سے کہتیں:
''اے ہے لوگ کیا کہیں گے ان کا داماد کیسا فجا سودائی ہے۔''

بس اماں کی اتنی بات کہنے کی دیر ہوتی کہ ابا کی لال لال آنکھیں یوں لگتا جیسے ابھی فرش پر گر پڑیں گی۔ ہونہہ کا ہنکارا ایسا طنزیہ اور زوردار ہوتا کہ بے چاری اماں سہم کر پیچھے ہٹ جاتیں۔

میرا باپ کیسا آتش مزاج تھا۔ ہنڈیا میں نمک تیز ہو جاتا وہ ہنڈیا اُٹھا کر زمین پر مارتا۔ ذرا بات مزاج کے خلاف ہوئی اُس نے گھونسوں سے اماں کا منہ سُجا دیا۔ کہیں اماں سے جواب دینے کی غلطی ہوگئی اُس نے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ جب بھی ایسی صورت حال ہوئی اماں بہت ضبط سے اسے برداشت کرتیں اور ہونٹوں کو سی لیتیں۔ نہیں چاہتی تھیں کہ اس لڑائی جھگڑے کی بھنک اس کے میکے والوں کے کانوں میں پڑے۔ اپنے

آپ کو کمرے میں قید کرلیتیں۔ کمرے سے باہر نکلتیں تو یوں ظاہر کرتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

چالیس برس کی ازدواجی زندگی میں ایک بار ایسا نہیں ہوا کہ ابا نے اماں کی ہتھیلی پر تنخواہ رکھی ہو۔ ہفتے کا خرچ ملتا اسی میں وہ تھوڑی سی بچت کرلیتیں۔ کبھی کبھی ابا کے اچھے موڈ کا فائدہ اُٹھا کر اس سے کچھ پیسے بٹور لیتیں۔

عجیب بات تھی کہ اماں کی کنواری بہنیں جب ابا کے لیے ناپسندیدہ الفاظ استعمال کرتیں تو اماں بہت برا مناتیں۔ باقاعدہ ان کے مقابلے پر جی داری سے صف آرا ہوتیں۔ پر اماں کی پسپائی ہمیشہ راجہ پورس کے ہاتھیوں جیسی ہوتی کہ جو اپنی ہی فوجوں کو روندتے ہوئے بھاگ جاتے۔ تب اماں اپنے کمرے میں آنسوؤں کے کھارے پانیوں میں غوطے کھاتے ہوئے گلستان، بوستان کی حکایتیں یاد کرتیں۔ مولانا غلام رسول کی یوسف زلیخا پڑھتیں اور اپنی بہنوں کو جی بھر کر کوستیں جو پڑھ لکھ کر بہت تیز طرار بن گئی تھیں۔

ارے کوئی حرام کی تھی جو کوڑھیوں کی طرح اُٹھا کر کُوڑے کے ڈھیر پر ڈال دیا۔ ساری عمر چنگڑوں اور شودروں جیسا سلوک کیا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ عمر بھر وہ بہنوں کے مقابلے میں نندوں سے زیادہ قریب رہیں۔ وہ نندوں کے بچوں کے لیے بہت محبت کرنے والی ممانی تھیں۔ اپنا پیٹ کاٹ کر نندوں کو عید شبراتیں بھیجتیں۔ ان کے بچوں کی شادیوں پر دھوم دھڑکے سے جاتیں۔ بڑی پریت سے نانکی شک تیار کرتیں۔

وہ جگت ماسی جی تھیں۔ بڑوں کی ماسی، ان کے بچوں کی ماسی، ہمدرد وغمگسار۔ محلے میں کسی کو تکلیف ہوجاتی وہ حاضر، ہر کسی کے دکھ میں شریک۔ ایک بار گھر آئیں تو کان کی سونے کی ڈنڈی غائب۔ میں نے پوچھا: ''اماں! ڈنڈی کہاں گئی؟''

''ارے'' انہوں نے لویں چھوئیں اور یوں ظاہر کیا جیسے وہ کہیں گر گئی ہو۔

برسوں بعد مجھے پتہ چلا کہ کسی غرض مند کو ضرورت تھی، انہوں نے ڈنڈی اُتار کر اسے دے دی تھی کہ چلو اپنی غرض پوری کرلو۔

میری یادوں کی چلمن سے میرے بچپن کا وہ واقعہ بھی کسی قطبی تارے کی مانند سدا جھلملاتا رہتا ہے۔ ہمارے ہمسائے میں سہارن پور سے آئے ہوئے خاندان آباد تھے۔ تین شادی شدہ بیٹوں کی بوڑھی ماں جسے سنبھالنے پر کوئی بہو تیار نہیں تھی۔ میری ماں اُن کے گھر جاتیں، اُس کے کپڑے دھوتیں، اُسے نہلاتیں، بالوں میں تیل کی مالش کرکے کنگھی کرتیں۔ اُس کے آخری دنوں میں تو اُسے کھانا کھلانا بھی اُن کی ذمہ داری تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک بار انہیں کسی کام سے گاؤں جانا پڑا۔ اُنہوں نے سب سے زیادہ مجھے جس کام کی تاکید کی وہ اپنی مُنہ بولی ماں کی دیکھ بھال تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اُن کے گندے کپڑے کس مشکل سے دھوئے تھے۔

ابا چھ سال بیمار رہے۔ ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا والی بات ہوگئی تھی۔ اماں ان کا کمرہ صاف کرتیں، اُلٹیوں اور بخار کے پسینے سے تر کپڑے دھوتیں، جسم کو اسفنج سے صاف کرتیں، دھلے کپڑے پہناتیں، سوپ بنا کر پلاتیں اور سارا دن بھاگی بھاگی پھرتیں اور اس کے ساتھ ساتھ ابا کی گھرکیاں اور گالیاں بھی سُنتیں اور سہتیں۔ ہم جیسے کبھی کہتے۔

''اماں آپ نے تو ابا کو سر چڑھا رکھا ہے۔''

وہ ذرا سا مسکرا کر کہتیں۔

''کیا کروں؟ ساری عمر کا ایسا ہی ہے۔ میں بھی مجبور ہوں۔''

ابا کو فالج کا اٹیک ہوا۔ اسپتال میں داخل ہوئے دس دن تک وہ مسلسل بے ہوش رہے۔ ڈاکٹروں نے غذا کے لیے نالی لگانی چاہی، اماں نہیں مانیں۔ اصرار ہوا تو بولیں۔

''میں غذا خود کھلاؤں گی۔''

اور پھر پتہ نہیں کہ وہ کن کن جتنوں سے انہیں غذا کھلاتی رہیں۔ ڈاکٹر ریاض قدیر مرحوم ابا کے ہوش آنے پر حیران تھے۔

ان کی یہ خدمت صرف ابا تک محدود نہیں تھی، وہ وارڈ کے ہر اس مریض کے لیے دل وجان سے حاضر رہتیں جس کا کوئی تیمار دار نہ ہوتا۔ کسی کے کپڑے دھو رہی ہیں۔ کسی عورت کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہیں اور جب ابا اپنے پاؤں پر چل کر اسپتال سے گھر آئے، پتہ نہیں اماں کتنے لوگوں کی دعائیں اپنے ساتھ لائی تھیں۔

اُردن کا وہ لڑکا مجھے کبھی نہیں بھولتا جو ابا کے ساتھ والے بیڈ پر یرقان کا مریض تھا۔ 1985 میں ہیپٹائٹس بی سی کو کون جانتا تھا؟ پیلا اور کالا یرقان مانوس نام تھے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے اِس طالب کی میری ماں بہت جانفشانی سے تیمارداری کرتیں۔ اُس پردیسی جوان بچے کے لیے آنسو بہاتیں۔ اُسکے لیے دعا مانگتیں۔ اُس کا باپ جب اُسے لینے آیا اُس نے کتنی ممنون آنکھوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ایڈریس لیا۔ اور جب وہ اُردن جا کر فوت ہو گیا تو ماں کو اطلاع بھی دی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس سارے دن ماں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔

کیسی محبت بھری تھیں کہ سارے بوجھ خود ہی اُٹھاتیں اور کبھی بیٹے بیٹی سے یہ نہ چاہتیں کہ وہ کسی دن اسپتال رہ جائیں اور وہ گھر جا کر آرام کر لیں۔ خدا گواہ ہے کہ ہمیں ایک ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ اسپتال میں رُکنے نہ دیتیں۔

''بس اب جاؤ۔ بچے چھوٹے ہیں تم لوگوں کے میں جو ہوں۔''

اماں جب ساس بنیں تو بہت اچھی ساس نہیں تھیں۔ شاید انہیں اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت پیار تھا۔ مگر گزرتے وقت میں جب انہیں احساس ہوا تو سب کچھ بہو کے حوالے کر

کے خود اپنے شوہر کو لے کر ایک چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو گئیں۔ کسی نے کہا۔

''تم ابھی سے کنارہ کش ہو گئی ہو۔ اپنی گدی نہیں چھوڑتے۔''

تو بڑی طمانیت سے بولیں۔

''میں نے بہتیرا راج کر لیا۔ اب جن کے کام ہیں وہ سنبھالیں۔''

بچیوں کو قرآن پاک پڑھانے سے انہیں عشق رہا۔ گھر میں جونہی شام کے سائے ڈھلنے لگتے ''ماسی جی سلاما علیکم'' کی صدائیں گونجنے لگتیں۔ انگنائی لڑکیوں سے بھر جاتی۔ ہر ایک کو سبق خود دیتیں۔ پتہ نہیں کتنے سینکڑوں لڑکیوں لڑکوں کو پڑھایا۔

ہم ماں بیٹی میں بہت دوستانہ تھا۔ ہر بات ایک دوسرے سے کرتے۔ شادی کے اوائل میں سسرال کی سختی کی باتیں مجھ سے سنتیں تو کہتیں۔

''گھبراتے نہیں صبر کرو، اللہ اچھے دن لے آئے گا۔''

مجھے ہمیشہ دو ملال رہے۔ پہلا یہ کہ میری خوبصورت ماں کو میرے باپ کی بیماری نے ادھ موا کر دیا۔ کبھی کبھی جی چاہنے لگتا کاش! وہ اس بوجھ سے نجات حاصل کر لیں، مگر وہ تو ان خوش نصیب عورتوں میں شامل ہونا چاہتی تھیں جو شوہروں کی زندگی میں ہی وداع ہو جاتی ہیں۔

اور میرے دوسرے ملال نے بھی مجھے ہمیشہ مضطرب رکھا۔ وقت اور حالات نے مجھے جس قدر عزت اور دولت دی اپنی بیٹی کا یہ عروج وہ نہ دیکھ سکیں۔

پتہ بھی نہیں چلا کہ کب انہیں موت آ گئی، دوڑتے بھاگتے وہ چلی گئیں۔ ان کی چارپائی آنگن میں پڑی تھی اور عورتوں کے غول اندر آ رہے تھے۔ میں نے ایسے ایسے چہرے دیکھے جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہر عورت جو دہلیز سے اندر آتی، ضرور کہتی تھی۔

''بڑی اخلاق والی عورت تھی۔''

ہمارے محلے میں یو پی کی طرف کا ایک بہت معزز گھرانہ تھا۔ جن کا بیٹا ڈاکٹر تھا۔ نمازِ جنازے میں شرکت کے بعد جب وہ گھر گیا اُس نے اپنی ماں سے کہا۔

''آپ کو پتہ ہے آج کون فوت ہوا ہے؟''

ماں نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

''اس محلے کی بہت نیک اور بااخلاق عورت آج خدا کی مہمان ہوئی ہے۔''

وہ لوگ تعزیت کے لیے جب آئیں تو آنسوؤں بھری آنکھوں سے یہ واقعہ مجھے سُنایا۔

اپنے صدر علاقے کے بازار میں میں جب بھی خریداری کے لیے نکلتی تو ایک مدت تک ریڑھیوں والوں اور دوکانداروں نے مجھ سے اس انداز میں تعزیت کی......

''آپ کی والدہ جیسی اخلاق اور محبت والی عورتیں بہت کم ہوں گی۔''

اگر شوہر کی وفاداری اور خدمت پر جنت مل سکتی ہے تو یقیناً میری ماں جنت کی سب سے زیادہ حقدار ہے۔

☆☆☆

ہم تین نمبریئے، ہمارا کرونا بھی تین نمبریا

یقین کیجیے یہ میرا بیانیہ ہرگز نہیں۔اس لیے عنایت ہوگی اگر لعن طعن کی سان پر چڑھائی نہ جاؤں۔ سچی یہ تو چند دن پہلے کی مکالمہ بازی ہے اُن پانچ نوجوان ڈاکٹر بچیوں سے جو لاہور کے نامی گرامی اسپتالوں میں کام کرتی ہیں۔لڑکیاں سنجیدہ بھی تھیں اور شوخ و شنگ وزندہ دل بھی۔

پیاری سی لڑکی کا سارا چہرہ تو ماسک اور سکارف میں چھپا ہوا تھا۔میرے سوال پر پردے میں چُھپے ہونٹوں کے ساتھ سرمگیں آنکھیں بھی بولی تھیں۔کرونا مریض آتے ہیں مگراُن کی اکثریت صحت یاب ہوتی ہے۔مرنے والوں کا نمبر بہت کم ہے۔سوال ہے کہ کیا پہلے اسپتالوں میں اموات نہیں ہوتی تھیں۔اب پروپیگنڈہ ،شور شرابا اور غل غپاڑہ زیادہ مچا رکھا ہے۔اِس میڈیا نے قوم کو ریٹنگ کے چکروں میں نفسیاتی مریض بنا دیا ہے۔

دوسری نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔ہمارا کرونا کونسا خالص ہے۔جیسے ہم تین، چار نمبریئے لوگ ہیں۔ویسے ہی ہمیں ملنے والا یہ کرونا ہے۔اب یہ کسی یار بیلی ملک کی سوغات ہے یا کسی خار رکھنے والے ملک کا تحفہ۔خود سوچیے یہ خالص کیسے ہوسکتا ہے؟ نوجوان ڈاکٹر کی بات تو بڑے پتے کی تھی ،ٹھک سے دل کو لگی تھی۔بے شک چین ہمارا دوست، مربی، محسن اور خیر خواہ ہے۔ہمیں اپنا بغل بچہ سمجھتا ہے، پر ہے تو پورا بنیا۔نمبرون مال تو اس کا سیدھا سیدھا نمبرون ملکوں کو جاتا ہے۔یعنی امریکہ اور یورپ وغیرہ۔دو اور تین نمبر اس سے کمتر درجے کے لوگوں میں۔ہمارے حصّے میں تو کنڈم مال آتا ہے۔مثال تو سامنے ہے امریکہ اور یورپی

ملکوں کی۔'' لڑکیاں ہنس رہی تھیں۔ مذاق اور تفنن طبع کی بات رکھیئے ایک طرف، حقیقت یہی ہے۔ مجھے یاد آیا اپنا ایک ذاتی مشاہدہ۔ سری لنکا کے خوبصورت شہر نویرا علیہ کی سیر کے دوران چائے کی ایک فیکٹری میں جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ جہاں سنہری مائل رنگت والے تروتازہ پتوں کو توڑنے سے وزن کرنے، مشینوں میں رولنگ، عمل تکسید سے گزارنے، خشک کرنے اور پھر اُن کی گریڈنگ کے مرحلوں کو دیکھا تھا۔ نمبرون، نمبر دو اور نمبر تین۔ نمبرون صف اول کے ملکوں کو نمبر دو ذرا تھوڑا سا کمتر درجے والوں کو۔

'' میرا پاکستان بھی تو آپ کا گاہک ملک ہے۔ اُسے کونسی چائے بھیجتے ہیں۔'' نوجوان آفیسر میرے سوال پر مسکرایا تھا۔ مگر بولا کچھ نہیں۔ سچی بات ہے ہمارے ہاں تو ایسی مثالوں کے ڈھیر نہیں پہاڑ کھڑے ہیں۔ اربابِ اختیار کی کرتوتیں اور حرکتیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ اور سُن لیں۔

جاپان کی الیکٹریکل مشینری کی ایک کمپنی سے پاکستانی وفد کے ایک صاحب ضمیر سربراہ نے پوچھا۔'' ہندوستان بھی آپ کی امپورٹ ٹریڈ کا اہم ممبر ہے جیسے پاکستان ہے۔ آپ دونوں ممالک کے نمائندوں میں کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟''

اندر خانے کمیشن کے دونوں طلب گار رہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے ہندوستانی پہلے کوالٹی کی بات کرتے ہیں اور آخر میں اپنے کمیشن کی۔ جبکہ پاکستانیوں کی بسم اللہ ہی اپنے کمیشن سے ہوتی ہے۔ کوالٹی جائے بھاڑ میں۔

اب ذرا ذاتی باتیں سُن لیں۔

یہ غالباً فروری کے دوسرے یا تیسرے ہفتے کی بات ہے۔ بہت دنوں سے کشور ناہید سے بات نہیں ہوئی تھی۔ حال احوال پُوچھا۔ بولیں '' ارے بھئی کرونا بھگت کر فارغ ہوئی ہوں۔'''' ہائیں کرونا۔'' بے اختیار ہی منہ سے نکلا۔ اس وقت تک یہ آگ ابھی

پرائے گھر میں ہی بھانبھڑ مچا رہی تھی۔

''ہاں ہاں بھئی یہ فلو کیا ہے؟ اسی کرونا کا کزن تو ہے۔کشور نے کہا۔ایسا شدید حملہ تھا کہ لگتا تھا کھانس کھانس کر پسلیاں ہی ٹوٹ جائیں گی۔ہاں یہ نئی وبا کرونا ذرا فلو سے بھی ڈاڈھی لگتی ہے۔

کچھ اسی قسم کا سلسلہ بشریٰ اعجاز اور ہماری کزن کے ساتھ بھی ہوا۔دونوں نے مسلسل دو ماہ اِس عذاب کو بھگتا۔

''ارے بھئی کیا ہوتا ہے ہمارے ہاں بہار اور خزاں کی آمد پر میری بہن بولی تھی۔ موسم جب بدلتے ہیں بچے بڑے بد پرہیزیاں کرتے ہیں۔ٹھنڈے برفوں والے پانی اور اے سی۔نتیجتاً کم وبیش ہر بندہ ہی ڈاکٹر کے پاس پہنچ جاتا ہے۔پرائیوٹ ڈاکٹروں کے کلینک بیماروں سے اُبل رہے ہوتے ہیں۔سکولوں کے بچے تو زیادہ ہی طوفان مچاتے ہیں۔

چلو بھئی چھوٹے موٹے اردو میڈیم سکولوں کو چھوڑو کہ ہائی فائی لوگ کہہ سکتے ہیں جیسا منہ ویسی چپیڑ (تھپڑ) جیسی کلاس کے بچے اسی کلاس کے چھابڑی اور ٹھیلے والے۔پر یہاں تو بیکن اور لاہور گرامر جیسے ایلیٹ سکولوں کے سامنے بھی لڈو پیٹھے، گول گپے، گولا گنڈہ، لچھے اور قلفی والوں کے گرد بچوں کے لاؤ لشکر دھاوا بول رہے ہوتے ہیں۔رنگا رنگ شربتوں سے سجے کانے میں پروئے برف کے گولے بڑے گھر کے بچے کس ذوق وشوق سے چوس رہے ہوتے ہیں۔ڈسٹلڈ پانی لانے اور پینے والوں کے گلوں نے خراب تو ہونا ہی ہونا ہے۔پھر بخار، چھاتی کا جکڑاؤ وغیرہ۔

تو فروری کے آخری دنوں میں یہ ہمارے ہاں بھی آدھمکی۔اب ہمیں اِس منحوس مارے کرونا کا کیا پتہ تھا۔ہمارے تو حکمران بھی اول درجے چول ہیں کہ کچھ بندوبست ہی کر لیتے۔ایسے ڈھیٹ کہ نہ اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ اور نہ خلق خدا کے سامنے۔

اب خیر سے ایک اور افتاد کا ذکر بھی سُن لیں۔ نومئی کو کام پر گئی تو کیا دیکھتی ہوں سامنے والی لین میں دو عدد بھاری بھرکم گاڑیوں کے ساتھ دس بارہ لوگوں کا ایک مجمع ایک گھر کو گھیرے میں لیے کھڑا ہے۔ سیفٹی کٹ میں ملبوس خلائی مخلوق جیسے دو بندے تین پولیس والوں کے ساتھ کچھ دہشت بھری صورت کے غماز تھے۔ پتہ چلا کہ گھر کا بڑا لڑکا کسی پرائیوٹ کمپنی کے ایم ڈی کا پی اے تھا۔ مالک کو کورونا ہوگیا تو عملے کی شامت آ گئی۔ لڑکے کو لے گئے۔ چار دن ذلیل وخوار کیا۔ سرکاری ٹیسٹ پازیٹو پرائیوٹ ٹیسٹ نیگٹو۔

بارہ بجے گھر واپس آئی تو اپنے دروازے پر صبح والے واقعے سے کہیں زیادہ خوفناک اور ہوشربا سا منظر تھا۔ یا اللہ خیر۔ اُدھیڑ عمر کا ایک سپاہی اپنی انگلی بیل پر رکھے اُسے بجائے چلا جا رہا تھا۔

یکدم جیسے میرا میٹر گھوم گیا۔ دھاڑی۔ ''ہاتھ اٹھاؤ۔ بند کرو اِسے بجانا۔ جاہل گنوار ہو کسی کے گھر دستک دینے کی تربیت نہیں سیکھی۔''

ایک معقول سے بندے نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''ماں جی غصہ نہ کریں۔ ہم کرونا ٹیسٹ کے لیے آئے ہیں۔ گھر کے کسی ایک بندے کو چیک کرنا ہے'' ''نہ کیوں چیک کرنا ہے۔ رپوٹ ہوئی یہاں کی کوئی۔''

دوسرے وردی والے نے فوراً ایک لیٹر نکال کر میری آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''ارے پیچھے کرو اسے۔ جھوٹے عکس ڈالتے ہو۔'' اب وہ مجھے صفائیاں دینے اور اپنی پوزیشن واضح کرنے میں لگ گئے۔ جی چاہ رہا تھا لتّر لگاؤں۔

''عقل کے اوندھے ہو تم لوگ۔ علاقے کو تو دیکھا کرو۔ ان کی صبح تو عام حالات میں گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی، آج کل تو خیر رمضان ہے۔ اوپر سے یہ لاک ڈاؤن، گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہے ہیں۔ پر یہ تو بتاؤ یہاں تمہیں آنے کا کس نے مشورہ

دیا؟ان لوگوں کوتو ذراسی چھینک آجائے تو بغل میں مہنگے ترین حمید لطیف کی طرف بھاگتے ہیں۔شیخ زیدنہیں جائیں گے۔جاؤ کچی بستیوں میں جاؤ،ٹھوکر نیاز بیگ کے نواحی گھروں میں جاؤ۔وحدت روڈ کے کواٹروں میں جاؤ۔انہیں تمہارے فری ٹیسٹوں کی زیادہ ضرورت ہے۔یہاں کس لیے خجل ہورہے ہیں۔ان کی فکر چھوڑو۔یہ اپنی فکر کے علاوہ اور کیا کرتے ہیں۔

خدا خدا کر کے انہیں رخصت کیا۔اندر آئی تو لڑکی نے بتایا۔گھنٹہ ہو گیا ہے بیل بجا بجا کر پاگل کر دیا ہے۔

☆☆☆

انور مسعود سونا نہیں، ہیرا سپرد خاک کیا

میں نہیں جانتی تھی لینہ حاشر صدیقہ آپا کی صاحبزادی ہیں اور حاشر ابن ارشاد اُن کے بھانجے اور داماد۔ نیشنل بک فاونڈیشن اسلام آباد کے کتاب میلے میں ہم لاہور سے کچھ ادیب لوگ بھی شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میلے کے دوسرے دن شام کو نیلم احمد بشیر نے کہا'' بھئی رات کو لینا سے ملنے چلنا ہے۔ وہ بہت اصرار سے بُلا رہی ہے۔'' کافی پلینٹ کے نام سے جانا جاتا اُن کا گھر اور کیفے ادیبوں، شاعروں، گلوکاروں اور فنکاروں کا ہوم ہے تو وہیں دوسرے شہروں کے نوجوان فنکاروں کا یہ شیلٹر ہوم ہے جہاں نوجوان لینا کو امّاں کہتے ہیں اور حاشر ارشاد ان کے بابا جیسا ہے۔

اور میں یہ سب نہیں جانتی تھی۔

نیلم، آمنہ مفتی اور میں ایک آرٹسٹک سے گھر میں داخل ہوئے جہاں صاحب خانہ اور خاتون خانہ کے چند دوست جوڑے پہلے سے ہی موجود تھے۔ خوشگوار ماحول اور مزے کی باتیں۔ تبھی تین نوجوان بچے اندر آئے۔ آنے والوں میں ایک علی زریون تھا جسے میں نے یوٹیوب پر سنا تھا اور اس کی شاعری کی جدت سے متاثر ہوئی تھی۔

بالی عمر کے دولڑکوں نے لینہ کو امّاں کہا تھا۔ جس محبت کا ان کے لہجوں میں چھلکاؤ تھا میں تو یہی سمجھی تھی کہ وہ خاتون خانہ کے اپنے بچے ہیں۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ کافی پلینٹ میں آنے والے سبھی لڑکے بالے لینا اور حاشر کے بچے ہی ہیں۔

اب یہ عقدہ تو کہیں رات گئے کُھلا کہ لینہ، انور مسعود اور صدیقہ آپا کی بیٹی ہیں۔ میں ہنسی تھی۔ تو بھئی صدیقہ آپا کی بیٹی کو تو پھر ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ محبت کے روشن

چمکتے ستارے جیسی روشنی دینے والی صدیقہ آپا۔

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی ۔رُخصت ہوتے ہوئے لینا نے دفعتاً مجھ سے کہا۔ اگر میں آپ کو آپا کی بجائے پھپھو کہوں تو آپ کو بُرا تو نہیں لگے گا۔

دراصل! اُس نے از خود ہی فوراً وضاحت بھی کر دی۔میری ایک پھوپھی کی شکل آپ سے بہت ملتی ہے۔جتنا وقت آپ ہمارے گھر میں رہیں مجھے وہ یاد آتی رہیں۔اُس کے ہاتھوں کو تھپتھپاتے ہوئے مجھے صدیقہ آپا کی زندگی کے وہ گوشے یاد آئے تھے جہاں اُنہوں نے ایک سفید پوش عیالدار سسرالی گھرانے کو اپنا خاندان سمجھا تھا اور اُن سے وہی رشتہ جوڑا تھا جس کی خواہش اور توقع ہمارا معاشرہ کرتا ہے۔

صدیقہ آپا سے پہلی ملاقات سعود عثمانی کے بڑے صاحب زادے کی دعوت ولیمہ میں ہوئی ۔ایک حوالہ خداداد شاعر انور مسعود کا۔دوسرا ایک قابل فخر استاد اور پھر اپنے خطوط کے حوالے سے وہ جس عوامی پذیرائی سے ہم کنار ہوئی تھیں وہ تو بہت سے اچھے لکھنے والوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔مسز فردوس امجد اسلام امجد نے اُن کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے۔''فردوس وہ تمہاری سمدھن ہے ۔بیٹی کی ماں کو کم ہی دل کی گہرائیوں سے یوں اپنی سمدھن کے گُن گاتے دیکھا ہے۔اِس جوڑے کے خطوط پڑھے بیٹھی ہوں۔شخصیت کی آئینہ داری میں خطوں سے زیادہ کون سی چیز اہم ہو سکتی ہے۔بندے کا اندر کھل کر سامنے آجاتا ہے۔سچی بات ہے فردوس ملے بغیر ہی محبت کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہوں۔''تو چلو آؤ۔''مسز امجد بہت محبت کرنے والی ہیں۔میرا ہاتھ پکڑے ان کے پاس پہنچ گئیں اور ہنستے ہوئے بولیں''آپ کی ایک اور چاہنے والی لائی ہوں۔'' شادی والے ہنگامے کے باوجود ہمارے درمیان بہت ساری باتیں ہوئیں۔انور مسعود کے حوالے سے،اُن کے اُس جھاڑو والے شہرہ آفاق قصّے کا بھی ذکر ہوا۔میرے لیے وہ دن بڑا یادگار تھا۔

عمار مسعود سے ملاقات بھی اتفاقاً ہی تھی۔

''بولو بتاؤ ایک نادر شخصیت سے ملنا ہے یا تم نے گھر جا کر اپنی رضائی میں گُھسنا ہے۔''نیلم اور میں ایک تقریب سے واپس آ رہی تھیں جب راستے میں اس نے اچانک کہا۔

''رات میں نے سمندر کی آگ نہیں بجھانی۔ رضائی میں گُھس کر خراٹے ہی لینے ہیں۔اس لیے چلو جہاں جانا چاہتی ہو۔''

تعارف حیران کن تھا۔اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان میڈیا کا بندہ اور شادی کر رکھی تھی ایک نابینا لڑکی سے جس سے حد درجہ پیار کرتا تھا۔ جسے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔شاعری کی دلداہ،موسیقی سے پیار کرنے والی خوش شکل لڑکی جس کی اندھیری زندگی میں اس نے بہت سے چراغ جلا رکھے تھے۔ میں بہت متاثر تھی۔ایک خوش شکل جو ملنسار ہونے کے ساتھ مودب بھی تھا۔ پتہ چلا کہ وہ صدیقہ آپا اور انور مسعود کا بیٹا ہے۔تو بھئی ایسے والدین کا بیٹا ایسا ہی ہونا چاہیے۔زندگی کو اپنے رنگ ڈھب سے گزارنے والا،لوگوں کو خوشیاں دینے اور بانٹنے والا۔ وہ کئی فلاحی تنظیموں میں کام کر رہا تھا۔

ایک ملاقات کی یاد بھی دل و دماغ میں ہلچل مچا رہی ہے۔ امجد اسلام امجد کی سالگرہ کا جشن تھا،جو اُن کے بچوں نے بڑے پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا تھا۔جس میں صدیقہ آپا عمار کے ساتھ خصوصی طور پر شرکت کے لیے آئی تھیں۔ میں اُن کے ساتھ صوفے پر بیٹھی اُن سے باتیں کرتی رہی۔قرآن پاک کی تعلیم اور درس قرآن کے جس سلسلے کو انہوں اپنا مطمع نظر بنا رکھا تھا اسی بارے وہ بتاتی رہیں۔اُن کی طبیعت کچھ ڈھیلی ہی رہتی تھی مگر مجھے محسوس ہوا تھا اس ذکر پر وہ یوں تازگی سے باتیں کر رہی تھیں جیسے اس سے بڑھ کر اُن کے لیے گفتگو کا کوئی اور پہلو پسندیدہ ہی نہ ہو۔اُن کی آنکھوں کی چمک ان کے چہرے پر چھلکتے عشق و جذب کی لو اُن کی مدہم آواز میں چاہت کی ایک تڑپ میں سُن رہی تھی،انہیں

دیکھ رہی تھیں۔

دفعتاً مجھے دُور سے اعزاز احمد چوہدری ممتاز سفارت کار نظر آئے۔وہ یقیناً مجھے دیکھ کر مجھ سے ملنے ہی آ رہے تھے۔اعزاز کی اُستاد ہونے کا تو مجھے اعزاز حاصل ہی ہے مگر اُس کے خاندان کے ساتھ میرے سسرال کا بھی ایک گہرا تعلق ہے۔اُسے دیکھ کر میں خوش ہوئی مگر ملول بھی ہوئی تھی ۔اس کا سینہ چومتے ہوئے میں نے کہا تھا،میرے بچے تم تو بوڑھے ہوگئے ہو۔ ہر دم چیلنج کرنے والی بھاری سفارتی ذمہ داریوں نے تمہیں وقت سے پہلے ہی مرجھا کر رکھ دیا ہے۔میں ایسا کیوں نہ کہتی ۔کہ اُستاد ایک مالی کی طرح ہی تو ہوتا ہے جو اپنے پھولوں کو کھلے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔میرا تصور،اِس کا سُرخ وسفید چہرہ،اس کا بے حد متحرک وجود کہیں ٹرافیاں،کہیں کپ،کہیں سرٹیفیکیٹ لیتے بے شمار روپ دیکھ رہا تھا۔

میں پلٹی تو عمار مسعود نظر آیا۔’’امّی سے ملی ہیں۔‘‘اس نے صوفے پر بیٹھی صدیقہ آپا کی طرف اشارہ کیا۔’’ہاں ہاں عمار انہی کے پاس تو بیٹھی تھی۔بہت باتیں کی ہیں میں نے اُن سے۔‘‘

’’تو اور کریئے نا باتیں۔‘‘عمار کی آنکھوں میں کچھ تھا۔میں سمجھی تھی۔اُس احساس کو،اس خواہش کو جانی تھی جس کا ایک چاہنے والے بیٹے کی نظروں میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔جو اپنی ماں کو بھرے میلے میں لایا تھا اور چاہتا تھا اس کی ماں اِس وقت کے ہر ہر لمحے سے خوشی کشید کرے۔اور پل بھر کے لیے تنہائی محسوس نہ کرے۔

اف یہ بڑا سنگین لمحہ تھا۔میری دوستوں کا پورا ٹولہ ذرا فاصلے پر دھری کرسیوں پر براجمان ہو بیٹھا تھا۔ایک خالی کرسی پر ہاتھ رکھے بینا گوئندی مجھے اشارے کرتی تھی کہ آجاؤ وگرنہ اس پر کوئی بیٹھ جائے گا۔اور سیما پیروز کی آواز بھی سنتی تھی۔’’دفع مار انہوں،اس کی چھیاں پیپیاں ختم ہوں گی تو آئے گی۔‘‘اور میں آگے بڑھ گئی تھی۔دنیادار تھی نا۔

عمار کے کالم نے مجھے رلایا۔اس کالم نے یقیناً بہتوں کو رلایا ہے۔عمار کی ماں جگت ماں تھیں۔صابر وشاکر،ہر تنگی ترشی میں شکر کرنے ،اللہ کی پسندیدہ خاتون۔عمار اور لبینہ جیسے میرا وجدان کہتا ہے ۔خدا نے اپنے فرشتوں کو کہا ہوگا۔ جنت کے فلاں حصّے کو سجاؤ۔جانتے ہو آج کون آرہا ہے؟

مجھ سے محبت کرنے والی ،میرے انسانوں سے پیار کرنے والی،میرا شکر کرنے والی،میرے قرآن سے عشق کرنے والی۔

☆☆☆

دمشق کی مونا عمیدی کا اور میرا رمضان

میرا پاکستانی رمضان تو ہمیشہ ہی ڈھول ڈھمکوں، نعتوں، گیتوں اور رمضانی تہذیبی رکھ رکھاؤ سے لدا پھندا ہوتا تھا۔ دمشق کی مونا عمیدی کا رمضان بھی اپنے رنگ ڈھنگ میں بڑا رنگ رنگیلا اور خوبصورتیوں سے مزین ہوتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب شام جنگ میں جل رہا تھا۔ ایسے میں مونا نے جو نوحے لکھے وہ میں آپ کو سناتی ہوں۔ پر پہلے تو کچھ مونا عمیدی بارے جانیے۔

دمشق میں چم (cham) پیلس ہوٹل کے بالمقابل نوبل بک شاپ پر دھری مونا عمیدی کی نظموں کے مجموعے کی پھولا پھرولی میں اِس نظم نے پل بھر میں ہی گرفت میں لے لیا تھا۔

آہ! بغداد کے سٹور بند ہیں
تریپولی کی گلیاں ویران ہیں
غزہ پر بمباری ہے
فلوجہ شعلوں میں نہا رہا ہے
دنیا سو رہی ہے اور عرب دنیا
بحث میں اُلجھی ہوئی ہے کہ
ورلڈ کپ میچوں میں کون جیتا ہے؟
رہے نام اللہ کا

یہ چونکا دینے والی نظم تھی۔

سیلز مین نے صاحب کتاب سے مزید تعارف کی غرض سے ایک اور خوبصورت کتاب سیرین فوک ٹیلز Syrian Folk tales میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے اِسے تفصیلی دیکھنے کی دعوت بھی دے دی۔

صفحات الٹنے پلٹنے اور کہیں کہیں پڑھنے سے احساس ہوا کہ بلاد الشام کے مختلف علاقوں کی یہ کہانیاں ایک انتہائی شاندار پیش کش تھی۔گرفت میں لینے والی، عام فہم زبان جو حقیقت اور طلسم، معلوم اور نامعلوم کے درمیان سفر کرتی تھیں۔مصنفہ شاعرہ بھی کمال درجے کی تھی۔دونوں کتابیں خریدلیں۔

میری درخواست پر بک شاپ کے مالک نے مصنفہ کا فون نمبر اور پتہ بھی دے دیا تھا۔یہ 2008 تھا۔شام پر امن تھا اور عام آدمی کب جانتا تھا کہ فضاؤں میں کہیں اس کی بربادیوں کے چرچے گردش میں ہیں۔

مونا عمیدی قدرے فربہی بدن کی سُرخ وسفید خاتون نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر خوش آمدید کہا تھا۔پاکستان کا جان کر اتنا خوش ہوئی کہ جتنی سفر سے کوفت ہوئی تھی سب اُڑنچھو ہوگئی۔

باتیں شروع ہوئیں وہ بھی دو عورتوں کی جو دو مختلف ملکوں، دو مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔عورتوں کے حوالے سے جو تصویر مونا نے مجھے دکھائی وہ ہماری تصویر سے کچھ ہی مختلف تھی۔شہری اور دیہی عورت کا جائزہ بھی تھا۔تاہم سیریا میں زیادہ آبادی شہری ہے۔

ملکی قانون میں بھی مرد عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔سیاسی طور پر جو کچھ سُننے کو ملا وہ صحت مند نہ تھا۔مونا بہت سلجھی ہوئی اور ملکی حالات پر گہری نظر رکھنے والی خاتون تھی۔

امریکن ماں اور شامی باپ کے گھر پیدا ہونے والی یہ بچی 1962 میں دمشق میں پیدا ہوئی۔انگریزی ادب میں گریجوایشن دمشق یونیورسٹی سے کیا۔اس کے ساتھ اس نے انگلش عربی ٹرانسلیشن کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔

فوک کہانیوں کی ان سلسلہ وار کتابوں نے ایک دھوم مچادی۔عام شامی کیا پڑھے لکھے لوگ بھی اپنے ملک کی ثقافت کے اِن خوبصورت رنگوں سے ناواقف تھے۔بہت پذیرائی ہوئی۔انگریزی میں شاعری بھی چونکا دینے والی تھیں۔

یہ جذبات و احساسات کا ایک جہاں کھولتی تھیں۔عراق سے متعلق نظمیں، لیبیا، مصر عرب دنیا کِس بے حسی کا شکار ہے۔بڑی طاقتوں کی سیاسی ریشہ دوانیاں، غلبے کی خواہشیں اور طاقت کے اندھے اظہار کیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں کے عام لوگوں کے خوابوں ،خواہشوں، امیدوں اوران کے بستے رستے خوش وخرّم گھروں کو کھنڈر بنا دیتے ہیں۔وہ جو کہانیاں اور محبت کے گیت لکھتے اور گاتے لوگ کیسے میٹھے جذبات سے ناطہ توڑ کر خنجر ہاتھ میں پکڑ لیتے ہیں۔

بے حد عام فہم لفظوں میں حقیقت کا چہرہ اوراپنے جذبات واحساسات کِس خوبی سے اپنے اندر سے نکال کر وہ باہر صفحے پر بچھا دیتی ہے۔

جب عراق خاک وخون میں نہا رہا تھا کہیں کِسی وژن رکھنے والے نے کہا ہے۔عراق سے فراغت کے بعد شام کی باری ہے۔آپ اِس بارے میں کیا کہتی ہیں؟ میں نے پوچھا تھا۔

اُس نے دکھ سے بھری ہوئی لمبی سانس باہر نکالتے ہوئے کہا تھا۔’’اندھی عرب دنیا اور دیگر اسلامی ملکوں کی قیادتیں سب آلہ کار بنی ذاتی اعتراض کیلئے ضمیر کے سودے کرتی کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیئے اپنی اپنی دنیاؤں میں گم ہیں۔کوئی بینون منصوبہ بھی

ہے۔کہیں پر عظیم تر اسرائیل کے لیئے کام ہو رہا ہے۔امریکی تھنک ٹینک اب عرب اور تیسری دنیا کے مفلوک الحال ملکوں کو کس اندھے کنوئیں میں دھکیلنے کیلئے سرگرم ہیں۔انہیں کوئی غرض نہیں۔'' پاکستان آکر اکثر میرا اُس سے رابطہ ہوتا۔2011 میں خانہ جنگی شام کے خوبصورت شہروں پر اپنی نحوست کے سائے پھیلانے شروع ہو گئی تھی۔

اس کی ای میل نے مجھے بتایا تھا کہ عمیدی کہیں نہیں بھاگی۔دمشق میں رہی۔دمشق سے اُسے عشق تھا۔اپنے خوبصورت ملک کے خوبصورت شہروں کو عراق کے شہروں کی طرح کھنڈر بنتے دیکھتی اور اپنے دکھوں کو لفظوں کے ہاروں میں پرو پرو کر اس کا اظہار کرتی رہی۔

اُس کی اس میل نے مجھے رُلا دیا تھا۔میں اسلامی کیلنڈر کے صفحات الٹتی ہوں جو میری کچن کی دیوار پر آویزاں ہے۔دو دن بعد رمضان ہے۔میرے بچپن کے رمضان کی خوبصورت یادیں اپنی پوری توانائی سے میری آنکھوں سے باہر جھانکی ہیں۔کیسے دل موہ لیتے منظر تھے۔افطاری کے کھانوں کی خوشبوئیں۔اذان کی پرسوز آواز ،تراویح کی رونقیں۔ٹپ ٹپ آنسو آنکھوں سے گرتے ہیں۔یہ رمضان کیسا ہے؟

صُبح کے منظر رلا دینے والے ہیں
دمشق کے لوگوں کو کس جرم کی پاداش میں
سزا دی گئی ہے
میں کیسے بتاؤں کہ
دمشق کے رمضان کی مقدس راتیں
مگر رنگین لالٹینوں اور قمقموں کے بغیر
خاموشیوں کو توڑتی ذکر کی آوازیں نہیں

دمشق میرے خوبصورت شہر
زندگی تو یہاں غروب ہوتے سورج جیسی ہوگئی ہے
اداسی اور مایوسی کی لہروں کو پھیلاتی
گھپ اندھیروں میں گم ہوتی

دمشق کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے میرا دل دُکھ اور یاس سے بھر جاتا ہے۔خوبصورت گھروں کے دروازے بند ہیں، کھڑکیاں بند ہیں۔دروازے جیسے مجھے کہتے ہیں ہم اپنے مکینوں کا انتظار کرر ہے ہیں۔وہ کب واپس آئیں گے؟

آج سوچتی ہوں کہ میرا رمضان کس قدر خوف میں ڈوبا ہوا ہے۔گلی کوچے سنسان ہیں۔مسجدیں ویران ہیں۔چینلز پر کرونا متاثرین کی بڑھتی تعداد لمحہ فکریہ ہے۔فلاں علاقہ لاک ڈاؤن کر دیا ہے۔فلاں گھر کو قرنطینہ میں بدل دیا ہے۔یہ وقت کا کونسا ظالم سمے ہے جو کسی عذاب کی صورت بنی نوع انسان پر نازل ہوا ہے۔ہاتھ نہ لگاؤ، قریب نہ جاؤ، کسی سے ملنا نہیں۔کب؟ کب آپ اس دہشت سے نکلیں گے نہیں جانتے۔

مونا کی ایک میل مجھے یاد آئی ہے۔میری بیٹی ابھی ایک ٹرپ سے واپس آئی ہے۔غم زدہ ماحول کے باوجود وہ خوش ہے اور مسکراتی ہے۔میں اپنی بیٹی کی آنکھوں سے چھلکتی امید کی روشنی دیکھتی ہوں۔

ہم ہیں
ہم بکھرے شکستہ خوابوں والی نسل
جوشیلوں پر سوتی، جاگتی اور قہقہے لگاتی ہے
اِس نسل کا غم اور دکھ بس صرف اتنا
کیا بجلی اور انٹرنیٹ جلد بحال ہوگا

ہم وہ نسل جس کی خوشیاں چوری ہوگئی ہیں
تاہم ہمارے نوجوان دل زندگی کیلئے ابھی بھی کشادہ ہیں
ہم وہ نسل جو کبھی کسی دن کہیں گے
ہم نے تاریکیوں سے جنگ کی اور اُسے کہیں دور دھکیل دیا

تو یقیناً ایک دن ایسا ہم پر بھی آئے گا۔ جب ہم ہر خوف و دہشت سے بے نیاز باہر نکلیں گے۔ اپنے دوستوں کو جھپیاں ڈالیں گے۔ ہنسیں گے اور قہقے لگائیں گے اور کہیں گے ہم نے کرونا سے جنگ کی اور اسے کہیں دور دھکیل دیا۔

☆☆☆

پیاری بیبیو! اب پیچھا چھوڑ دو میرے مولانا کا

دل کے بہت بڑے تو نہیں پر کہیں کسی چھوٹے سے گوشے میں مولانا کے لیے تھوڑی سی محبت ضرور ہے۔ یقیناً اس میں اُن کے انداز بیان کی نرمی، اس میں گھلی مٹھاس، لہجے کا دل کو گرفت میں لیتا اُتار چڑھاؤ اور نفسِ مضمون میں اللہ اور اس کے رسول کی محبوبیت کا ذکر بے تحاشہ و بے بہا۔ یوں میں کچھ اتنی مذہبی نہیں۔ تھوڑی باغی اور من موجی سی عورت ہوں۔ عمرہ اور حج مخصوص دعاؤں اور سورتوں کی بجائے حمدیہ نظموں اور گیتوں کے زور پر کر آئی تھی۔ بارہ عدد میری، پھوپھیری بہنیں جو ساتھ گئی تھیں نے ٹھٹھا لگاتے ہوئے فتوی دیا تھا۔ ''لو بھئی یہ تو گرنتھ پاٹ کرنے آئی تھی۔'' بس بھئی بس یہ اللہ اور اس کے بندے کا معاملہ ہے۔ اپنے لُچ تلنے بند کرو۔

ہماری دوست نیلم احمد بشیر کے بھی مولانا بارے بہت سے تحفظات ہیں۔ سب سے اہم تو حوروں کے سراپے، ملبوسات کی تفصیلات سے ہے۔ اب یہاں میں لاکھ ٹکریں ماروں کہ ''اری او نیک بخت یہ حوروں والے قصّے تو خود اللہ میاں جی تفصیلات سے سُناتے ہیں کہ جانتے ہیں اِس کمبخت مارے مرد کو رام بھی تو کرنا ہے۔

خواب نہیں دکھاؤں گا تو کام اچھے کیسے کرے گا؟'' یہ اور بات ہے کہ وہ ارضی حوروں پر بھی رالیں ٹپکاتا پھرتا ہے لونڈوں کا بھی خریدار ہے اور جنت کی حوروں کا بھی متمنی رہتا ہے۔ مولانا بھی شاید مردانہ نفسیات سمجھتے ہیں۔ اسی لیے تو حوروں کے باب میں اُن کا بیان مردوں کے لیے جیسے بادِ صبا کے نرم و ملائم جھونکوں کا پھولوں کے تختوں پر سے دھیرے

دھیرے بہنا۔ جیسے ندی کے سبک خرام پانیوں کا ہلکی سی گنگناہٹ سے چلتے رہنا جیسے احساس والا ہوتا ہے۔ ذاتی مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ سب کہہ رہی ہوں کہ میاں جی کی عمیق محویت اور بے پایاں دلچسپی کا مشاہدہ کیے بیٹھی ہوں۔ میں بھی ایک نمبر کی چلتر باز ہوں۔ پوری بتیسی کھول کر ہنستے ہوئے بولی تھی۔ ''فکر مت کریں۔ آپ کو ایک حور نہیں ملنی۔ میں نے بھی لاوڈ سپیکر پر اعلان کر دینا ہے۔ بچ کے رہنا اے حورو۔ یہ آدم زاد نرا نرگسیت کا مارا ہوا ہے۔

اِس نے تو تمہیں گھاس نہیں ڈالنی۔ اُلٹا تیار شیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر تمہیں نہیں خود کو دیکھتے ہوئے تم ہی سے پوچھے گا۔ بولو بتاؤ کیسا لگ رہا ہوں؟ میری پیاری حورو تم نے تو اپنا سر پیٹ لینا ہے۔ میں تو دل کو تسلی دے لیتی تھی کہ بھئی ہم تو ہیں ہی کوجے سے۔ تو بہنو تمہارا کیا بنے گا؟ مجھے تو یہی سوچیں کھائے جاتی ہیں۔''

شومئی قسمت ٹیلی تھون شو ہم نے بھی دیکھا اور ہماری پروگیسو دوستوں نے بھی۔ جھٹ پٹ مناظر سے ٹاکرے کی عدالت لگا لی۔ سچی بات ہے میرے تو اندر نے لتاڑ دی۔ شرم کرو کچھ۔ مُنصف داری کی اہل ہو تم۔ کانوں کو ہاتھ لگائے اور کلّے پیٹے۔ ''نہیں بھئی نہیں۔'' پر میری کون سُن رہا تھا۔ اعتراضات کی لام ڈور نے ایک حشر کا سا طوفان اٹھایا ہوا تھا۔ اردگرد کی دوست احباب بھی اکٹھی کر رکھی تھیں۔ لیجیے میرا تو وہ حال تھا کہ ابھی منہ سے بس اتنا سا ہی پھوٹی تھی۔

''اے ہے کچھ تو خیال کرو۔ صاحب علم و دین ہے۔ عزت و تکریم سے بات کرو۔ تم لوگ تو لٹھ لے کر پیچھے پڑ گئی ہو۔''

ایک دھاڑ ی۔

''اور انہوں نے کیا کیا۔ آپ تو اتنی ننھی سی چوچی کاکی ہیں نا۔ کچھ جانتی ہی

نہیں ۔ہمیں تو سر بازار رسوا کر کے رکھ دیا۔یعنی یہ وبا ہماری وجہ سے آئی ہے۔ہم اس کی ذمہ دار ہیں۔''

''لوحد ہوگئی ہے۔ مجھے کیا اتنا اوندھا سمجھ رکھا ہے۔ارے میں نے یہ شوسارا دیکھا ہے۔بھئی اب اگرانہوں نے کہا ہے کہ یہ ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔تو بتاؤ کچھ غلط کہا۔جھوٹے نہیں ہم ، چور نہیں ہیں ہم ، دھوکے باز نہیں ہم ، پکے منافق نہیں ہم ۔ چھابڑی والے سے لے کر اوپر تک بتادو جس کے جتنے بس میں ہے اتنا ہی وہ لُٹیرا ہے۔

''چلو سقراطی بقراطی تمہاری بات کو تھوڑا سا وزن دیتے ہیں۔یورپ کے لوگ تو جھوٹے نہیں۔وہاں یہ عذاب کیوں کشتوں کے پشتے لگا رہا ہے؟''

''اے بس میرا منہ نہ کھلواؤ۔مظلوم انسانیت پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں انہوں نے۔سارے زمانے کے متکبر اور اپنے مفادات کو ترجیح دینے والے۔ہاں اپنے لوگوں اور اپنے کاموں میں بے حد ایمان دار ہیں۔ مانتی ہوں ۔ پرا ے ہے خلاف فطرت کام کرتے ہی نہیں اُسے بزور بازو قانونی شکل بھی دیتے ہیں۔اب بتاؤ ہم جنس پرستی کو کس دھڑلے سے مانتے ہیں۔عورتیں عورتوں سے شادی بیاہ رچاتی پھرتی ہیں اور مرد مردوں سے۔اللہ نے تو فطرت کے مطابق جوڑے بنائے ہیں۔''

میں تو تابڑتوڑ حملوں کی زد میں تھی۔ایک اور دوست چلائی۔

''بس کریں۔عالم دین لوگ یوں درباری بنتے ہیں کیا۔ وہ تو سرکار دربار سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔''

''ارے بھئی جید علماء حاضری دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔امام ابو حنیفہؒ کی مثال کافی ہے۔عباسی خلیفہ دوم ابوجعفر منصور اور ملکہ حرا خاتون میں جھگڑہ ہوگیا تھا۔خلیفہ نے کسی مفتی، کسی منصف کو بلانے کی تجویز دی۔حرا خاتون نے امام ابو حنیفہؒ کا

نام لیا۔منصور اُن کی حق گوئی سے خائف ضرور تھا تاہم بلا بھیجا۔آپ حاضر ہوئے۔دونوں کے بیان سُنے ۔فیصلہ حق اور انصاف کی روشنی میں کر دیا کہ اسلام میں چار نکاح جائز ضرور ہیں مگر شرط عدل وانصاف کی ہے۔انصاف کے بغیر یہ گناہ ہے۔''

''تو تم انہیں نہیں دیکھتی ہو۔ بادشاہ وقت کے چرنوں میں بیٹھ کر فرماتے ہیں۔عمران کو اجڑا چمن ملا ہے۔بیچارہ تنہا ایمان دار شخص کہاں تک اسے آباد کرے گا۔سبحان اللہ اِس ایمان دار شخص نے سارے لٹیرے اردگرد اکٹھے کیے ہوئے ہیں۔کسی کے اڑن کھٹولے میں بیٹھتا تھا اور کوئی گھر کا خرچ چلاتا تھا تو پھر انہوں نے اصل زر بمعہ سود وصول نہیں کرنا تھا۔اور جن کے کارن یہ چمن اجڑا آپ کے تو اِن سے بھی گہرے مراسم تھے۔

دعائیں اور عشایئے تو وہاں بھی چلتے تھے۔اور ہاں قوم کی بیٹیوں کی بے حیائی اور انہیں نچوانے کا بھی بڑا دکھ ہے انہیں۔تو جس کی امانت ودیانت کے گُن گا رہے تھے اس کے جلسے اور دھرنے تو شاید یاد ہی نہیں۔قوم کی بیٹیاں اور بیٹے گانوں پر بھنگڑے ڈالتے تھے۔لڈیاں پڑتی تھیں۔واہ کیا دہرے تہرے معیار ہیں۔''

ہماری ایک اعتدال پسند سی دوست نے بھی گرہ لگائی۔'' کہتے ہیں اپنے پاس عقل نہ ہوتو ہمسایوں سے لے لو۔اس نے تو اُسے بھی قبول نہ کیا۔سیاست کی اِس وادی پُر خار میں داخلے سے قبل وہ ملک معراج خالد سے ملنے گئے۔انہوں نے ارادے جان کر کہا میرے خیال میں اگر تم تعلیمی شعبہ میں اپنی توانیاں لگاؤ۔قوم تعلیم یافتہ تو ہوگی ہی ہاں تمہارے لیے اقتدار کے دروازے بھی آپوں آپ کھل جائینگے۔

تمہارا تو منہ ماتھا چوم کر اگلوں نے تخت پر بیٹھا دینا ہے۔مگر ہمارے ہیرو کو بہت جلدی تھی۔زیرک سیاست دان کی باتیں اس کے عزائم سے لگا نہ کھاتی تھی۔آکسفورڈ کا پڑھا لکھا ٹیکنیکلی تدبیریں کرنے کی بجائے دعائیں کروا رہا ہے۔گھبرایا پھر رہا ہے۔پہلے دوا

پھر دعا۔ دین کا یہ سبق پتہ نہیں کیوں انہیں یاد نہیں رہتا۔‘‘

’’چلو میری پیاریو معاف کر دو۔ دیکھو انہوں نے کھلے دل سے معافی مانگی ہے۔ یہ ان کا بڑا پن ہے۔ اپنی غلطی کو ماننے کی تو ہمارے ہاں روایت ہی نہیں۔‘‘

☆☆☆

ہمارے گھر کا اہم ٹاک شو

سوچتی ہوں گلزار کو الہام ضرور ہوتا ہے جو وہ آنے والے وقت کی چاپ سُن لیتا ہے۔آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا گہرہ سبزہ، سُرخ ،بسنتی ، نیلے، پیلے پھول اور گھاس پر بیٹھا دلفریب پروں والا اجنبی سا پرندہ جسے کہیں بچپن میں دیکھتے تھے۔اندر کہیں ہوک اٹھی تھی۔آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔خوشی اور دکھ دونوں کیفیات کی بیک وقت زد میں تھی۔میرے خوبصورت پرندے واپسی کا کتنا بڑا تاوان لیا ہے تم نے؟ آسمان انسانوں سے ہوائیں اور فضائیں شوروغل سے خالی ہیں۔زندگی منجمند ہے۔کہیں اگر منظر میں حسن ہے تو وہیں خوف اور یاس کا زہر بھی گھلا ہوا ہے۔اندر کے ہر مو، ہر مسام سے صدائے احتجاج ہے۔میں گھر میں نہیں بیٹھ سکتی ہوں۔منیرہ شمیم کی شئیر کی ہوئی گلزار کی نظم نے گویا کلیجہ مٹھی میں جکڑ لیا ہے۔

سب کو معلوم ہے باہر کی ہوا قاتل ہے
یونہی قاتل سے الجھنے کی ضرورت کیا ہے
زندگی ایک نعمت ہے اِسے سنبھال کے رکھ
قبرستانوں کو سجانے کی ضرورت کیا ہے
دل کے بہلانے کو گھر میں وجہ کافی ہے
یونہی گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت کیا ہے

نظم کے آخری شعروں کو پڑھتے ہوئے جی چاہا تھا کہ گلزار سے اتنا ضرور کہوں گلزار جب گلیوں میں بھٹکنے کے چسکے اور لتیں لگ جائیں تو گھر میں ٹکنا مشکل ہوتا

ہے۔مشقت کے گودے سے بھری ہڈیوں کو آرام کی لطافت راس نہیں آتی۔ بیچاریاں چٹخنے لگتی ہیں۔

پھر دیر تک سوچیں تھیں۔ لاؤنج سے آتی ایک اور گھائل کرنے والی آواز نے اداسی بڑھادی تھی۔

شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ خالی، خانہ خالی

جام خالی، سفرہ خالی، ساغر و پیمانہ خالی

چلو اللہ کا شکر ہے گھر خالی نہیں۔ہاں محمود شام کی حمد یہ نے رُلا دیا ہے۔

درس گاہوں پر ہیں غالب وحشتیں ویرانیاں

بند ہیں رحمت کے در ہم کھٹکھٹا سکتے نہیں

سچی بات ہے ہمیں تو اِس نیو ورلڈ آرڈر کے قصابوں نے گذشتہ دہائیوں سے جس خوف اور عذاب میں مبتلا کرر کھا ہے۔اس نے ہی ہمارا ناس مارا ہوا تھا۔اب بیچ میں اِس کمبخت مارے کرونا ورلڈ آرڈر کی کمی رہ گئی تھی کہ یہ بھی اپنا لُچ تلنے آ گیا۔اب بندہ پوچھتا ہے کہ کیا یہ بھی اِن قصابوں کی کوئی سازش ہے۔ویسے تو سپر پاور کے بڑے گماشتے بذات خود اعتراف کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے ہونے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔اور جب دنیا اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں اُلجھ رہی ہوتی ہے۔ان کی ترجیحات کا رخ بدل جاتا ہے۔وہ یعنی (امریکی) تاریخ کے اداکار ہیں اور لوگ (یعنی دنیا) صرف یہ جاننے میں ہی لگی رہتی ہے کہ ہم کر کیا رہے ہیں۔یا پھر کائنات کی سب سے بڑی سپر پاور اپنے بلونگڑوں بچونگڑوں کو تھوڑا سا جھٹکا دے رہی ہے کہ چھٹے پڑ رہے تھے۔ فلسطین،عراق،شام،افغانستان میں ان کے عزائم نے کیا کیا نہ ستم ڈھائے۔

شام کا وہ عظیم انقلابی شاعر جس کی نظم ''میں دہشت گردی کا حامی ہوں۔'' I am

with terroism۔ بے اختیار یاد آ گئی ہے۔

جب تک نیو ورلڈ آرڈر
امریکہ اور اسرائیل کے درمیان منقسم رہتا ہے
یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے
میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

ابھی تو شاعر نائن الیون کی تباہ کاریاں دیکھنے سے پہلے ہی رُخصت ہو گیا تھا۔ فلسطینیوں کے انتفادوں نے ہی اُس کے تن من میں آگ لگا رکھی تھی جس کے اظہار کی انقلابی گونج مشرق وسطیٰ کیا پوری دنیا میں بلند ہوئی تھی۔ امریکہ کے ایونوں میں کھلبلی مچی تھی۔

جیتا ہوتا تو نائن الیون پر جانے کتنے بین لکھ لکھ مارتا کہ بغداد کے اسپتالوں کے مناظر نے مجھ جیسی کا حشر نشر کر دیا تھا۔ انسانیت بستروں پر لیٹی بلک رہی تھی۔ جی چاہتا تھا امریکہ کو کچا چبا جاؤں۔ آگ لگا دوں۔ کمزور کی اوقات کیا اس کے غُصے کی حقیقت کیا۔ سارا رولا طاقتوں کی سپرمیسی کا۔ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں۔ دو تجارتی حریف۔ حال کی سُپر پاور اور مستقبل کی بظاہر جگہ لیتی طاقت۔ کِس کِس کی منصوبہ بندی، پہل کہاں سے ہوئی؟ کِس نے کِس کو نشانہ بنایا؟ حقائق تو کھل جائینگے تھوڑا وقت لگے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طاقت کے اِس کھیل میں اپنے لوگوں کو مروانا بھی تو پروگرام کا حصّہ ہی ہوتا ہے۔

یہ تو ہوئیں دل اور دنیا کی باتیں۔ اب کچھ گھر کی باتیں بھی سُن لیں۔

کرونا کی برکتیں صبح تو دس بجے سے پہلے نہیں ہوتی ہے۔ ہماری کچن میڈ مسرت

بھی گھر والوں کے ساتھ ہی سوتی اور اٹھتی ہے۔کچن میں گئی۔ برتنوں کا کھلارا سنک اور سلیبوں پر حسب معمول بکھرا پڑا تھا۔گھر کے بچے رات بھر تو مستیاں کرتے رہتے ہیں۔میرا بھی اِن دنوں اس کی مدد کرنے کا معمول بنا ہوا ہے کہ سب کچھ دھودھلا کر برتن ڈبے ٹھکانوں پر سیٹ کر دیتی ہوں۔چلو بیچاری خوش ہو جاتی ہے۔گیارہ بجے کچن کا چکر لگا۔مسرت نہیں تھی۔دل دھڑکا۔خدایا خیر ہو۔کیونکہ ذمہ دار لڑکی ہے۔اس کے کمرے کی طرف بھاگی۔ گورے چٹے گلابی چہرے کو نڈھال دیکھ کر تو جیسے پاؤں تلے سے زمین ہی سرک گئی۔گھبرائے لہجے میں پوچھا۔کیا ہوا ہے؟ وہ ذرا پیریڈز ہو گئے ہیں۔

''اف شکر پروردگار تیرا''سکون وطمانیت کی لہر سارے سریر میں دوڑ گئی۔ممتا سے لہجہ بوجھل ہو گیا۔''آرام کرو''یہ مسئلہ تو اس کے ساتھ تھا۔شکر الحمداللہ کرتی کچن میں آئی۔بہو بھی آ چکی تھی۔اُسے بتایا۔ٹرے میں اس کے لیے انڈا چائے سجا رہی تھی کہ میاں جی خیر سے وارد ہوئے۔بیوی بہو دونوں کو کام کرتے دیکھ کر بولے۔

''مسرت کہاں ہے؟''

''اس کی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں۔''

اب سوالوں کی لام ڈور شروع ہو گئی۔بخار ہے کیا؟ گلا تو خراب نہیں۔چھینکیں تو نہیں آ رہی ہیں۔ڈاکٹر عمر کو فون کرو۔سوال پر سوال۔اف میرے نتھنوں میں خارش ہونے لگی تھی۔جھلاّ کر میں نے کہا۔

''کمرے میں جا کر بیٹھیں۔فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''کیسی اوندھی عورت ہو۔کس مزے سے کہہ رہی ہو فکر کی بات نہیں۔چھوٹے بچے ہمہ وقت اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں۔''

اب میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے چلائی۔

''بڈھے ہو گئے ہو پر عقل نہیں آئی۔ اُسے پیریڈز ہو گئے ہیں۔ درد ہوتا ہے۔''

''او ہو اچھا۔'' کان لپیٹ کر کھسکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

ابھی گھنٹہ ہی گزرا ہوگا۔ چھوٹا بیٹا باہر سے آیا۔ کچن میں ماں اور بیوی کو دیکھ کر بولا۔ مسرت کدھر ہے؟

ایک تو اس کا سنگھ (گلا) اتنا بڑا ہے کہ عام لہجے میں بات بھی کرے تو لگتا ہے جیسے لڑ رہا ہے۔ یوں بھی بیوی کچن میں ہو اُسے اُچھل پیڑے (بے چینی) لگ جاتے ہیں۔ شکر ہے کہ لڑکی بڑی بیبی ہے۔ وہی باپ جیسے سوالوں کا سلسلہ۔ وہی خدشات۔

غصّے سے مجھے پھر چلاّنا پڑا تھا۔ ''اُلّو کے پٹھے ڈنگر ہو تم۔ تین بچوں کے باپ ہو۔ کرونا تمہارے اعصاب پر سوار ہو گیا ہے۔ مت ماری گئی ہے۔ خرابی طبیعت کا کوئی دوسرا امکان تمہارے بھیجے میں ہی نہیں آ رہا ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ پیریڈز ہو گئے ہیں اُسے۔'' یا اللہ یہ ہماری مسرت کے پیریڈز تو آج گھر کا اہم ٹاک شو بن گیا ہے۔

مجھے اپنا وقت یاد آیا تھا۔ اماں ابّا یاد آئے تھے۔ مسرت جیسا ہی حال ہوتا تھا۔ ابّا لیٹے دیکھ کر تشویش سے اماں سے کہتے یہ کیوں لیٹی ہوئی ہے۔ اماں کہتیں اس کے پیٹ میں درد ہے۔ اچھا تو میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔ امّاں اپنے ماتھے پر دو ہتڑ سا مارتیں اور کہتیں۔

اللہ ایس سودائی دا کی کران (اس احمق کا کیا کروں) یہ مرد لوگ اتنے گاؤدی کیوں ہوتے ہیں۔ یا پھر کرونا کے سوا ہمیں کچھ اور سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔

☆☆☆

غرناطہ کی چھتوں پر اذان نہیں اذانیں

ہم پاکستانیوں کے لیے کرونا کی یہ افتاد کچھ اتنی نئی تو نہیں ہاں البتہ اس کی سنگینی بہت گھمبیر ہے۔ دہشت گردی جیسے عفریت کو کس طرح اِس قوم نے بھگتا ہے یہ کوئی ہم ماؤں سے پوچھے جن کے دلوں کی ہر دھڑکن اور سانسوں کی ہر تار میں عافیت اور خیر کی دعائیں پروئی ہوتی تھیں۔ بات کو لمبی کیا کروں اِن بڑی طاقتوں کے مفادات غلبے اور حرص و ہوس کے ہتھکنڈے کیسے ہم کمزور ملکوں کو خون میں نہلاتے رہے ہیں۔ خدا تو انہیں کہیں یاد ہی نہیں تھا۔

پچھلے دنوں مذہبی رواداری اور یگانگت کے بہت سے مظاہرے دیکھنے کو ملے۔ اِن میں ٹرمپ کا تلاوت سُننا، بل گیٹس کا کہنا یہ ہمیں سکھانے آیا ہے۔ روحانی طاقت کا اعتراف، ویٹی کن سٹی میں سورہ رحمٰن کا گونجنا اور سپین میں صدیوں بعد اذان کی آواز۔ اخبارات نے اسپین میں اذان کو جس طرح نمایاں جگہ دی وہ کہیں اس کرب کی تسکین کا اظہار تھا جو ہم عام بے عمل سے مسلمانوں کی جذباتیت سے جڑا ہوا ہے۔ جہاں انہوں نے صدیوں حکومت کی تھی۔

اسپین سیاحت کے حوالے سے اہم ملک۔ مورش تہذیب کا نمائندہ جس نے صدیوں مور مسلمانوں کے اُس علمی، ادبی فکری، سائنسی، تعمیری، تہذیبی و تمدنی اثاثوں کو نظر انداز کیا۔ یہاں بریفالٹ کو خراج تحسین پیش کرنا پڑے گا کہ جس نے کہا اس میں کوئی شک نہیں کہ عربوں نے کوئی نیوٹن اور کوپر نیوکس پیدا نہیں کیے، لیکن انہوں نے جو کچھ یورپ کو دیا اس کے بغیر کوپر نیوکس اور نیوٹن پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ تاہم گذشتہ صدی نے اہل

اسپین کواس کا احساس دلایا اورانہوں نے اِس کا اعتراف کیا۔

آٹھ جولائی 2003 کا یہ حبس آلود سا دن تھا۔ اخبارات اور ٹی وی نے ایک ایسی خبر نشر کی تھی جس نے آنکھیں گیلی کر دی تھیں۔

خبر الجزیرہ ٹیلی ویژن لائیو نشر کر رہا تھا۔ غرناطہ کی اس نئی تعمیر شدہ مسجد کے موذن کا مینار پر چڑھنا اور نصف ملنیئیم کے طویل عرصے بعد اللہ اکبر کی صدا کا گونجنا کیسا ایمان افروز واقعہ تھا۔

اس کو بنانے کے لیئے کتنا انتظار کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل بڑی لمبی ہے۔

تعریف وتحسین کے لفظ بہت چھوٹے ہیں اُن پندرہ سولہ ہزار ہسپانوی مسلمانوں کے لیے جن کے اندر عزم صمیم کی لو اُنہیں سرگرم رکھتی تھی۔ مسلسل جدوجہد ، مسلسل کوشش۔ حکومتی سطح پر ارکان کی مخالفت بہت شدید تھی۔

تاہم ایک وقت ایسا آیا کہ سیاسی طور پر مسلسل بلند ہونے والی اِس آواز کو دبانا مشکل ہوگیا تھا۔ یو اے ای اور شارجہ کے حکمران نے اِس کے کم وبیش سارے اخراجات اٹھائے تھے۔

نصف صدی سے بھی زیادہ کی کاوش کا یہ حسین تحفہ اس کی خوبصورت اپنی طرز کے منفرد اکلوتے مینار کی چھوٹی سی جگہ پر جب موذن نے اللہ اکبر کی صدا لگائی تو غرناطہ کی پہاڑیوں، غرناطہ کے میدانوں، اس کی ہواؤں، اس کی فضاؤں میں وہ آواز گونجی تھی جسے سُنتے ہوئے آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے تھے۔

اوراب البیازین کے گھروں کی چھتوں پر اذانیں گونجی تھیں۔ پروردگار عزتیں اور ذلتیں دینا صرف تیرا ہی کام ہے۔

تین سال قبل اکتوبر کی ایک میٹھی سی دوپہر جب میں غرناطہ میں تھی تو اُس مسجد کو

دیکھنے کے لیے مری جارہی تھی۔اب شہرہ آفاق الحمرا محل کی ڈھلانوں پر بکھری مسلمانوں کی عرب تہذیب وثقافت کی نمائندہ بستی البیازین جانے اوراس کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھنے کے لیے جارہی ہوں۔

سیاہ آہنی گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔دعائیں ہونٹوں پرتھیں۔درختوں سے گھری خوبصورت روشن اورفوارے سے سجی اپنی پشت پر الحمرا اور پہاڑوں کے منظر دکھاتی یہ کیسی دل کو بھائی تھی۔

اور جب اذان کی آواز گونجی ۔یہ وجد کی سی کیفیت تھی جو ہم دوستوں پر طاری ہوئی۔اندرایک روح پرور منظر ہمارا منتظر تھا۔حد درجہ خوبصورت اور پرکشش محراب ومنبر بھی اپنی نوعیت میں منفرد لگے۔نماز ادا کی ۔شکر تھا۔دعائیں تھیں اور گہری عبودیت کا اظہار تھا۔

پلازہ سان نکولس کے کشادہ ٹیرس کی منڈیر پر بیٹھنا،موروں کے اِس شاہکار محل کی برجیوں،میناروں کو چمکتے سونے جیسی دھوپ میں دیکھنا اورعقب میں سیرا نویدا کے کہیں کہیں برف میں ڈھنپے پہاڑوں کوسائبانوں کی طرح مستعد محسوس کرنا جیسا مسرور کرنے والا کام بھی ہم نے وقت کی قید سے جیسے بے نیاز ہوکر کیا۔

اوپر والے کی احسان مندی تو ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ بھلا جو جگہ بل کلنٹن کی یادوں میں کھلبلی مچاتی رہی ہواور جسے وہ دنیا کا بادشاہ بن جانے پربھی دیکھنے کے لئیے آئے کہ وہ اِس سے بہت متاثر ہوا تھا۔تو کہنا پڑے گا کہ سارا منظرکسی شاہکار پینٹنگ کی طرح لگتا تھا کہ جسے دیکھتے جاؤ اوردل نہ بھرے۔

حسین اورموہ لینے والا تو سب کچھ تھا مگر پس منظر میں جو دکھ اورکرب تھا اس کا احساس تواِس دل کوہی تھا کہ چرچ تو کبھی مسجد تھی جہاں سجدہ دیا جا تا تھا اوردرختوں سے سجا یہ کشادہ سا پلازہ کبھی قلعہ تھا۔ Alcazaba Kadima جس کا کوئی ٹوٹا پھوٹا نشان تو

نظر آتا ہے۔ باقی سب صفایا ہوگیا ہے۔

دراصل Alcazaba کے ساتھ بھی تو بڑی تلخ سی یادوابستہ ہے کہ جب غرناطہ کا سقوط ہوا تو پہلا کام تو گھنٹی کا نصب کرنا تھا جو رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق ایمان کا حصّہ ہے۔ لاویلا اسی کو کہتے ہیں۔

2 جنوری کو گھنٹی کا بجنا1492 غرناطہ کو واپس لینے کا دن ہے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سچی بات ہے یہ البیازین ایسا حسین وجمیل ٹکڑہ ہے کہ جسے جتنا دیکھو اُتنا کم۔ اسے جب تک انسانی آنکھ سے نہ دیکھا جائے اس کے حُسن کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔ تنگ تنگ خم دار گلیوں والا یہ البیازین جو مورش تہذیب وتمدّن کے آغاز سے سجا قرون وسطیٰ کا حُسن آنکھوں کے سامنے مجسم کرتا ہے۔

البیازین کے جس محرابی دروازے سے ہم اندر داخل ہوئے وہ گیٹ اف Puerta Elvira قدرے سرخی مائل بھورا تھا۔ نام کے بارے بہت سی روایات ہیں۔ مجھے تو صرف ایک حقیقت کے قریب تر لگی تھی کہ جب لگ بھگ کوئی تیرھویں صدی کے کم وبیش وسط میں مسلمانوں کو بیازاBaeza شہر سے عیسائیوں نے دیس نکالا دیا تو وہ بھاگ کر غرناطہ کی اِن شمالی پہاڑیوں پر آباد ہوگئے اور انہوں نے اِس مضافات کو اپنے پرانے شہر کا نام دیا۔ جسے آج البیازین کہا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ال کذابا Alcazaba تھا۔ اور قرطبہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی طاقت کا سارا مرکز غرناطہ بن گیا۔ شہر خوبصورت مسجدوں سے سج گیا۔ یہ کوئی آٹھ دس نہیں، پچیس تیس کے لگ بھگ تھیں۔ خوبصورت مکانات، بازار محرابی بڑے بڑے چوبی پٹوں والے گیٹ یا باب، ڈھلانی گلیاں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک ایسی بستی کا روپ دھار گئی جو آج بھی اپنی اسی انفرادیت کے ساتھ قائم ہے۔

یہاں کے بہت سارے چرچ تو وہ ہیں جو مسلمانوں کی مسجدوں پر بنائے گئے ہیں۔بعض خوبصورت مینار بیل ٹاور بنا دیئے گئے۔اِن میں سب سے خوبصورت اور حسین Al Minar de San Colegitaاوراس کا صحن تھا جو کہ کبھی مسلمانوں کی بہت بڑی مسجد تھی۔جو چرچ آف del Salvadorسے منسلک کر دیا گیا تھا۔

چرچ کی یہ کہانی اس ظلم وزیادتی کو بہت اچھی بتاتی ہے کہ اسلام کو عیسائیت میں بدلنے کے کیا کیا جتن ہوئے۔اوران کے اپنے شہر میں مسلمانوں اوران کے ساتھ ساتھ یہودیوں پر بھی ظلم وستم کے کون کون سے پہاڑ نہیں ٹوٹے۔

اس گیٹ سے اندر داخل ہونا گویا اس عہد قدیم میں داخل ہونے کے مترادف تھا۔یہاں کہیں کہیں دیواروں پر بکھری خستگی اور کہنگی بھی نظر آئی۔کہیں بلند وبالا پتھریلی اینٹوں اور پتھروں کی سیڑھیاں جو گھروں کے ساتھ ساتھ اوپر چڑھتی چلی جاتی تھیں۔پھول پتے بیلیں گملے بھی آنکھوں کو طراوت دیتے تھے۔جس گلی میں جاتے کچھ نہ کچھ وہاں مختلف ہی نظر آتا۔کہیں کوئی محرابی دروازہ توجہ کھینچتا۔کہیں گلی یا تنگ دہانہ کسی الف لیلوی داستان کی طرح پھولوں سے چمکتے کِسی میدان میں دھکیل دیتا۔کہیں چونے اور گچ میں گندھے مکان نظر پڑتے۔

البیازین۔یہ کیسا جہان اور کیسی دنیا تھی۔قدامت کے حسن میں پورم پور ڈوبی۔نئے رنگ کے پینٹ پالش رنگ وروغن کے غازے میں لپٹی ہوئی۔ورلڈ ہیرٹیج کی گود لی ہوئی۔عربوں کے شاندار ورثے کی مالک۔

شائقین کا ہجوم تھا۔بیگ کندھوں سے لٹکائے جتھوں کی صورت پروانوں کی طرح اس کی گلیوں میں منڈلاتے پھرتے تھے۔کہیں گھروں کی بالکونیاں اور فرنٹ کی دیواریں آرائشی نوادرات سے سجی آپ کی آنکھوں سے اشارے بازیاں کرتی تھیں۔کہیں کشادگی اور

کہیں اتنی تنگی کہ دومنزلہ سہ منزلہ گھروں کی بالکونیوں اور دریچوں سے ذرا سا ہی ہاتھ بڑھانے سے سالن اور چائے کے کپ کا لین دین ہوجائے۔مکانوں کی چھتیں اور چوباروں کی کھڑکیاں ایک دوسر کے گھر میں گویا کھلتی تھیں۔گلیوں کے نام کہیں چونکاتے تھے۔گو بگڑے ہوئے تھے مگر ذراسا زور دینے اور تھوڑی سی فکر ماضی سے ناطہ جوڑ دیتی تھی۔

کہیں پیڑوں پر سجے سنگترے، مالٹے۔ہائے جی چاہتا تھا توڑ کر کھائیں۔کہیں سے لون مرچ مل جائے تو چٹخارے بھرتے ہوئے بچپن آنکھوں کے سامنے آجائے گا۔کہیں چڑھائی ،کہیں اُترائی ،کہیں پھول ،کہیں بیلیں،کہیں پیڑ،کہیں درخت۔سب اس کا حسن بڑھانے کا باعث ہیں۔

سب سے زیادہ لُطف سان نکولس چرچ کے احاطے میں آیا جہاں اونچی منڈیر پر ٹورسٹوں کے پُرے بیٹھے ان رنگ رنگیلے جپسیوں کے فلیمنکو گیت اُن کے گٹاروں پر سُنتے تھے۔اِس منظر کا حصّہ بننے میں ہم نے لطف اٹھایا۔

☆☆☆

اِس مشکل گھڑی ملک کے ساتھ کھڑے ہوں

یہ لاک ڈاؤن ہوئے تیسرے دن کی شب کا پہلا پہر ہے۔ڈی ایچ اے فیز 5 کے ایک گھر میں ایک نوجوان صنعت کار اسامہ عثمان ایک فون کال سُننے میں مصروف ہے۔بات کرنے والے نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ وہ پنجاب انفرمیشن ٹیکنالوجی کے پلان نائن سے بول رہا ہے۔تکلیف دینے کے لیے معذرت خواہ ہیں۔دراصل انہیں وینٹی لیٹرز سپلیٹرز Ventilator Splitter کے لیے اس کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔اس پرزے کی ہنگامی بنیادوں پر تیاری چاہیے۔وینٹی لیٹرز کی شدید کمی کو وہ اِس پرزے کی مدد سے بہت آسانی سے چار مریضوں کو ہینڈل کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔نوجوان نے بتایا کہ فیکٹری بند ہے۔اور چھوٹے بڑے کارکن سب چھٹی پر ہیں۔اور وہ خود بھی گھر پہ ہے۔

پلیز آپ ابھی فیکٹری کھولیں۔اپنے انجنیئرز کو بلائیں۔ہم پہنچتے ہیں۔اسامہ نے اپنے بہترین فنی ماہروں کو فوراً فیکٹری پہنچنے کا کہا۔پی آئی ٹی بورڈ کے لوگ تھری ڈی پرنٹر پر تیار کرنے والے پرزے کی ڈرائنگ اور تصویریں لے کر آئے تھے۔دونوں پارٹیوں کے درمیان فنی پہلوؤں پر بحث مباحثہ اور اظہار رائے رات گئے تک جاری رہا۔

انجنیئرز کے سامنے بہت سارے مسائل تھے۔انہوں نے کہا۔ایسے مولڈ بنانے میں دن لگیں گے۔ مارکیٹیں بند ہیں۔سامان کی خریداری کا بھی مسئلہ ہے۔مگر نوجوان صنعت کار نے کہا۔سُنو میرے ساتھیوں ملک پر کڑا وقت ہے، جو سامان ہمارے پاس ہے

اسے نکالیں جو چیزیں تیار ہیں انہیں ضائع کر کے اس کا لوہا اور دیگر استعمال میں آنے والی چیزیں نکال لیں۔اس ملک نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔اس وقت ہمارا فرض بھی اس کا حق لوٹانے کا ہے۔

تھری ڈی پرنٹر سے تیار ہونے والا یہ پرزہ چھ گھنٹے میں بن رہا تھا۔مینوفیکچرنگ صرف امریکا میں تھی۔لاگت بہت زیادہ اور پائیداری بھی بہت کم تھی۔

اور جب نوجوان دو بجے انہیں رخصت کرر ہا تھا۔اس نے دو باتیں کیں۔وہ ابھی کام شروع کرنے لگے ہیں۔انہیں امید ہے 70,60 گھنٹوں میں ایک عمدہ پائیدار چیز آپ لوگوں کو تیار کر کے دیں گے۔مگر اس کی کوئی قیمت نہیں ہوگی یہ بلا معاوضہ تمام اسپتالوں اور میڈیکل یونٹوں کو مہیا کی جائے گی۔

آپ نے ایک بات کا ہم سے وعدہ کرنا ہے کہ کسی پرائیویٹ سیکٹر کو یہ نمونہ نہیں دینا۔ اس پرزے کو صرف فلاحی مقاصد کے لیے ہی استعمال کیا جائے۔ اس کی خرید وفروخت پر پابندی ہوگی۔اپنے ملک کو اور دیگر ملکوں میں جہاں بھی کرونا وائرس ہے اس کی فراہمی ہماری ذمہ داری ہوگی۔

پرزہ 72 گھنٹے میں تیار کر لیا گیا۔ پہلا ٹرائل فیروز پور روڈ کے ایک اسپتال میں کیا گیا۔ایک دو چھوٹی سی خرابی کو دو تین گھنٹوں میں دور کیا گیا۔ڈاکٹروں کی ٹیم نے اوکے کیا۔اب یہ پرزہ ایک ہزار کی تعداد میں روزانہ تیار ہو کر اسپتالوں کو مہیا کیا جار ہا ہے۔

اسامہ عثمان نے میڈیل یونٹوں کو وافر تعداد میں اس کی فراہمی کو یقینی بنایا تاکہ ڈسپوز آف کرنے کی صورت میں کمی نہ آنے پائے۔اِسے کمرشل نہ کرنے کے سلسلے میں فرم نے اس پر اپنا خصوصی نشان کنندہ کروایا ہے۔اسامہ عثمان نے کہا ہے۔یہ پرزہ دنیا میں جہاں ضرورت ہوگی بلا معاوضہ فراہم کیا جائے گا۔اپنے ایسے سب شاہینوں کو جو اس وقت

اسپتالوں میں ڈاکٹرز، نرسوں اور دیگر عملے کے ساتھ کرونا کی آگ میں اپنے پاکستانیوں کو بچانے کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔ہم دعائیں اور محبتیں پیش کرتے ہیں۔

دوسری خبر پڑھیں۔ میں ٹی وی بہت ہی کم دیکھتی ہوں۔ ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں۔ پانچ دن پہلے پرائیوٹ سکول مالکان اور سرکاری انتظامیہ کے بارے خبر تھی کہ حکومت 20% فیسوں میں رعایت چاہتی ہے اور مالکان انکاری ہیں۔خبر میرے ساتھ میرے میاں نے شیئر کی اور کہا کس قدر افسوس کی بات ہے۔ بحث وتکرار کا تو وقت ہی نہیں۔حکومت کے ساتھ کھڑے ہونا اہم ہے۔میٹر میرا بھی گھوما۔کون ناشکرے لوگ تھے۔اف کتنے احسان ہیں اِس ملک کے۔کیا میں آج یہاں کھڑی ہوتی جہاں اس وقت ہوں۔ جالندھر کی ایک مضافاتی بستی میں پیدا ہونے والی نہ لاہور شہر میں آتی، نہ اتنی پڑھائی لکھائی کرتی۔ گاؤں کے اسکول سے پرائمری یا مڈل پاس کر لیتی۔ اُپلے تھاپتی اور چولہے میں اُپلوں کے دھوئیں سے آنکھیں پھوڑتی۔ اُپلے اور لکڑیاں تو اماں نے بھی جلائیں مگر بیٹی کے ہاتھوں میں کتابیں دیں۔ستر کی دہائی کے آوائل میں ہی اماں کا چھوٹا سا باورچی خانہ سوئی گیس سے سج گیا۔

یہ میڈیا والے بھی نابس مخصوص اور تعلقات والوں لوگوں کو ہی بلائیں گے۔ پرائیوٹ سیکٹر خسارے میں ہے۔اگر وہ اعداد وشمار سے ثابت کرتے ہیں تو قطعی غلط ہیں۔جھوٹ بولتے ہیں۔ابھی بحث چھڑی ہوئی ہے۔ مالکان مان نہیں رہے ہیں۔ابھی تک معاملہ بیچ میں ہی لٹک رہا ہے۔اب شنید ہے کہ وزیرِاعظم کے پاس چلا گیا ہے۔ بہرحال ہم تو وہ لوگ ہیں جو ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسے جاتے ہیں۔ڈیم فنڈ میں بھی زوروشور سے حصّہ لیا تھا۔ وہ پیسہ کہاں گیا؟ کچھ اتہ پتہ نہیں۔اب اللہ کرے حکومت اِس اُفتاد سے ایمانداری اور منظّم انداز سے نپٹ سکے۔ہم تو جی جان سے اس پر قربان ہونے کے لیے تیار ہیں۔

تیسری خبر پر بھی تھوڑا سا لکھنے کو جی چاہتا ہے۔اس وقت عمران خان نے صنعت کا جام پہیہ چلانے کے لیے جو بیان دیا ہے اور جس پر بڑی لے دے ہو رہی ہے کہ یہ بے وقت کی راگنی گا رہا ہے۔ یہ وقت لنگر خانے کھولنے کا ہے اور یہاں صنعتوں کے بارے بات ہو رہی ہے۔ میں کوئی ماہر معاشیات نہیں۔صرف تاریخ کی ادنیٰ سی طالبہ ہوں۔تاریخ کو اگر دیکھیں، سوویت جب ٹوٹا تھا۔اس کا معاشی ڈھانچہ ایک خوفناک جھٹکے سے زمین بوس ہو گیا تھا۔نوّے کی دہائی میں رُوسیوں کی کھانے پینے کی چیزوں کی دستیابی کے جو حالات تھے اُس کے قصے میں نے اپنے سفر روس کے دوران سُنے اور لوگوں کی آنکھوں سے چھلکتے آنسوؤں کو بھی دیکھا تھا۔

ریاستیں الگ ہو رہی تھیں۔سوویت کی اکانومی کا سارا ڈھانچہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔بس تو اس وقت یہی کلیہ آزمایا گیا۔مقامی صنعتوں کو پورے عزم و حوصلے سے میدان میں اُتارا گیا۔لوگوں نے مشکل وقت کاٹا اور آج روس سب کے سامنے ہے۔

الحمدللہ ہم تو پھر بہتر حالت میں ہیں۔آیئے قوم بنیں، آیئے ایثار کریں، آیئے عزم و حوصلے سے اس وبا کو مار بھگائیں۔

☆☆☆

وبائی دنوں میں خود سے ملنا، محبت، تجدید محبت اور جھگڑے

ان دنوں کرونا کے حوالے سے رنگا رنگ موضوعات کی بہار آئی پڑی ہے۔ کرونا وائرس کے وبائی دنوں میں محبت، پھر تجدید محبت۔ پھر خود سے ملنے کے دن، اپنے آپ کو پہنچاننے کے دن وغیرہ وغیرہ۔

آمنہ مفتی نے بھی لکھا۔ ان وبائی دنوں میں گھر پر رہیے اور خود سے ملیے۔ اب اپنے آپ سے باتیں کرتی اور پوچھتی ہوں بھئی یہ خود سے ملنا کیا ہوا؟ ہم جیسے اجڈوں نے تو ساری زندگی خود کا نہیں سوچا۔ اب اِس آخری پہر کیا اِس پر غور کریں گے۔ وہی مثال صادق کہ عمر گزری اس کوچہ بتاں میں اب کیا خاک مسلمان ہوں گے؟

اب خود سے ملنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود پر توجہ دیں۔ اپنی وئیر ٹیر Wear Tear کو دیکھیں۔ اب پھر سوچیں تھیں، یہ کام بھی ساری زندگی نہیں کیا۔ ہم نے توبھنوؤں سے بھی کبھی چھیڑ خانی نہیں کی۔ حتیٰ کہ شادی والے دنوں میں بھی وہ کچھ نہیں کیا جو بہرحال ہمارے وقتوں میں سکہ رائج الوقت تھا۔ بیوٹی پارلروں کا تو تب کہیں دور دور نام و نشان تک نہ تھا۔ ہاں اُبٹن جیسے دیسی ٹونے ٹوٹکے بہتیرے تھے۔ رنگ چونکہ کالا تھا اسے البتہ گورا کرنے کے لیے پانی والے تالاب کے حکیم سید ظفر عسکری کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔ میرے کونڈی ڈنڈے اور پڑوں کی غرض وغایت جب چھوٹی خالہ کو سمجھ آئی تو اس نے بھی یہ طعنہ دینا فرض بنالیا۔

کالے کدی نہ ہوندے بگھے

بھانویں نو من صابن ملّے

اور میں شدت سے چاہنے کے باوجود وہ کونڈی ڈنڈا نہ کبھی اپنے سر پر مار سکی اور نہ چھوٹی خالہ کے۔ اب رہی محبت بھی ہوئی ہوگی۔ کسی نے تجدید محبت کا مزہ بھی چکھا ہوگا۔ یا کسی کو کسی کی تجدید محبت کی داستان سننے کو ملی ہوگی۔

وبائی دنوں میں محبت پر کونسے جوڑے فٹ بیٹھتے ہیں اگر تجزیہ کریں تو شاید ایک بھی نہیں۔ نو بیاہتے بیچاروں کے ارمانوں پر تو اوس پڑ گئی ہوگی۔ بیڈروم کے سوا گھر میں کون سی جائے عافیت ہے اُن بیچاروں کے لیے۔ باہر نکلنے اور ہنی مون کے راستے جائے ممنوعہ بن گئے ہیں۔ محبت کا تو گھنا خوبصورت سر اِس ناگہانی آفت کے نزول سے ہی گنجا ہو گیا ہے۔

اب رہے ہم۔

ہمارے ہاں تو یہ فرصت کے دن عذاب بن گئے ہیں۔ ایک عذاب باہر دوسرا گھر کے اندر۔

ہماری زندگیوں میں گھر کے اندر رہنے کی سکون بھری عیاشی تو کہیں ہے ہی نہیں۔ اب پونے پانچ یا پانچ بجے اٹھ کر اس کے حضور جھکنے کے بعد کا وقت تو جیسا راونڈ دی کلاک جیسا ہی ہوتا تھا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہائے ہماری بھی کیا زندگی ہے کھوتوں کی طرح جتے رہتے ہیں۔ سکون سے ناشتہ بھی نصیب نہیں۔ ہاں البتہ اگر کبھی اتفاق سے تین چار چھٹیاں اکٹھی آ گئیں تو سیاپا ہی پڑ گیا۔ دیکھ لیں بندہ بھی کتنا ناشکرا ہے۔

میاں کی اپنی سرگرمیاں دل جلانے والی۔ لان کی فضول کانٹ چھانٹ ہو رہی ہے۔ اچھے بھلے پودوں کا ناس مارنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ کہنے کا بھی فائدہ نہیں کہ کونسی سُننی ہے۔ بولتے جاؤ۔ کرتے جاؤ آپ بکواس۔

اب میں کیا کروں؟ باورچی خانے میں گھستی ہوں۔ بچوں کے لیے چپس تلنے والی

کڑاہی کو دیکھا ہے حشر نشر ہوا پڑا تھا اس کا۔ایک ایک دراز کو کھولا۔اتنی قابل رحم حالت کہ غصّے سے خون کھولنے لگا ہے۔سلیقہ شعار تو خیر کبھی نہ تھی مگر ایسی کوچجی بھی نہ تھی۔سر پر پڑی تو دال دلیا کرنا سیکھ ہی گئی۔مگر الاّ ماشاءاللہ بہوؤں کو کیا کہوں۔کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ایک تو نری اللہ میاں کی گائے اور دوسری ماشاءاللہ سے بڑی زمانہ ساز۔

اب کیا کروں۔بیکار اندر باہر کے چند چکر کاٹے۔

صبح پژمردہ سی تھی۔جس میں دل ڈوبتا اور مایوسیاں بھنگڑے ڈالتی تھیں۔شاپروں کی گھٹریاں نکالیں۔پٹارے کھولے بیٹھی ہوں۔عمر عیار کی زنبیل ہے میرے سامنے۔بیٹی بہو جس نے جو اچھا بھلا کرتی پاجامہ کنڈم کر کے پھینک دیا وہ میری گھٹڑی میں سما گیا۔بیٹی کی اچھی بھلی قمیضیں جن کے نیچے لگی قیمتی لیسیں نئی تھیں۔کتنی فضول خرچ ہیں یہ آج کی لڑکیاں۔کچھ سوچتی ہی نہیں۔کپڑے پر کپڑے خریدتی چلی جاتی ہیں۔یہی حال بہوؤں کا ہے،اب اللہ سمجھے اِس آن لائن شاپنگ کو۔گھروں میں بیٹھی آرڈر کرتی ہیں۔دروازے پر دستک ہوتی اور ٹی سی ایس کا بندہ پیکٹ تھماتا ہے اور ساتھ ہی ڈھیر سارے پیسوں کا مطالبہ ہوتا ہے۔ایسے میں خون کھولتا ہی ہے نا اور تو اور اب یہ کام بیجنگ میں بیٹھی نواسی نے بھی شروع کر دیا ہے۔وہ وہیں سے آرڈر کرتی ہے۔اب بولتی ہوں کہ اے ہے ابھی کل تو پیکٹ آیا تھا آج پھر آ گیا ہے۔پوتی فوراً کہتی ہے۔''دادو یہ تو فاطمہ آپی نے منگوایا ہے۔''اب ایسے میں بولوں کہ نہ بولوں۔تو بھئی بولتی ہوں کہ اِسے وہاں بیٹھی چین نہیں۔پاکستان آنا ہی ہے نا تو خرید لینا۔اِن کا تو حال ہے''کھو پیا ویڑ کا ہن اے کھسی کرلو۔''(یعنی بچھڑا کنویں میں گر گیا ہے بس فوراً خصی کرلو۔)

اب خود کو بھی کیا کہوں۔فضول اور بے تکے شغل سے باز نہیں آؤں گی۔لنڈے کے سویٹروں کو اُدھیڑنا،گولے بنانا،انہیں نئے بنانے کی کوشش کرنا اور پھر زچ آ کر ادھورے

چھوڑ دینا، بریزے کی دکان سے کٹ پیس خریدنا اور پھر ان کے جوڑ توڑ کرنے بھی میرے محبوب مشغلوں میں سے ایک ہے۔ایسی کمینی ہوں کہ گھنٹوں پر ڈھیروں ڈھیر وقت ضائع کردوں گی پر اِس فضول اور بے تکے شغل سے باز نہیں آؤں گی۔اب ایک بازار کھلا پڑا ہے سامنے۔اِن میں کچھ اچھے نگ بانٹے جا سکتے ہیں۔ملازموں کی بیویاں بچیاں۔بچیوں کے لیے تو دل فوراً منکر ہوگیا۔اے ہے۔ ماشاء اللہ سے جیتی رہیں لڑکیاں یہ سب اسکولوں کالجوں میں پڑھتی ہیں۔زمانے کے رنگ ڈھنگ سے آشنا ہیں۔ماشاءاللہ سے دیکھو تو جی خوش ہو۔1500 ،سولہ سو میں اچھا نیا سوٹ خریدتی ہیں۔اُترن کا ہے کو پہنیں۔اللہ نیک نصیب کرے سب کے۔چلو ماؤں کی اور بات ہے وہ پہن لیں گی۔

رات کچھ اضطراب میں گزری۔عمران خان کی حکومت گرانے کی افواہیں، بیوروکریسی کے شہباز شریف سے رابطوں بارے سرگوشیاں، بزدار، اعظم خان اور زلفی بخاری سے متعلق عمران خان کی حماقتیں اور اُن سے جڑے رہنے کی وجوہات اور ان سے پیدا شدہ خرابیوں پر مختلف یو ٹیوب چینلز پر تبصرے، حاشیہ آرائیاں۔بیچ میں بوٹوں والوں کی آمد کے امکانات، اسمبلیوں کے ٹوٹنے اور مارشل لا کا لگنا سب کے بارے لن ترانیاں سنتے سنتے کہیں اچاروں کی ترکیبیں دیکھتے دیکھتے سوگئی۔نیند تو بس اِن ابتر حالات جیسی ہی تھی۔

صبح دم دیر سے آنکھ کھلی۔نماز قضا تھی۔باہر رم جھم کا سلسلہ تھا۔ایک اور ہوک دل میں اٹھی۔خدایا پاکستان اس وقت دوہری آزمائش میں ہے۔

بندہ کیسے سیاپے میں پڑ گیا ہے۔کہاں کہاں جان بچاتا پھرے۔اخبارات کا مطالعہ کرنا عادت ہے۔ملازم لاتا ہے۔چولہے پر تیز آگ پر ہاتھوں میں پکڑ کر اُسے اور اپنے ہاتھوں کو پکاتی ہوں۔اب یہی کہہ سکتی ہوں کہ دل کو بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔پہلے

صفحے پر چپکے جراثیموں کو چتّار سید کر دیا تو اندر کے صفحات کا کیا ہوگا؟ تو بس پھر اُس اوپر والے کو ہی پکارنا ہے۔ ویسے تو سچی بات ہے اپنے رب کے بڑے پن کا ڈنکا جس شان سے بجا ہے اُس پر میں تو بڑی مسرور ہوں۔ ان بڑے ملکوں نے جسطرح ہم تیسری دنیا کے لوگوں کو خانوں میں بانٹا ہوا تھا۔ وہ سب برابر ہو گیا ہے۔

☆☆☆

میلان اٹلی کی بالکونی میں بیٹھی وہ یاد آتی ہے

اِن وبائی دنوں میں وہ مجھے یاد آتی ہے۔دروازے کا پٹ ہاتھ میں تھامے نرم و ملائم نقش ونگار سجے چہرے اور نیلی کچور آنکھوں والی جو مجھے دیکھتے ہی چنبیلی کی طرح مسکراتی تھی۔اٹلی میں کرونا وائرس کی سنگینی بہت زیادہ ہے۔خوفناک بیماری اور ہلاکتیں تو اپنی جگہ مگر یہ رویہ کہ بوڑھوں کو مرنے دو بڑا اسنگدلانہ ہے۔ایسے میں مجھے وہ یاد ہی نہیں آتی بلکہ میری آنکھوں کو بھی گیلا کر جاتی ہے۔

یہ اٹلی کے شہر میلان کا مضافاتی کمیون یعنی قصبہ چیزاتے کا ایک فلیٹ ہے جہاں میں مسز ریٹا سمتھ سے ملنے آئی ہوں۔

ابھی کوئی تین گھنٹے قبل میلان پہنچی ہوں۔میزبان فیملی نے شام کی چائے پر بتایا تھا کہ نچلے فلور پر ایک پچھتّر ۷۵ سالہ خاتون جس کے گھر میں کتابوں کے انبار ہیں رہتی ہے۔مہربان اور شفیق سی عورت جس کی ایک بار بیماری کے دوران ہم دونوں میاں بیوی نے اس کا بہت خیال کیا۔

رضیہ ہنسی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”میں نے جب پہلی بار روغن زیتون سے ان کی ٹانگوں کی مالش کی تو انہیں اتنا سکون ملا کہ میں خوشی سے نہال ہوگئی۔پھر تو ہر روز ان کی پورے بدن کی مالش میرا معمول بنا۔وہ میری ماں جیسی ہیں۔اُن کا ایک ہی بیٹا ہے جو بس سال چھ ماہ میں ایک بار آتا ہے۔“

تو گویا ایک ادبی ذوق کی حامل، کتابوں کی رسیا، کیا پتہ لکھنے لکھانے سے بھی تعلق ہو۔ایسی خاتون سے ملنا تو ملاقاتِ مسیحا وخضر سے بھی افضل ہے۔یہ ایسا خوش آئند خیال تھا

کہ یونہی محسوس ہوا کہ میلان کے کسی قدر گرم سے موسم میں پھولوں کی خوشبو سے لدی پھندی ہواؤں نے جیسے میرے رخساروں پر بوسے دیتے ہوئے مجھے نہال کردیا ہے۔

رضیہ نے شام کو ملاقات کروادی۔ایک منزل نیچے کا گھر۔دروازہ مسز ریٹا سمتھ نے خود کھولا۔

گھر تو ایک جیسا ہی تھا۔مگر کیسا تھا۔روح تک میں لطافت اُتر گئی۔

بڑے کمرے میں الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔باتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ لکھتی وکھتی تو نہیں تاہم کتابوں سے عشق ہے۔

دیوار میں نصب لمبی سی الماری کے شیلف مختلف مجسموں سے سجے تھے۔بڑے منفرد سے۔پوچھنے پر پتہ چلا کہ داہنی طرف کا وکٹر ایمونیل دوم اٹلی کے شہنشاہ جس نے اٹلی کو ایک کیا کا مجسمہ ہے۔اس کے ساتھ اُسی خانے میں تین اور تھے بڑے تاریخی کردار اطالویوں کے محسن، Risorgrimento تنظیم کے بانی اور رکن۔

پسِ منظر نے بتایا تھا کہ اُنسیویں صدی کے ابتدائی سالوں میں نپولین بونا پارٹ نے اٹلی پر قبضے کے باوجود اطالویوں کو یقین دلایا کہ وہ یورپ کے لوگوں کی طرح اکٹھے ہوکر اپنے ملک پر خود حکومت کرنے کے اہل ہیں۔تو اسے Risorgrimento یعنی دوبارہ اٹھنے سے جوڑا گیا۔یعنی اٹلی کی عظمتوں کا احیاء۔اگلے پچاس سالوں میں یہ ایک انقلابی تحریک بن گئی۔جس میں حصّہ لینے کی سزا موت تھی۔بنیادی طور پر چار مرکزی کردار تھے۔گیری بالڈی Garibaldi (جو جرنیل تھا۔)، میزانی Mazzini (بے حد دلیر اور جی دار لکھاری)، کیور Cavour (سیاست دان وڈپلومیٹ) اور وکٹر ایمونیل دوم۔

مسز ریٹا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

یہ میرے گھر میں ہی نہیں بلکہ ملک کے ہر شہر کے کوچہ و بازاروں کی پیشانیوں پر جگمگاتے ہیں۔اس تنظیم نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے تحریک کو زندہ رکھا۔حتیٰ کہ قابض ملک سپین، آسٹریا اور فرانس، اٹلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

پینتیس 35 سال کی عمر میں ڈیوائن کومیڈی جیسا شاہکار لکھنے والا دانتے ایلیگری Dante Alighieri جس نے اطالوی ادب کیا دنیا کے ادب کو مالا مال کیا کو پہنچاننے میں ذرا دشواری نہیں ہوئی کہ ڈیوائن کومیڈی کو پڑھنے کی کوشش میں اُس کی صورت اور سٹائل کی انفرادیت نے تصویری نقش ذہن میں بیٹھا رکھا تھا۔

ریٹا اطالوی تھی شوہر انگریز تھا۔دونوں اپنی اپنی زبانوں کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ فرنچ اور جرمن میں بھی طاق تھے۔مسٹر سمتھ کا کوئی دو سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا۔

''آپ کے ساتھ شام کا ایک گھنٹہ گزارنا چاہتی ہوں اٹلی کا ماضی اور اُس کا حال جاننے کے لیے۔'' نرمی کی پھوار میں بھیگے چہرے نے کہا۔

''ارے ماضی کی تاریخ تو بڑی ہی دلچسپ ہے۔شاید تاریخ ہمیشہ دلچسپ ہوتی ہے اور ڈراؤنی بھی۔''

اگلے دن آٹھ بجے میری دستک پر مسز سمتھ نے مسکراتے ہوئے مجھے اندر آنے کا راستہ دیا۔نشست گاہ میں بیٹھتے ہی میں نے کہا۔

''آپ کا گھر بہت صاف سُتھرا قرینے سلیقے سے سجا ہوا ہے۔''

''بالعموم ہم بہت صاف سُتھرے لوگ ہیں اور اپنے گھروں کو بھی ایسا ہی رکھتے ہیں۔ہمارے معاشرتی رویّے بھی اتنے اُلجھے ہوئے نہیں خاصے سُلجھے سے ہیں۔

یورپ بھر میں خاندانی نظام اپنی مظبوط بنیادوں کے ساتھ صرف ہمارے ہاں ہی تھا۔گو اب یہ بھی اپنی ان روایات سے منہ موڑ رہا ہے۔نئی نسل کی اپنی روش ہے۔مگر ہم جیسے

بوڑھے لوگ اُن روایات اور قدروں کے ابھی بھی اسیر ہیں۔ہمیں رشتہ داروں اور عزیزوں دوستوں کے گھروں میں جمگھٹے اچھے لگتے ہیں۔کھانے کھانے اور گپیں لگانے میں ہم لُطف اٹھاتے ہیں۔گو ہمارے بچے بھی اِن میں کبھی کبھار شامل ہو جاتے ہیں۔تاہم پھر بھی اب وہ باتیں نہیں ہیں۔

مذہب کے بارے میں پوچھنے پر کہ یہ آپ لوگوں کی زندگیوں میں کتنا اہم اور دخیل ہے۔

انہوں نے کہا تھا۔ مذہب،خاندان اور کھانا پینا تین چیزیں ایک اطالوی کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔مگر جیسے خاندان منتشر ہو رہے ہیں ویسے ہی مذہب بھی بس اب بوڑھے لوگوں تک محدود ہو گیا ہے۔نئے بچوں کے پاس نہ خاندان کے لئیے وقت ہے اور نہ چرچ کے لئیے ۔

اٹلی کا اہم مذہب رومن کیتھولک ہے۔دس 10 فی صد پروٹسٹنٹ ، یہودی اور اب مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ہے۔ہاں البتہ مذہبی جنونیت نہیں۔رواداری اور برداشت ہے۔لوگ دھیمے اور خوش مزاج ہیں۔

ہم لوگ ہمیشہ یہ بات مدّنظر رکھتے ہیں کہ پانی کا شیوہ نیچے کی طرف بہنا ہے۔

اٹلی کی The Remaissance نشاۃ ثانیہ کے نام سے شناسائی تو تھی مگر اس کی گہرائی کو میں نے ریٹا سمتھ سے سمجھا۔بالکونی میں بیٹھ کر کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتے ہوئے۔

اٹلی کا عروج و زوال،فکر و سوچ کی دنیا جو پروٹسٹنٹ اور کیتھولک جھگڑوں میں پھنسی ہوئی تھی۔عدالتی اور سرکاری سطح پر انسانی سوچ اور جدّت کے استحصال کی سب سے بڑی مثال گلیلیو کی صورت میں ان کی گلوگیر آواز میں جون کی اُس کسی حد تک گرم سی صبح کے

بارے سُنتی تھی۔

جب روم کے کونونٹ منروا میں کھڑا وہ خستہ حال بوڑھا جو آنے والے وقتوں میں انسانیت کے ایک عظیم سائنس دان کی صورت سامنے آنے والا تھا۔اس وقت بے چارگی اور بے بسی کی تصویر بنا اُس معافی نامے پر دستخط کرتا سامنے آتا ہے جو گوتھک چرچ اور کلیسا نے اس کے خلاف بدعتی نظریے کے اظہار پر فتوی کی صورت جاری کیا تھا۔اس نے کہا بھی کہ اس نے کب پوپ اربن ہشتم کا مذاق اڑایا ہے۔

ہاں اس کے علم اور مشاہدے نے جو اُسے بتایا اور سمجھایا ہے اُس نے تو اسی کے بارے بات کی ہے۔زمین ساکت نہیں ہے وہ سورج کے گرد گھومتی ہے۔

مشتری کے گرد گھومتے ستارے اور بے شمار ستاروں کی دریافت مقدس کتاب سے کہاں انحراف ہے؟ ایک علم ہے جس کا یہ تو اظہار ہوا ہے۔ یہ بے ادبی اور گستاخی کا ارتکاب کہاں ہے؟

کتنا بڑا انسان کیسی تنگ نظری کا شکار ہوا۔اُس کی کتابوں پر پابندی لگا دی گئی۔ عین انہی لمحوں میں اور چھم سے جیسے مجھے برٹولٹ بریخت Bertolt Brecht کا ڈرامہ The life of Galileo یاد آ گیا تھا۔اب یہ کیسے ممکن تھا کہ بریخت کے ساتھ مجھے اپنے ملک کا وہ عظیم دانشور بابائے ٹیلی ویژن جناب اسلم اظہر اور ان کا ''دستک تھیٹر گروپ'' یاد نہ آتے۔آئے۔منصور سعید بھی۔

یہ ڈرامہ میں نے اپنے بڑے بیٹے کے کہنے پر دیکھا تھا۔کیا شاہکار چیز تھی؟ سارا ڈرامہ اس اہم مقدمے کے گرد گھومتا ہے جس کے تحت کلیسائے روم نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی اِس شہرہ آفاق انقلابی سائنسی دریافت سے انحراف کر جائے۔

اسے دیکھتے ہوئے سانس کتنی بار رکی۔ بتانا مشکل ہے۔میں نے مسز سمتھ کو یہ

سب بتایا۔ کتنی نشستیں رہیں، کتنے کافی کے کپ پھولوں سے گھری بالکونی میں بیٹھ کر پیئے۔ کتنا کچھ جانا۔

سوچتی ہوں وہ اپنوں کے ہاتھوں مری ہو گی۔ کیونکہ دو ماہ پہلے وہ زندہ تھی قدرے علیل ضرور تھی۔

☆☆☆

ہم اللّے بللّے پاکستانیوں کا رب وارث

اب اس میں تو دو رائے نہیں پاکستانی جیالے اور جی دار ہیں۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ انہیں احمقانہ صف میں گھسیٹ لیں۔ دلیل کے ساتھ چلیں گے تو پھر اتفاق کرنا پڑے گا۔ پر جیالے پن کا بھی تو ایک اپنا حسن ہے۔ برصغیر کے دو ماں جائے جو ہمسائے بن گئے تھے کوئی پچپن سال قبل جب پہلی بار لڑے تو دنیا نے دیکھا۔ لاہور کا آسمان جنگ وجدل کا پانی پت بنا ہوا ہے۔ اور لاہوری خندقوں مورچوں میں کودنے کی بجائے چھتوں پر کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ تالیاں پیٹ رہے ہیں۔ پاگلوں کی طرح دشمن کے گرے جہازوں کا مزید تیا پانچہ کرنے بگٹٹ بھاگے جاتے ہیں جیسے مانو یہ بھی گڈیاں پتنگ ہوں۔

کورونا وائرس کسی ناگہانی آفت کی طرح دُنیا پر نازل ہوا ہے۔ ہم بیچارے تیسری چوتھی دنیا کے نہنگے ملنگوں نے کیا پریشان ہونا ہے کہ وہ تو پیدائش کے ساتھ ہی پریشانیاں اور دکھوں کے انبار لے کر آتے ہیں۔ بات تو اُن بڑے لوگوں اور بڑے ملکوں کی ہے، کتنی کمینی سی خوشی ہو رہی ہے۔ ٹرمپ کا کورونا میں مبتلا ہونے کا ڈر۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ اب یہ بھی مکاریاں اور عیاریاں ہیں کہ چین نے تو کہہ دیا ہے ساری حرامزدگی امریکا کی ہے۔ یا پھر اللہ نے اپنے ہونے کا احساس دلایا ہے کہ لو دیکھ لو کیسے تمہاری ساری ٹیکنالوجی سائنس اور ریسرچ کی کاوشیں تہس نہس کر دی ہیں۔ ایک ماہ میں پوری دنیا کا اقتصادی نظام تل پٹ کر کے رکھ دیا ہے۔

دو یورپی ملکوں کے مقتدر شخصیتوں کو دیکھ کر تو ہنسی چھوٹ گئی ہے کہ ہاتھوں کی

بجائے پاؤں کے جوتوں سے مصافحہ ہورہا ہے۔جدت طرازیاں تو بھئی ان پرختم ہیں۔اب سپر پاور کے ہاں ماسکوں کا قحط پڑ گیا ہے۔سپر سٹورز پر سامان کے حصول پر جھگڑوں کی خبریں ہیں۔دیکھ لیجیے اندر کی کمینگیاں کیسے باہر آتی ہیں۔سکول،کالج ،یونیورسٹیاں سب بند۔پروازیں معطل۔اب ایسے میں اپنے لوگوں کو کیا کوسیں یہ تو ہیں ہی سدا کے ازلی نکمے اور نالائق ،رہے حکمران تو وہ اپنے چکروں میں۔سچ تو یہی ہے کہ اگر پاکستانی قوم اللّی بللّی سی ہے تو حکمران کونسا کسی ہج چجھ کے ہیں۔بڑے ریاست مدینہ کے دعوے دار۔بندے کو عقل نہ ہو تو کسی سے ادھار ہی مانگ لے۔چین جیسا گوانڈی خیر یہ گوانڈی کہنا بھی کچھ درست نہیں کہ ہم تو اس کا بغل بچہ ہیں۔اب جب وہ مصیبت میں مبتلا ہوا تو پل بھر کے لیے سوچ لو کہ ہمیں تو رگڑا لگنا ہی لگنا ہے۔تو دفاع کیسے کرنا ہے۔اس پر فوراً کام کرنے کی ضورت تھی۔مگر ہمیں ہوش پھر نہیں آیا۔اب جب دنیا کو رگڑا لگنے لگا تو آنکھیں کھلیں۔اتنی بھی عقل نہ تھی کہ ایران کا باڈر کراس کرتے زائرین کو اچھی طرح سنبھالتے۔جو انتظامات کیے تو وہ بھی اتنے ناقص تھے کہ مسائل کم ہونے کی بجائے اور بڑھنے لگے۔

لو میں بھی بچوں جیسی باتیں کرنے لگ گئی ہوں۔

جمعے کی شام کو حکم جاری ہوگیا۔سکول،کالج،یونیورسٹیاں بند،ٹیوشن سنٹر بند،شادی ہالز بند،اجتماع پر پابندی دفعہ 144 نافذ۔بڑے ہنگامی اقدامات ،فیصلوں کے بھاشن ۔ہائے ہائے بچے بیچارے نئے سال میں پڑھائی کی پٹڑی پر ابھی چڑھے ہی تھے۔صبح کام پر گئی ۔ملتان روڈ اورنج ٹرین اسٹیشن کے شیڈ کے نیچے سینکڑوں کی تعداد میں دیہاڑی دار مزدور بیٹھے کہیں اپنے سامنے برش پینٹ کے ڈبے رکھے اور کہیں ہتھوڑے چھینیاں تیسی،کانڈی رکھے پر امید نظروں سے دیکھتے تھے کہ کب کوئی آئے اور انہیں کام کے لیے لے جائے۔ایک رونق اور میلے کا سا سماں تھا۔بازار میں دودھ دہی کی بڑی دکانوں پر

رش، نان چھولوں کی دکانوں پر خریداروں کے جمگھٹے۔ بازار کی صبح کی رونقیں اپنے عروج پر۔ کہاں کا کرونا اور کیسا کرونا۔ کیسا ڈر اور کیسا خوف؟ ڈیڑھ بجے باہر نکلی۔ پارک میں نماز جنازہ ہو رہی تھی۔ کوئی دو سو کا مجمع نیت باندھے کندھے سے کندھا جوڑے نماز جنازہ پڑھ رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے انہیں دیکھا اور خود سے کہا۔ اللہ ہی ہمارا بیلی ہے۔

بشریٰ اعجاز فون پر تھی۔ ہماری بشریٰ اعجاز کمیٹیوں کی بڑی دلدادہ ہے۔ اس کی بات میں بھی وزن ہے کہ اِس بہانے ملنا ہو جاتا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ مجھے پندرہ کے بعد کراچی جانا ہے۔ ڈیفنس کلب کا طے ہو گیا ہے۔ Close Friends کے نام سے تشکیل کردہ اِس کے ممبران کو مطلع کر دیا گیا ہے۔ فوری ردّعمل نیلم احمد بشیر کا سامنے آیا۔ خدشات اور خوف سے بھرے لہجے میں۔ ویٹروں کے ہاتھوں بارے، گوشت بارے، جمگھٹے بارے۔ وہ ابھی کوئی دو گھنٹے قبل سرگودھا سے ایک مشاعرہ میں شرکت کر کے لوٹی تھی۔ میں جانتی تھی۔ اس کے تو میں نے لتّے لیے۔ نہ وہاں کیا گوشت نہیں کھایا تھا۔ جن ملازموں نے سروس دی انہوں نے ہر پانچ منٹ بعد ہاتھ دھوئے تھے۔ یقین ہے تمہیں۔ اور کیا وہاں مجمع نہیں تھا۔ اگر یہ سب بھگت کر آئی ہو تو چپکی بیٹھو۔

شام چھ بجے سو کر اٹھی۔ باورچی خانے میں آئی۔ خادمہ بارے بہو نے بتایا کہ وہ دو دن کے لیے گاؤں گئی ہے۔ اندر کا وہم اور خوف چیخا ”ہائے وہاں کیوں گئی۔“ جانور گندمند۔ طبعیت کا کھولاؤ صرف چند لمحوں کا تھا۔ اب اپنے آپ سے کہتی ہوں۔ میرے اپنے گھر کی کیا گارنٹی ہے؟ گھر کے پچھواڑے مزدور کام کر رہے ہیں۔ پندرہ دن ہوئے ہیں صبح سے شام تک ادھر ہی رہتے ہیں۔ ”بس اللہ مولا تیری پناہ۔“ کہا اور خود کو شانت کیا۔ سلیب پر دو لفافے پڑے تھے۔ ایک میں سموسے اور دوسرے میں جلیبیاں۔ مزدوروں کے لیے شام کی چائے پر کبھی کبھی یہ چیزیں منگوانا میرے میاں کا محبوب مشغلہ ہے۔ ہماری

بھی موجیں ہوتی ہیں۔لفافے میں بچے ہوے دوسموسے۔ہائے سموسے سدا کی کمزوری ۔بازار کی چیزیں ۔وہم نے سر اٹھایا۔ پر چند ہی لمحوں بعد ارے بھاڑ میں جائے سب۔سموسہ کھانا ہے۔اوون میں گرم کرنے کی بجائے توے پرخوب گرم کے بعد دہی رائتہ کی چٹنی سے بسم اللہ پڑھ کر کھایا۔دودھ میں جلیبیاں پکا کر میٹھا اڑایا۔لمبا ڈکار بھرا۔عشاء کی نماز پڑھی۔دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

مولا کل ہم سب دوست لوگ بلقیس ریاض جو رضا رومی کی ماں بھی ہیں اور ایک خوبصورت لکھاری بھی کے ہاں اکٹھی ہورہی ہیں۔کلب کی طرف سے جواب مل گیا ہے۔مولا سب کی خیر۔

پروردگار میری جان جگر،میری آنکھوں کی ٹھنڈک میری اکلوتی بیٹی بیجنگ کے دوزخ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ مقید ہے۔اُس کے بچوں کے امتحانوں کا کچھ پتہ نہیں۔اللہ میرے اُن کی خیر،اُن کے لیے آسانیاں۔پاکستانیوں کی خیر۔چین کی خیر کہ بہر حال اِس اللّے بللّے پاکستان کے ساتھ مشکل وقتوں میں کھڑا ہوتا ہے۔میرے ملک کی خیر۔مولا یہ دن تو میرے کسانوں کے لیے آزمائش کے دن ہیں ۔ انہیں دھوپ چاہیے۔بوندیں نہیں۔چاہے وہ سونے کی ہوں۔میرے مولا اُن کے پھڑولے دانوں سے بھر دے۔میرے اللہ میرے غریب،میرے معصوم لوگوں پر تیرا کرم ہو۔

☆☆☆

کروناوائرس،روم اورویٹی کن سٹی

کرونا وائرس کے بادلوں نے اٹلی پر بھی اپنی نحوست کی چادر تان دی ہے۔ سیاحت کے موسم کا آغاز ہے اور بندہ قید ہوگیا ہے۔کہاں جائے۔نہ مسلمانوں کا قبلہ وکعبہ محفوظ اور نہ کیتھولک عیسائیوں کا ویٹی کن سٹی۔چلیے ایسے میں کچھ میری سیر سے اپنی پیاس بجھا لیں۔

میں روم میں ہوں اور اکیلی ہوں اور خود سے ہم کلامی کے انداز میں گویا ہوں۔

تو آج کیتھولک عیسائیوں کے مکے مدینہ کا دیدار کرنا ہے۔شوق کی فراوانی ہے۔ عقیدت کا رنگ ہے۔روم میں میرا تحفہ خاص ہے جو آج میں وصولنے جارہی ہوں۔

ایزولینا ہوپ آن ہوپ آف کی گائیڈ سے بات ہوگئی تھی۔ناشتے اور کنگھی پٹی سے فراغت کے بعد میں نے تھوڑی دیر کے لئے اٹلی پر لکھی ہوئی کتاب کھولی۔تقریباً ایک سو ایکٹر پر مشتمل آزادخودمختار ایک بڑے ملک کے پایہ تخت روم کے اندر ہی دنیا کا سب سے چھوٹا ملک جس کے اپنے مسلح فوجی دستے، اپنا ڈاک کا نظام، ہیلی پیڈ، منی ٹرین اسٹیشن، ریڈیو اسٹیشن ، اپنا یوروسکہ جس پر پوپ بینڈکسٹ Benedictxvi سولہواں کندہ ہے۔ سیاسی طر پر طاقتور۔ 1.1 بلین رومن کیتھولک لوگوں کا روحانی مرکز۔ پوپ ویٹی کن سٹی کا بیک وقت روحانی اور سیکولر لیڈر ہے۔صدیوں سے وہ کنگ پوپ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ویٹی کن کے رہائشی تقریباً ساڑھے نو سو کے قریب ہیں اور 3000 کے قریب لوگ یہاں کام کرتے ہیں۔

وقت دیکھا۔نو بج رہے تھے۔فوراً اٹھی۔

''ویٹی کن سٹی دیکھنا ہے۔کتابوں کی دکانوں پر جانا ہے۔شام کسی خوبصورت پیازے میں گزارنی ہے۔''

میں سوچوں سے باتیں کرتی گویا ایک طرح اڑی جارہی تھی۔

ایزولینا نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔اس کی پیشانی چومتے ہوئے آگے بڑھ کر قریبی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

بصارتوں میں جونہی وہ مانوس سی عمارت آئی۔آنکھوں میں قندیلیں سی جل اٹھیں۔کھیتولک عیسائیت کے اِس مرکز اور پاپائے روم کے بیانات سے اکثر و بیشتر پرنٹ و الیکٹرونک میڈیا کے توسط سے خاصی مانوسیت رہی ہے۔

سچی بات ہے اب یہ تو مجھے یہاں آ کر پتہ چلا تھا کہ پوپ اتوار کو اپنا دیدار کرواتے ہیں۔اس دن ٹکٹ ویکٹ بھی فری۔اب عقل پر بندہ ماتم ہی کرئے گا کہ ویک اینڈ پر روم آنے سے گریز جان بوجھ کر کیا۔

عین سکوائر کے سامنے آ کر میں نے چھاؤں میں بیٹھ کر ڈیرے ڈال لیئے کہ پہلے تو جی بھر کر اسے دیکھنا مطلوب تھا۔نقشے پڑھنے کی ضرورت تھی۔

میرے سامنے ایک وسیع قطعہءزمین پر ستونوں پر کھڑی دائیں بائیں سیمی سرکل میں گھومتے برآمدوں سے سجی عمارتیں مرکزی عمارت کو گویا اپنے حصار یا دوسرے لفظوں میں اپنے تحفظ میں لینے کا تاثر دیتی تھیں۔ٹکٹ کیلئے لمبی قطاریں تھیں۔

پانی کی ایک بوتل خالی کر کے میں اٹھی کہ اب کمر ہمت باندھوں کہ گوڈے نے ایک کڑاکا بجایا۔

جی چاہتا تھا کہ کِسی کی منت کروں کہ وہ یا میرا ٹکٹ لے لے۔یا مجھے اپنی جگہ

دے دے۔جگہ دینے کی درخواست کا احمقانہ مطالبہ خود مجھے بڑا کمینہ سا لگا اور ٹکٹ کیلئے دھوپ میں پینڈا مارتی لائن تک پہنچی۔رکاوٹی جنگلے کے پار کھڑی پھینی سی ایک لڑکی سے درخواست کی۔جس انداز میں مجھ بیچاری کی پذیرائی ہوئی اُس نے چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے والی بات یاد دلا دی تھی۔لڑکی نے بے حد عجیب سی نظروں سے مجھے یوں گھورا تھا جیسے کہتی ہو۔

''کیوں لوں تمہارا ٹکٹ۔تمہاری کیا ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔اتنی تو ہٹی کٹی لگ رہی ہو۔''

''چلو میاں سیدھے سبھاؤ لگو قطار میں۔''

تو صبر کا پھل بڑا رسیلا اور میٹھا تھا کہ جب کانسی کے ایک بھاری بھرکم عظیم الشان دروازے سے اندر قدم رکھا تو اوپر والے کیلئے شکرگزاری کے احساسات نے جذبات کو بڑا رقیق سا کر رکھا تھا۔

''ارے میں اور یہ سب۔''

ایک جادوئی سحر جیسی دنیا میں داخلہ ہو رہا تھا۔دنیا کی سب سے چھوٹی خودمختار سلطنت کا عجائب گھر جو آپ پر آرٹ کی دنیا کے اسرار کھولتا ہے۔جہاں دنیا کے عظیم مصور آپ پر ایمان اور آرٹ،عیسائیت اور کلچر،خدا اور انسان کے درمیانی سلسلوں کی گھتیاں کھولتے چلے جاتے ہیں۔

کیا بات تھی اُس دنیا کی جہاں داخل ہوئی تھی۔ بڑی کلاسیکل قسم کی عمارت کا آنگن ہے۔محرابی گزرگاہوں والے برآمدوں میں ٹھنڈک،سکون اور شانتی سی جیسے اُتری ہوئی ہے۔قدامت پور پور میں رچی بسی زمانوں کی خوشبو اپنے اندر بسائے ہوئے ہے۔

دائیں بائیں جدھر دیکھتی ہوں آرٹ کی دنیا آباد ہے۔مجسمے ستونوں کے ساتھ

ایستادہ ہیں۔ کہیں نیپچون Neptune، کہیں Hellenistic، کہیں اپالو اور کہیں Laocoom گروپ نے یارڈ کو سجا رکھا ہے۔ یہ یونانی اور رومن تہذیبوں کے نمائندے ننگے دھڑنگے۔ بولوں تو کیا کہ اظہار کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ فتووں سے ڈر لگتا ہے۔

ہاں البتہ عقیل رُوبی بے طرح یاد آیا ہے۔ جس کی دُنیا یونانی کرداروں سے آباد رہتی تھی۔

چلو اللہ رازق اور مددگار ہے۔ انڈین لوگ مل گئے۔

میری خواہش پر کاپی پر لکریں کھینچ کھینچ کر چیزوں کو وضاحت سے بتا دیا کہ بس دو چیزیں دیکھ لو۔ یہاں تو آرٹ اور تہذیبوں کا سمندر ہے۔ ہاں Pinacoteca دیکھنے کی سفارش کی کہ وہ قریب ہی تھا۔

تو اِن پیارے سے لوگوں سے رُخصت ہوتی ہوں۔ Pinacoteca آرٹ کا پورا جنجال پورہ ہے۔ سچ تو یہی تھا کہ کہیں بہار جیسے شوخ و شنگ رنگ، کہیں دھیمے میٹھے اور کہیں پھیکے رنگوں کی بارش بھگو بھگو کر شرابور کر رہی تھی۔ وہ برس رہی تھی۔ راستہ روک رہی تھی اور مجھے بھگوتی چلی جا رہی تھی۔ ونچی کا شاہکار سینٹ جروم جیسے کسی دشت تنہائی کا اسیر۔ Giotto اور بلینی دونوں اپنی انتہائے معراج کو پہنچے ہوئے۔ دونوں کے فن سے آنکھیں چرانا کہیں ممکن تھا۔

چہروں کا ایک ایک نقش، ایک ایک خم واضح کر رہی تھی۔ زنجیروں کی حد بندیاں تو قریب جانے میں مانع تھیں۔ ڈھیروں ڈھیر کمرے بس جو چیز باعث راحت تھی وہ کمروں میں بیٹھنے کا شاہانہ قسم کا اہتمام تھا۔

میں لطف اٹھا رہی تھی۔ مریم کی جنسی تعلق سے آزاد حاملہ ہونے کی تصوراتی صورتوں کی آگاہی سے جو بڑی ہی موہ لینے والی تھی کہ اِس تصور نے نہ صرف کام کو انفرادیت

دی بلکہ اس کی وسعتوں میں بھی نئے رخ تھے۔

Raphael rooms تک پہنچنے میں تین بار رُک رُک کر تھوڑا آرام اور تھوڑی منہ ماری کی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ رافیل اور اس کے ساتھیوں کا کام حد درجہ متاثر کن تھا۔سولہویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کا نمائندہ یہ کام جسے رافیل اور اُسکے ساتھیوں نے فریسکو ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے نشاۃ ثانیہ کے دور کے کام کو زندہ و جاوید کر دیا۔ کمروں کی محرابی صورت دیتی دیواروں پر آرٹ کے کیا شاہکار نمونے بکھرے ہوئے تھے۔

بہت سے ایسے موضوعات تھے جنہوں نے آنکھوں کو جکڑا ہوا تھا مگر انکا تعلق کس پس منظر سے ہے اس سے کوئی شناسائی نہیں تھی۔لطف اندوزی رنگوں، کرداروں، انکے رویوں اور ماحول کے ساتھ فنکارانہ چابک دستیوں کے ہاتھوں ضرور ہو رہی تھی۔

البتہ بورگوروم میں آگ لگنے کے واقعے کی عکاسی بڑی واضح تھی۔ میرے نزدیک مقدّس سیکرامنٹ Sarcament (جس میں شادی بیاہ کے موقع پر شراب اور روٹی پر جھگڑے کی شکل) کی کیا شاندار عکاسی تھی۔ آسمانی اور زمینی زندگی کے رنگ، تصور کی بلند پروازی۔ خدا تو کہیں دھرتی کے پادریوں جیسا ہی نظر آتا تھا۔

جی چاہتا تھا وقت کی ٹنل میں گھس جاؤں۔ اس دور میں چلی جاؤں جہاں وہ موٹی آنکھوں والا رافیل لگتا تھا The school of Athens پینٹ کر رہا ہے۔

سارا کمرہ گویا علم کے اعتراف میں سرنگوں تھا۔ سچائی اور دلیل کی عظمت کو سلام پیش کرتا تھا۔ کلاسیکل فلاسفی سے مذہب کی طرف کا راستہ عیسائیت سے پہلے اور بعد کا عہد زندہ و تاباں تھا۔ یہ شاہکار ایتھنز کے مکتبہ فکر کے عظیم مفکروں ارسطو، افلاطون وغیرہ کو خراج پیش کرتے تھے۔ The Tramsfiguration 1520 کا اسکا یہ کام ابھی تکمیل کو نہیں پہنچا تھا کہ وہ فوت ہو گیا۔ اِسے بعد میں اس کے شاگردوں نے مکمل کیا۔

رافیل بہت جلدی مر گیا صرف 37 سال میں اور اس کے چاہنے والے اُس کا یہی شاہکار اٹھائے روم کی گلیوں میں ماتم کرتے پھرتے تھے۔

کتنا وقت میں نے وہاں گزارا۔ مجھے اس کا خود احساس نہیں تھا۔

Sistine chapel دراصل اِس میوزیم کا دل ہے۔ پوپ کا ذاتی چیپل یہی وہ جگہ ہے جہاں جب وہ مرتا ہے اُسے رکھا جاتا ہے اور یہیں نیا پوپ منتخب ہوتا ہے۔ یہاں Michelangelo کا کام ہے۔ اور کیا شاہکار کام ہے۔ بائبل کی پہلی کتاب اس کے سارے سبق یہاں جسکا جی چاہے وہ پڑھ لے۔ ساری بات تو ہدایت اور روشنی کی ہے۔

خدا کو دیکھنا بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ میرے تصوراتی خدا سے خاصا مختلف۔ بوڑھے تو دونوں تھے۔ مائیکل اینجلو Michelangelo کا خدا البتہ بہت جلال والا دکھتا تھا۔ میں نے اپنے کا سوچا۔

''نہیں بھئی وہ تو مجھے بڑا نرم خو سا نظر آتا ہے۔ محبت سے لبالب بھرا۔ ہمدرد اور غمگسار دوست جیسا۔ گلے شکوے کر لو۔ غم و غصے کا اظہار کر لو۔ آدم اور خدا کے درمیان تعلق کی ڈور۔ کیا خیال آفرینی تھی۔ دونوں کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کی انگشت شہادت کا ملاپ آسمان اور زمینی کرّے کا ایک دوسرے کی طرف جُھکاؤ۔ واہ کیا کھلا ڈلا معاشرہ ہے۔ خدا کو اپنے جیسا بنا کر رکھ لیا ہے۔

ممتاز مفتی کے خدائی تصور کی من و عن ایسی ہی تصویر ہے۔ چاند، ستاروں اور زمین کی پیدائش کے عمل کے ساتھ آدم اور حوا کی پیدائش جنت سے نکالے جانے کا منظر۔ نوح اور سیلاب۔

مزہ آ رہا تھا یہ سب دیکھتے ہوئے۔ آدم اور خدا کے درمیان تعلق کے مختلف انداز۔ سب کی شکلوں سے تعارف ہوا۔ حضرت علی، حضرت امام حسین اور حسن سے بغداد

میں تصویری تعارف ہوگیا تھا۔بغدادیوں کی بھی افتادطبع کی داد دینی پڑتی ہے ۔کیا خوبصورت اوردلآویزسی صورتیں بنا کر دیواروں پرٹانگ دی ہیں۔

The Last Judgment کی مجھے خاک سمجھ آنی تھی اگرایک گروپ اپنی گائیڈ سے اس کا پس منظر نہ سُن رہا ہوتا۔اور میں انکے پاس نہ کھڑی ہوتی ۔مائیکل اینجلو کو اِسے بنانے کیلئے کہا گیا تھا۔کہہ لیجیئے یہ قیامت کا منظر ہے۔حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمداور خدا کا یومِ حساب۔روحوں کا اٹھنا اوراپنی قسمتوں کا فیصلہ سننا۔یہی وہ دن کہ جب کوئی جنت اور کوئی دوزخ میں جائے گا۔ایک افراتفری کا عالم۔حضرت عیسیٰ اپنے ممتاز ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے مقدروں کے فیصلے کرتے ہیں۔

ایک سحر کی سی کیفیت سے نکلنے میں کافی دیرلگی۔

☆☆☆

مایون ہم چترالیوں کے لیے کرونا وائرس نہیں لانا

مُبارکاں، ودھائیاں تمہاری سہیلی ثمینہ کے شوہر کو۔ ہاں تو وہ شاہکار وارد ہو گیا ہے جس کی آمد کے لیے فارموسیوٹیکل کمپنیاں چُھرے تیز کر رہی ہیں۔ان کی بیویاں سنہرے خواب بن رہی ہیں۔ چار ارب، پانچ ارب کے تخمینے لگ رہے ہیں۔چلو تمہاری ثمینہ کا ایک اور شاندار وِلا تیار سمجھو۔فوزیہ ہماری مشترکہ دوست میری تواضع کر رہی تھی۔

میرے کان تپنے لگے تھے۔موبائل کانوں سے لگا جیسے آگ چھوڑ رہا تھا۔گاڑی سگنل پر رش میں پھنسی کھڑی تھی۔اس کی ایک اپنی گھبراہٹ اوپر سے فوزیہ کی یہ جی جلانے والی گفتگو۔موبائل آف کر دیا۔

دفعتاً ایک زوردار قسم کا دھپّا کھڑکی کے راستے میرے شانے پر پڑا۔تڑپ کر میں نے باہر دیکھا۔ کھلے شیشے کے سامنے ایک نوجوان کلین شیو سرخی غازے میں لتھڑا ستاروں سے سجی جھلمل تنگ قمیض سے سینہ نکالے کہتا تھا ''حاجنے ایک سو روپیہ۔'' میرا تو جیسے میٹر گھوم گیا۔کھڑکی کے بالکل پاس وہ میرے ہتھ چھٹ ہاتھ کے نشانے پر تھا۔ویسا ہی ایک زوردار دھپّا اس کے شانے پر مارتے ہوئے میں نے چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

ڈوب مرو جا کر کمبخت کسی کھوہ کھاتے میں۔

اس کے کوسنوں پر تین چار اسی جیسے حلیے والے اِدھر اُدھر مانگتے پھرتے ساتھی بھی آ دھمکے۔شکر اللہ کا کہ رش کا زور کم ہونے پر گاڑی بھی چل پڑی۔ماشاءاللہ خیر سے یہ فقیروں کی ایک نئی قسم پیدا ہو گئی ہے۔تالیاں پیٹتے، ادائیں دکھاتے کمائی کے ایک نئے ڈھب سے

سامنے آئی ہے۔

اف کتنی ناکارہ اور غیر فعال یہ حکومت ہے۔ان جیسے مشٹنڈوں کے لیے کوئی پروگرام نہیں بن سکتا۔پکڑ کر گاڑی میں بھر کر انہیں کسی کیمپ میں لے جا کر کام پر لگائیں۔ستر سو کام نکل سکتے ہیں۔مگر کام کرنے ہوں تو۔ساری قوم بھیک مانگنے پر جتی ہوئی ہے۔کشکول ہاتھ سے نہیں چھٹتا۔دردر کاسہ پھیلائے پھرتے ہیں۔اب چھوٹوں نے بڑوں سے ہی سبق لینا ہے۔جب بڑوں کو شرم نہیں تو چھوٹے کِس کھاتے میں۔غیرت،عزت،شرم وحیا انہی کے لیے کیوں؟

جلتی بُھنتی کھولتی گھر آئی۔ظہر کے بعد اخبارات کو دیکھنا کھانے ہی کی طرح ضروری ہوتا ہے۔پہلی خبر کرونا وائرس کی پاکستان آمد بارے تھی۔ارے بھئی اِسے تو آنا ہی آنا تھا۔ہماری خودغرض کاروباری اشرافیہ دانت تیز کیے بیٹھی تھی۔

اب کیا ہوگا؟مرنا تو غریبوں نے ہی ہے۔اسپتالوں کی زبوں حالی،ڈاکٹروں کی بے حسی اور لالچ،ٹیسٹ کرنے والی لیبارٹیریوں کی غیر معیاری رپوٹیں اور ڈاکٹروں کے ان سے طے کمیشن۔سال ہا سال سے دیکھتی ہوں کیا دیہاتی اور کیا شہری ہپاٹائٹس جیسی بیماریوں کا شکار ہیں۔ڈینگی نے قیامت ڈھائی اور اب یہ کرونا آدھمکا۔اِن غریبوں کو بھی اللہ نیک ہدایت دے۔یہ بھی ہڈحرام،دھوکے باز،چور اور بے ایمان ہیں۔کہاں ڈنڈی مارنی ہے،کہاں دھوکہ دینا ہے،کہاں دونمبریاں کرنی ہیں۔دکانوں سے کتنا اور کیسے کمیشن طے کرنا ہے۔دونمبر چیزیں لانی ہیں۔مالکوں کو الّو کیسے بنانا ہے؟یہ ان سب حربوں میں بہت طاق ہیں۔

اب چترال سے آنے والی ایک کال کا حال سُنیے۔چترال سے ارشاد بابا کا فون ہے۔مارچ کا آغاز ہے۔شگوفے پھوٹ رہے ہیں۔درختوں پر سبز روئیدگی آنکھوں کو بھلی

لگ رہی ہے۔زمین انگڑائی لے رہی ہے۔

آپا اُس خوبصورت سی صبح کا انتظار ہے جب وہ ہمارا پیارا مایون دور دیسوں سے اڑانیں بھرتا ہماری وادی میں آکر اخروٹ کے درخت کی کسی شاخ پر بیٹھ کر اچھے دنوں کی نوید اپنی پیاری اور رسیلی آواز میں سُناتا ہے۔ مایون کی یہ آواز چترالیوں کے لیے حیات کا خوبصورت پیغام بن کر فضا میں بکھرتی ہے۔چہرے کھلکھلا اٹھتے ہیں۔امنگیں جاگ جاتی ہیں۔ہونٹ کھل اٹھتے ہیں مگر اِس بار بہت خوف ہے لوگوں میں۔کہیں مایون اور وادی میں اُترنے والے دوسرے پرندے کرونا وائرس نہ لے آئیں۔ہمارے غریب لوگ کیا کریں گے۔چار ماہ سے گھروں میں بند لوگ اور ڈھور ڈنگر اب باہر نکلنے کے متمنی ہیں۔نہ انتظامات وہ ہیں، نہ شعور، نہ آگہی اور نہ حکومتی ذرائع قابل اعتبار اور قابل بھروسہ۔

مجھے یاد آیا تھا۔ایک بار میرا بہار کے دنوں میں ہی چترال جانا ہوا تھا۔

مایون کیا آیا تھا وادی تو جیسے مسکرا اٹھی تھی۔ایک دوسرے کو مبارکبادیں جا رہی تھیں۔میں جس گھر میں ٹھہری تھی اس کے مکینوں کی مسرت اور سرشاری میرے لیے میرے لیے بڑا انوکھا تجربہ تھا۔ارشاد بابا کی پھول کی طرح نازک والدہ جنکے چہرے سے شفقت قندیل کی روشنی کی طرح پھوٹتی تھی۔مایون کی کہانی اور اِس خوبصورت پرندے پر کی گئی چترالی شاعروں کی شاعری انھوں نے ہی مجھے سُنائی۔

مایون پچھلے سال جو وعدے ہم سے لے کر گئے تھے وہ یاد ہیں۔

یونئے مایون متے کیاغ الاوٗ

(پیارے مایون میرے لیے کیا لائے ہو)

کیا دادی ماں کے لیے کشیدہ کاری کی سوئی لے کر آئے ہو؟

ہاں دادی اماں کے لیے کشیدہ کاری کی سوئی تحفوں میں شامل تھی۔لیکن پتھر پر سے

پانی پیتے وقت بھول آیا۔

ار ہر کے بیج تھوڑی مقدار میں تحفے میں لایا،

پر دوران سفر نہ جانے (کس نے ڈاکہ ڈالا)۔

اُس رات کھووار زبان اور کچھ اُردو میں، میں شاعروں کے محبوب مایون سے نا صرف روشناس ہوئی تھی بلکہ پرانے وقتوں کے ثقافتی عروسی ملبوسات، گھوڑوں پر بارات اور باراتوں کا دنوں ٹھہرنا جیسے واقعات کی تفصیلات سے بھی شناسا ہوئی۔ان باتوں میں الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا طلسم تھا۔اس منظر میں کلائمکس اسوقت آیا جب منقش چوبی ڈبے آئے اور نشست گاہ کے قالینی فرش پر یاقوت نیلم، زمرد اور زرقونوں کے گلابی، سبز، سفید اور سرخ پتھر بکھر گئے۔اللہ میں نے حیرت اور شوق کی بلندیوں سے انہیں جھکتے ہوئے چھو کر دیکھا میرے بچپن کے جھلملاتے رنگین خوابوں کے یہ عکس اسوقت میرے سامنے پڑے تھے۔

اپنے بچپن میں ہر روز جب میں بادشاہوں کی کہانیاں پڑھتی انکے زمرد یاقوت اور ہیروں جیسے جواہرات سے پُر خزانوں کی تفصیلات اوران کی ملکاؤں کے سروں گلوں اور ہاتھوں کو چار چاند لگاتے زیورات کا احوال پڑھتی تو سارا دن گویا اُن کی تصوراتی صورتوں کے نقش بناتی رہتی۔اُس رات میں یہ سب دیکھ رہی تھی۔

اب میں ارشاد بابا سے کیا کہتی۔بس پہاڑی اور میدانی علاقوں کے لوگوں کے لیے دعائے خیر ہی کرسکتی ہوں کہ ہم اِس نئی آفت سے محفوظ رہیں (آمین)

☆☆☆

میرے محبوب سے ملاقات

''اتوار کو اپنے محبوب سے ملیں۔'' یاسر پیرزادہ کی تحریر۔ خوشی سے باچھیں چر گئیں کہ کیا ہی حسن اتفاق ہے کہ میرا اور اُن کا محبوب ایک ہی نکلا۔ لیجیے کچھ لوگ بڑے معترض ہو گئے ہیں کہ چلو یہ اچھی ایکٹویٹی رہی۔ بھتیجے نے تو محبوب کا ذکر ہی کیا۔ پھوپھی تو مل ماربیٹھ گئی۔ بھئی یہ ہمارا بھی تو ہے۔ ارے ارے سو بسم اللہ۔ ہمیں کب انکار ہے؟ جیتا جاگتا رہے، آباد شاد رہے یہ ہم سب کا محبوب۔ یہ تو ہر اس بندے کا ہے جو تھوڑا سا کھسکا ہوا ہوتا ہے۔

سچی بات ہے ہم سے تو اگر کوئی یہ پوچھے کہ زندگی میں کیا کرنا سب سے اچھا لگا؟ جواب ہوگا کتابیں پڑھنا اور پُرانے گلی کوچوں میں گھومنا پھرنا۔ نوعمری سے اُدھیڑ عمری تک لاہور قدیمہ کے تہذیبی گہوارے کی کوئی نہ کوئی نئی گلی، نیا محلّہ ہر بار اپنے کسی نہ کسی نئے رنگ کے ساتھ دریافت ہوتا اور مجھے مضطرب کرتا۔ دیوانوں کی طرح اِس کے گلی گلیاروں میں کھڑی خود سے کہتی۔

ارے یہ تو میں نے پہلے دیکھا ہی نہ تھا۔

اس محبوب سے یاری دوستی کے آغاز کا زمانہ کالج کے ابتدائی دنوں سے ہوا جب سہیلیوں پر اپنی غریبی چھپانے اور تھوڑی سی امارت کی دھاک بٹھانے لنڈے بازار جا پہنچی۔ ہماری جوانی میں لنڈا بازار ایک البیلا کڑیل جوان تھا۔ اس کی ہر دکان قوس وقزح جیسے رنگ ونور میں گندھی لشکارے مارتی تھی۔ ابھی لاہور کے پر نہیں پھوٹے تھے اور ابھی

لنڈے بازار کی بھی آل اولاد شہر کے گلی کوچوں میں رلتی پھرتی نظر نہ آتی تھی۔ یہ میرا محبوب لنڈا اپنے ٹھکانے پر بڑے رعب دوب سے بیٹھا ہوتا تھا۔

یاد ہے پہلی بار گھر سے جب اِس کو دریافت کرنے نکلی تو جیب میں پانچ روپے تھے اور یہ کمائی دو بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر حاصل کی تھی۔اف میں تو ایک البیلی رومانی دنیا میں آ پہنچی تھی۔ ہائے ہیرے جیسی چمک والے بروچ، ٹاپس، جوتیاں، لشکارے مارتے کپڑے دل تھا کہ ہر چیز پر لڑھکتا پھر رہا تھا۔ایسی ایسی نادر چیزیں۔اب ''پلّے نہ سیر آٹا تے گاؤنڈی داسنگھ پاٹا'' والی بات تھی۔ بازار ختم ہوا تو دلّی دروازے کا بڑے سے پٹوں والا چوبی دروازہ تحیر سے لبریز آنکھوں کو اندر آنے کی دعوت دیتا تھا۔اُس کی دعوت قبول کی اور اندر جا گھسی۔ اور ایسی گھسی کہ اس کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ چھوٹا سا پہلا بازار ختم ہوا تو آگے پھر گلیارہ تھا۔ دروازہ تھا جس کے ساتھ ہی دکان پر مچھلی تلی جا رہی تھی اور سارے میں بکھری پکوڑوں کی خوشبو امتحان لے رہی تھی۔ ہائے اللہ چار آنے جیب میں۔ وہ زمانے بھی بڑی دید لحاظ اور مروت والے تھے۔دکان دار سادہ اوران پڑھ ہونے کے باوجود آنکھوں اور چہروں کو پڑھنا جانتے تھے۔اکنّی میں پکوڑے اور بینگن کا ایک قتلہ اخبار کے کاغذ میں لپیٹ کر پکڑا دیا۔آج بھی یاد ہے وہ پکوڑے میں نے مسجد وزیر خان میں بیٹھ کر چھوٹی سے چھوٹی بانٹ کے ساتھ اس کے در و دیوار اس کی محرابیں اور ان پر کندہ نقش و نگاری کے شاہکاروں کو دیکھتے ہوئے کھائے۔

میرے اندر خود انحصاری اکیلے گھومنے کی عادت یہیں سے پروان چڑھی۔ پرانے لاہور سے میرا عشق شروع ہوگیا۔مزے کی بات کبھی کسی لڑکے نے پیچھا نہیں کیا، کبھی کسی مرد کی ایسی ویسی حرکت یاد نہیں۔ سوچتی ہوں کیا صورت ہی ایسی پھٹکار بھری تھی کہ کوئی دو قدم پیچھے چلنے کو تیار نہ تھا۔

تکیہ مراثیاں بھی ایسے ہی جا پہنچی تھی۔ نام نے کتنی دیر ہنسایا تھا۔ کلاسیکل موسیقی کی ایک طرح یہاں پرورش ہوئی۔ بنگلا دیش کی گلوکارہ فردوسی بیگم کی یہ بات اکثر یاد آتی۔ ایک ملاقات میں اُنہوں نے مجھے کہا تھا۔ یہ ویسٹ پاکستانی تو ہمیں میراثی سمجھتے ہیں۔ واقعی تکیہ مراثیاں اِسی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

چوک نواب صاحب میں بڑے غلام علی خان رہتے تھے۔ مسجد وزیر خان میں میرا پڑاؤ ہونا ضروری تھا۔ یہیں چوک میں موسیقی کے عاشق حیات محمد خان کا گھر تھا۔ اندرون بھاٹی گیٹ کے محلّہ چومالہ میں برصغیر کے فنکار محمد رفیع کا گھر ڈھونڈنے اور دیکھنے میں آدھی دیہاڑی گُل کر دی تھی۔ رنگ محل سے کناری بازار، آگے چھتہ بازار، کُمّی بازار سے نکلتی۔ میرزا ادیب کے گھر کا دیدار کرتی، پکوڑے سموسے کھاتی لوہاری جا نکلتی۔ پیسہ اخبار کی خستہ گلاب جامنیں ہمیشہ اُدھر لے جاتیں۔ کبھی رنگ محل سے پانی والا تالاب۔ نقاب سے منہ ڈھانپے بازارِ حسن کا چکر لگتا۔ چوباروں کو دیکھتی۔ بالکونیوں کو تکتی۔ بُہت جی چاہتا سیڑھیاں چڑھ جاؤں اور دیکھوں کہ اُن کے دن کیسے ہیں؟ پر بُزدلی آڑے آجاتی۔

بٹّی گلی کے عقبی محلوں میں بُہت سی ہستیوں کے نقش کنندہ ہیں۔ اعظم مارکیٹ کی پیچ در پیچ گلیوں سے کتنے راستے نکلتے۔ چونا منڈی چلے جاؤ۔ شیرانوالہ گیٹ نکل جاؤ۔ منٹو پارک کی سیر کر لو۔

باہر کے ملکوں کے سیر سپاٹوں اور اُن کے ڈاؤن ٹاؤن کی سیروں کے بعد میں طویل عرصے بعد جب اپنے محبوب سے ملنے نکلی تب میرے اندر بہت ساری حسرتیں تھیں۔

ملک کی نامور شخصیتوں کے قدموں کی چاپ مجھے اِن گلیوں میں سنائی دی۔ علامہ اقبال سے لے کر فیض، ناصر کاظمی کِس کِس کا نام لکھوں۔ پر کہیں کوئی پلیک کوئی نشان، کوئی کتبہ، کوئی تختی کچھ نہیں تھا۔

ڈاکٹر انور سجاد تو ابھی بھی مسیحائی اُنہی گلیوں میں بانٹتے پھرتے تھے۔ پاکستان فضائیہ کا ایئر مارشل مصحف علی میر بھی بھاٹی گیٹ کی اِنہی گلی محلوں میں جوان ہوا تھا۔ اس کی ہر گلی، ہر کوچہ، ہر بازار تاریخی اہمیت کا حامل۔ کاش ہم اِسے تاریخی ورثہ بنا سکتے۔

امرتسر کے گلی کوچوں میں بھی میں اپنے گروپ سے الگ ہو کر گھنٹوں اکیلی پھرتی رہی تھی۔ کہیں اے حمید کا گھر ڈھونڈتی، کہیں منٹو کا اور کہیں عطاء الحق قاسمی کے ابّا کا۔

ایک چھوٹی سی تمنا، ایک چھوٹی سی دعا اندر سے نکل کر لبوں پر آجاتی ہے۔

کاش ورلڈ Heritage میرے اس محبوب کو سر سے پیر تک گود لے لے۔ اور اسے اتنا سنوار دے کہ یہ دنیا بھر میں نمایاں ہو جائے۔

☆☆☆

استنبول کی سلیمانیہ لائبریری

اور

خوبصورت ترک شاعری

سچ تو یہ ہے کہ سلیمانیہ لائبریری میں جانا اور ایک ہزار سال سے زیادہ کے ترک اسلامی کلچر کے فکری و علمی خزانوں کے مخطوطوں اور مسودات کو دیکھنا گویا اپنے آپ کو اس علمی ماحول میں تھوڑی دیر کیلئے محسوس کرنا اور سانس لینا ہی خدا کی ہمارے اوپر ایک بڑی عنایت تھی۔

اس عظیم الشان ورثے کے سامنے جب میں کھڑی تھی ایک تلخ اور حقیقت پسندانہ سوچ بھی ذہنی دروازہ کھولتی اندر آئی تھی۔ قومیں جب عروج پر ہوتی ہیں تو پھر طب ہو، انجینئر نگ ہو، ادب یا فنون لطیفہ ہر شاخ پھلتی پھولتی اور پھلوں پھُولوں سے لدتی اور نوازتی چلی جاتی ہے۔ سلیمانیہ دور بھی ایسا ہی تھا جب دل اور دماغ نے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر مشرق و مغرب کی فکری رسائی حاصل کی۔

استنبول کی سلیمانیہ لائبریری کمپلیکس استبول کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ مسجد سے ایک تنگ اور لمبا سا راستہ مدرسے اور لائبریری تک جاتا ہے۔ لائبریری الگ ہے اور قدیم علمی خزانے کو محفوظ رکھنے کا شعبہ الگ کر دیا گیا ہے۔ اِسے پہلا کتابی شفاخانہ کا نام دے لیں۔ پہلے ہم اسی جانب گئیں۔ اندر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ کِس درجہ شاندار انتظامات اِن

مخطوطوں اور مسودوں کی حفاظت کے کیلئے کیئے گئے ہیں۔جن کے اندر نوّے فیصد(90%)ترک اسلامی دنیا اپنے ثقافتی خزانوں اور افکار کے موتیوں کی صورت عربی اور فارسی رسم الخط میں کاغذات پر بکھری ہوئی ہے۔

لائبریری کو جب سے یونیسکو unesco نے اپنے چارج میں لیا ہے اسے جدید خطوط پر محفوظ اور استوار کیا جارہا ہے۔سیما اور میرے لیئے کیا یہ کسی اعزاز سے کم تھا کہ ہم طب کی دنیا کی اُس عظیم ہستی بوعلی سینا جسے مغرب Avicenna کہتی ہے کی طبی کتابیں اس کی اپنی تحریر میں لکھی دیکھتی تھیں۔کتاب الشفاء میرے سامنے شوکیس میں دھری تھی۔ جس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ اُسکے کچھ حصّوں کو پھپھوندی نے نقصان پہنچایا تھا۔بہت سے صفحات آپس میں جڑ گئے تھے۔اور وہ علیحدہ کرنے کی کوشش میں پھٹ رہے تھے۔ہر جدید حربہ استعمال میں لاکرانہیں محفوظ کر کے نئی صورت دی۔

سلیمان ذی شان کی مہر لگی کتنی بہت ساری اہم دستاویزات اور اولیاء آفندی کا سیاحت نامہ۔

جذبائیت نے آنکھوں کو گیلا کر دیا تھا۔

لائبریری کے ڈائریکٹر Nevzat Kaya ہماری خوش قسمتی سے اُس وقت موجود تھے۔انہوں نے فریم کیے ہوئے منصور بی محمد احمد کی انسانی اعضاء کی ڈرائینگ دکھائی۔عثمانی دور کے عالم بشیر آغا کے نباتات سے بننے والی دوائیوں کے منی ایچر پنٹینگ اور ان کی عربی تحریر میں مسودہ بھی نظروں کے سامنے تھا۔تھوڑی سی اس کی تاریخ پر بھی انہوں نے روشنی ڈال دی۔

1918 میں جب اندرونی ابتر حالات کی وجہ سے حکومت کی لائبریریوں پر وہ توجہ نہ رہی تو اِس سارے سرمائے کو ایک جگہ اکٹھا کیا گیا۔اس میں ترکی کے بہت سارے

اضلاع خاص طور پر اناطولیہ نے بہت کردار ادا کیا۔ یہ تہذیبی سرمایہ پتھروں پر کندہ کاری اور کاغذوں پر تحریری صورت میں سامنے آیا۔ یہ بلقان سے ایشیا اور افریقہ مراکش سے ہندوستان، ترکستان سے یمن تک کا نوّے فیصد (90%) فکری سرمایہ جہاں جہاں جس جس جگہ موجود تھا اکٹھا کر کے اُسے یہاں محفوظ کیا گیا۔ ملک بھر میں صاحب علم و دانش لوگوں نے اِس کارخیر میں حصّہ لیا۔

اسی طرح ہزار سال سے بھی زیادہ کا ترک اسلامی ثقافتی ورثہ 117022 جسمیں 67350 مسودات کی صورت اور 49663 کتابوں کی شکل میں اِسے ہنگامی اور سائنسی بنیادوں پر منظّم کیا گیا۔ پہلا بُک ہوسپٹل بنایا گیا۔ 1950 سے یہ سلسلہ شروع ہے۔

ہم مختلف کمروں میں گئے۔ جہاں ہم نے انہیں جدید شوکیسوں میں رکھے دیکھا۔ پھٹے ہوئے کاغذات کی چرمی جلدیں کرنے، انہیں محفوظ کرنے، انہیں کیڑوں سے بچائے رکھنے کیلئے جدید طریقے استعمال ہورہے ہیں۔ یہاں مائیکروفلم سروس، جلد بندی اور پتھالوجی سروس ہوتی تھی۔ کام جدید بنیادوں پر ہورہا ہے۔ پھٹے پرانے مسودات، اہم کاغذات اور دستاویزات ان کی بھی مرمت کہیں ان کی جلدیں، کہیں چرمی اور کہیں عام کیڑوں سے بچانے کیلئے اُن کا علاج اور سپرے۔ پھر انہیں نمبر لگا کر ترتیب سے شوکیسوں میں رکھنا سبھی کچھ اس اثاثہ کو محفوظ رکھنے کیلئے کیا جارہا ہے۔

جب ہم ان کے کمرے میں بیٹھے قہوہ پیتے تھے میں نے سوال کیا تھا کہ وہ کیا سمجھتے ہیں ترک زبان کا رسم الخط تبدیل کرنے سے ترک قوم کی نئی نسل قدیم، عظیم، تہذیبی، ثقافتی اور روحانی ورثے سے محروم نہیں ہوگئی۔ یہ اثاثہ عربی رسم الخط کی صورت لیئے بند الماریوں، شوکیسوں میں کتابوں اور مخلوطوں کی صورت سجا ہوا ہے۔ جن کے صفحات پر حکمت و دانائی کے موتی بکھرے ہوئے ہیں اور انہیں چُننے والے نہیں۔ ترک زبان کا رسم الخط تبدیل

کر کے ترک قوم کو اس کے ماضی سے کاٹ کر نہیں پھینک دیا ہے۔

انہوں نے قہوے کا گھونٹ بھرا اور متانت سے کہا......

''کِسی حد تک آپ کی بات سے مجھے اتفاق ہے کہ ہمارے بچے اُس سب سے ناآشنا ہیں جو ہماری وراثت ہے کیونکہ میرے ذاتی تجربے کے مطابق جو کچھ بھی ہم ترجمہ کر کے شائع کرتے ہیں اسمیں غلطیوں کے بہت سے امکان ہوتے ہیں۔ چلیئے وسائل کی فراہمی تو کِسی نہ کِسی انداز میں ممکن ہے۔مگر مسئلہ وقت اور تیز رفتاری کا ہے۔دنیا بڑی سرعت سے آگے بڑھ رہی ہے۔''

چند لمحوں کیلیئے وہ رکے۔انہوں نے دھیرے سے شیشے کی چھوٹی سی گلاسی سے قہوے کا آخری گھونٹ بھرا اور اُسے ٹیبل پر رکھتے ہوئے گفتگو کو جوڑا۔

1928 میں "حرف انقلاب" کا آغاز ہوا۔اس وقت ترکی کی شرح خواندگی افسوسناک حد تک کم تھی صرف بارہ فیصد۔اتاترک جیسا وژن رکھنے والا لیڈر اِس امر سے آگاہ تھا کہ ملک کو ترقی کی شاہراہ پر ڈالنے کیلیئے قوم کا پڑھا لکھا ہونا کتنا ضروری ہے۔دراصل عثمانی ترکوں نے زبان کو مشکل بنا دیا تھا۔فارسی اور عربی کا ذخیرہ الفاظ شامل کرنے سے یہ عام آدمی کیلیئے مشکل ہوگئی تھی۔رسم الخط بھی عربی میں تھا۔تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترکی زبان کا اپنا رسم الخط کوئی نہیں تھا۔قسطنطنیہ،ایشیائے کوچک اور ترکستان کے ترکوں نے مسلمان ہونے کے ناطے عربی رسم الخط کو اپنایا۔تب ان کے پیش نظر اسکے آسان یا مشکل ہونے کا مسئلہ نہ تھا۔

یہ کریڈٹ بہر حال اتاترک کو جاتا ہے کہ اس کے تیز ترین اقدامات نے ترک قوم کو قلیل عرصے میں 60% کی شرح پر پہنچا دیا تھا۔بہر حال یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اتاترک کے چاروں اہم رفقاء میں سے کسی حد تک سبھی مگر خصوصی طور پر عصمت انونو

کے پیشِ نظر نئی ترک نسل کو اسلام کے دائرہ اثر سے باہر نکالنا بھی تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے اپنی بائیوگرافی میں کیا ہے۔ تاہم یہ بھی وقت کا تقاضا تھا کہ ہم اور ہماری زبان جدید رجحانات سے اپنا دامن بھرتی۔ مغرب نے علم کو، ادب کو، گونا گوں تجربات سے مالا مال کر رکھا ہے۔ مشرق فکری طور پر انحطاط کی طرف مائل ہے۔ فکری سوتے تو مغرب سے پھوٹ رہے ہیں۔

میں چاہتی تھی کہ اپنی ناقص عقل کے مطابق اس کا جواب دوں کہ یہ بھی تو دانائی نہیں کہ صدیوں پرانے اپنے اثاثے منجمند کر دیں۔ تاریخ میں جھانکا جائے تو معلوم ہوگا کہ اب نئے خزینوں کے حصول کیلئے لاطینی رسم الخط کی طرف لپک پڑنے کی بجائے اپنی ہی چیزوں کو نئے رنگ دینے، انہیں نئے سانچوں میں ڈھالنے اور بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اُسے مزید مالا مال بھی تو کیا جا سکتا تھا۔ میں بہت سے ملکوں کے نام لینا چاہتی تھی جو ترقی یافتہ ہیں۔ جن کی زبان مشکل ہے جیسے جاپان، چین اور اسرائیل۔ خیر اسرائیل نے تو کمال ہی کیا کہ جس نے اٹھارہ صدیوں سے نہ بولنے والے عبرانی جیسی مردہ زبان کو زندہ کر کے اپنے ماتھے پر سجالیا۔

مگر میں چپ رہی۔ میں تیسری دنیا کے ایک شورش زدہ ملک کی باسی ایسے اہم فیصلوں کی گہرائی کیا جانوں۔ میں نگوڑی تو اتنا جانتی ہوں کہ ہم تو اپنی قومی زبان اردو کو ہی ابھی تک مکمل طور پر اپنا نہیں سکے۔ تعصّبات میں ہی اُلجھے رہتے ہیں۔ اب تھوڑی سی جدید ترک شاعری سے بھی لطف اندوز ہوں۔ اورہن ولی اور ناظم حکمت جیسے معتبر شاعر کیا کہتے ہیں۔

تنہائی (اورہن ولی)

وہ جو اکیلے نہیں رہتے کب جانتے ہیں

خاموشی بندے کو کتنا خوف زدہ کرتی ہے
خود سے کوئی کتنی دیر باتیں کرتا ہے
کتنی بار شیشوں کی طرف دوڑا جاتا ہے
کسی ذی روح کی تمنا اور خواہش کرنا
وہ اسے کب جانتے ہیں

ناظم حکمت

جیل کے اندر گلاب کے پھولوں بارے سوچنا تو ٹھیک نہیں
ہاں سمندر اور پہاڑوں بارے سوچنا اچھا ہے
گھڑی دو گھڑی آرام کیے بغیر پڑھتے لکھتے رہو
اب ایسی بھی بات نہیں کہ تم
دس پندرہ سال جیل میں گزار نہ سکو
گزار سکتے ہو جب تک کہ وہ موتی
جو تمہارے سینے کے بائیں جانب ہے
اپنی چمک نہیں کھو بیٹھتا

☆☆☆

چین پر ہمیشہ کی طرح اب بھی اعتماد کی ضرورت ہے۔

سچی بات ہے شورش کا یہ شعر''طوائف گھری ہوئی ہے تماش بینوں میں''اِن دنوں مجھے خود پر اور ملکی حالات پر بڑا فٹ بیٹھتا نظر آتا ہے۔

گذشتہ کچھ دنوں سے ایکا ایکی ذاتی مسائل کے اژدہام نے یوں طنابیں چاروں اور کس دیں کہ ارد گرد بکھرے چیختے چنگھاڑتے واقعات کہیں پس منظر میں چلے گئے تھے۔ چلو کچھ سانسیں درست ہو ہیں تو احساس ہوا ملک میں آٹے کا بحران ہے اور خیر سے ایف آئی اے نے اس کی تحقیقات شروع کر دی ہیں۔ بنی گالا میں رہنے والے بادشاہ کی بے نیازی کا تو کچھ پوچھیں مت پہلے تو اُسے خبر ہی نہ ہوئی کہ آٹا نام کی کوئی چیز مہنگی ہوگئی ہے۔صدقے جاؤں اس تجاہل عارفانہ کے۔ابھی اس بیان پر ہی لتے لیئے جا رہے تھے کہ ایک اور ایسا ہی شوشا پھر سامنے آ گیا کہ شہنشاہ سلامت کا اپنی تنخواہ میں گذارہ نہیں ہوتا۔اب غصہ جتنا مرضی آئے۔کمہار پر تو نکلتا نہیں کھوتی پر ہی نکلے گا۔اب بھئی کھوتیاں تو ہم بیچارے غریب عوام ہی ہیں نا۔ابھی اسی پر بس نہیں ہوئی سرکاری درباری بھی ترنگ میں آ گئے۔اپنے لیئے مزید آسائشوں کا مطالبہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنے بچوں کی عیاشیوں کے لیئے مطالبات بھی شروع کر دیئے۔ہائے کہیں ڈوب مریں جا کر۔ان کے پیٹ ہیں یا کنوئیں۔

اب ان سب بے شرموں کی ڈھٹائی، کمینے پن اور نالائقیوں کو ایک طرف کرتے

ہوئے عالمی سطح پر پھیلی ایک اور خبر نے چونکا کر رکھ دیا۔ دوست اور ہمسایہ ملک آناً فاناً قدرتی آفت کی زد میں آ گیا۔ ہاتھ کلیجے پر پڑا کہ اکلوتی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ چین میں ہے۔ آفت زدہ شہر ووہان بیجنگ سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں۔ دنیا کی معاشی سپر پاور کے ہاں کرونا وائرس کے ناگہانی ظہور نے تھرتھلی مچادی۔ بیٹی سے بات چیت سے اُن کی خیریت پتہ چلی اور کچھ حالات سے بھی آگاہی ہوئی۔ بیٹی کے لہجے میں ملال کی آمیزش تھی جب وہ باتیں کرتی تھی۔ بیجنگ جیسا بڑا بارونق شہر ویران اور اُداس نظر آ رہا ہے۔ کالج سکول یونیورسٹیاں سب 17 فروری تک بند ہیں۔ جنوری کا آخری ہفتہ چینیوں کے لیئے بہت اہم ہوتا ہے۔ چھٹیاں ہوتی ہیں اور لوگ اپنی آبائی جگہوں پر ملنے ملانے اور موج میلے کے لیئے جاتے ہیں۔ اب جو جہاں ہے اُسے وہیں روک دیا گیا ہے۔

جذباتی اور خالی خولی نعروں اور خبروں پر پلنے اور چلنے والی اس بے عملی قوم کی یہ بوڑھی پاکستانی عورت بھی تو نری جذباتی ہے۔ بے اختیار سوچنے لگی ''لو اب تو خدا یاد آ رہا ہوگا۔'' گذشتہ سال کے مارچ میں اپنے بیجنگ قیام میں آئن سے ملنا یاد آیا تھا۔ تیس بتیس کے ہیر پھیر میں یہ عورت مجھے DRC کے پارکنگ ایریا میں ملی تھی۔ جو خدا پر یقین رکھتی تھی برطانیہ کے چرچ آف گاڈ سے منسلک تھی۔ مجھ سے پوچھتی تھی کیا میرا بھی اس پر یقین ہے۔ باتیں کرتے کرتے آسمان پر نظریں ڈالنا نہ بھولتی۔ اور گفتگو میں قدرے محتاط بھی تھی۔

''ارے لو ایسا ویسا یقین۔ ہمارے تو سارے معاملات ہی وہ چلا رہا ہے۔ اب بیتابی سے بیٹی سے پوچھا کہ ایسے قیامت جیسے وقت میں انہیں خدا تو یاد آ رہا ہوگا۔ انسان کتنا بھی مظبوط اور طاقتور کیوں نہ ہو جائے۔ مصیبت اور پریشانی میں کسی کے کندھے پر سر رکھ کر رونے کی ضرورت تو ہوتی ہے نا۔

بیٹی ہنسی۔ ارے نہیں۔ یہ قوم بے حد مستعدی سے دفاعی انتظامات میں مصروف

ہے ۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی انہیں فرصت نہیں، خیال نہیں، چاہت نہیں، اسپتال بنا رہی ہے۔ برف باری میں نمک پھینک کر سڑکیں صاف کر رہی ہے۔ معمول کے سب کام انتہائی ذمہ داری سے سرانجام دینے میں مصروف ہے۔ باہر بس ضرورت اور اپنے کام کی ادائیگی کے لیے نکل رہی ہے۔ بیٹی نے مزید کہا ابھی میں ایک پاکستانی چینل پر پاکستانیوں کا واویلا سُن رہی تھی چین میں تعلیم پانے والے بچوں کے والدین کا بھی بہت اصرار تھا کہ اُن کے بچوں کو فوری واپس لایا جائے ۔ ووہان میں اُن کی خاصی تعداد ہے۔ میری ایسے تمام والدین سے التجا ہے کہ وہ صبر اور استقامت کا مظاہرہ کریں کہ یہاں بہتریں طبی سہولتیں ایک منظّم انداز سے دی جا رہی ہیں۔ پاکستان میں ایسے کسی شخص کا داخلہ جو اس بیماری کا شکار ہو گیا ہے۔ خطرناک ہوسکتا ہے۔ کہ وہاں تو طبی سہولتوں کا وہ معیار ہی نہیں۔

ابھی وہاں پڑھنے والا ایک پاکستانی طالب علم جو چھٹیاں گزارنے شنگھائی گیا ہوا تھا، کرونا وائرس کے جاننے پر اپنے گھر والوں کو فون کر بیٹھا کہ مجھے ٹکٹ بھیج دیں۔ ٹکٹ آ گیا، مگر ایئر پورٹ سے ہی اُسے ڈی پورٹ کیا گیا۔ تمام ٹیسٹ کروائے ۔خوش قسمتی سے بچے کے ٹیسٹ نیگیٹو تھے۔ مگر اس کے باوجود اُسے مزید چودہ دن کے لیئے روکا گیا کہ وائرس کے اثر کرنے کا دورانیہ چودہ دن کا ہے۔

ہاں ہم مسلمانوں کو اپنے دین کی اس اہم جز کی اہمیت پر مسرت ہوئی ہے کہ یہاں تاکید کی جا رہی ہے۔ ہاتھوں کو دھوئیں، چہرہ دھوئیں، کلی کریں، ناک میں پانی ڈالیں۔ وضو کی ساری باتیں دہرائی اور لازمی کی جا رہی ہیں۔

ہاں میں ضرور مخمصے میں ہوں۔ کرونا وائرس کا ایشو تو ابھی زوروں پر ہے کہ ایک نئے سیاپے کی بھی آمد ہو گئی ہے۔ برڈ فلو کا۔ اب بطخیں بے چاریاں دھڑا دھڑ ماری جا رہی ہیں۔ سوچتی ہوں کہیں یہ سنکیانگ کے مسلمانوں کی آہوں کا نتیجہ تو نہیں۔ کیسے انہیں محصور

کرر کھا ہے۔ کیسے اُن پر ظلم ڈھائے جارہے ہیں، کیسے انہیں فضلہ کھانے کو دیا جارہا ہے۔ او پر والا اتنا ظلم تو برداشت نہیں کرتا۔ کسی کا ہو نہ ہو ہمارا تو ایمان ہے بھئی۔

چلیں چھوڑیں۔

ایک اور اہم مسلے نے توجہ کھینچی ہے۔ امریکہ کی فلسطینی ریاست بارے تجاویز اور پاکستان کا اظہار کہ فلسطینی ریاست قائم کی جائے تو اس کا دارلحکومت بیت المقدس ہو۔

مجھے ہنسی آئی ہے ایسے احمقانہ بیان پڑھ کر۔ بیان دینے والے کو تاریخ سے ذرا بھر بھی آگاہی نہیں کہ اسرائیلی حکومت نے ایسے احمقانہ بیانات پر کیا کہا ہوگا۔ بیت المقدس کا مطلب یروشلم ہے۔

یروشلم جو صہیونیوں کا دل ہے۔ اُن کی روح ہے۔ ان کا دو ہزار سال پرانا خواب تھا جس کے لیئے ہر صہیونی کے لیئے یہ کہنا لازم تھا کہ وہ اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر یروشلم کا مرثیہ پڑھے۔

''اے یروشلم اگر میں تجھے بھول جاؤں تو میرا دایاں ہاتھ مفلوج ہو جائے۔''

اس یروشلم کو حاصل کرنے، ارض کنعان کو اپنا ملک بنانے کے لیئے انہوں نے کتنے پاپڑ بیلے۔ کتنی محنت کی۔ اس کی کیا تفصیل۔

1905ء میں خطہ فلسطین کے نقشے پر چاول کے دانوں کی طرح کہیں کہیں بکھری یہ یہودی قوم آج ایک صدی بعد اس حالت میں ہے جیسے کبھی فلسطینی تھے۔ اتنی امیر عرب ریاستوں کے ہوتے ہوئے کیسی کسمپرسی کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

اور آج جب وہ اس قدر طاقت ور بن چکے ہیں کہ آپ کا قبلہ و کعبہ، آپ کے مربی و مرشد کے اس سے خفیہ تعلقات خاصی اہمیت حاصل کیے بیٹھے ہیں۔ بیشتر اسلامی ملک اُسے تسلیم کر چکے ہیں۔ آپ باتیں کرتے ہیں بیت المقدس کو فلسطینیوں کو دینے کی۔

جان لیجئے ۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں مستقبل کے خوابوں کی چمک ہے
کیسنٹ (اسرائیلی پارلیمنٹ) کے مرکزی دروازے پر لگے اسرئیلی ریاست کے نقشے کی
ابھی حدود کا تعین نہیں ہے۔اپنے ہمسائیوں کو وہ ہڑپ کرنے کا متمنی ہے۔

☆☆☆

علی شیر نوائی

''علی شیر نوائی ہمارا قومی شاعر۔''

تاشقند کی اِس میٹھی سی دھوپ میں یہ سنتے اور نوائی کے چمکتے مجسمے پر نگاہ ڈالتے ہوئے میں نے قدرے تعجب سے اپنی گائیڈ آریانا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے تمہارا شاعر کیسے ہوگیا۔ یہ تو افغانستان کے مغربی شہر ہرات جیسی تہذیبی اور علمی جگہ کی جم پل اور وہیں دفن بھی ہے۔''

نوجوان آریانا نے فخر وغرور سے پُر لہجے میں تُرت جواب دیا تھا۔

''ہرات ہمارا ہی تو حصہ تھا۔ ہمارے تیمور جیسے عظیم شہنشاہ کے دور میں اور نوائی اُسی دور کا ہیرا ہے۔''

''اوہ'' کہتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی پر افسوس ہوا۔ البتہ پھر یہ ضرور ہوا کہ اپنے اِس سیر سپاٹے اور تاشقند یونیورسٹی میں شعبہ اورینٹیئل سڈیز میں گھومتے پھرتے کتابیں دیکھتے پھرولتے شاعر میری ترجیحات میں رہا۔

تو 9 فروری 1441ء میں ایک ارسٹوکریٹک فوجی خاندان میں پیدا ہونے والا یہ علی شیر نظام الدین علی شیر ہروائی کے نام سے بھی جانا جاتا تھا۔ تعلیمی سلسلہ زیادہ ہرات اور مشہد میں ہوا۔ یہ شخصیت ادب اور فنون لطیفہ کی چند ایک نہیں بلکہ بے شمار جہتوں سے نہ صرف وابستہ بلکہ اُن میں کمال فن کے درجے پر پہنچی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ رومی کے کوئی 250 سال بعد پیدا ہوا۔ وسط ایشیا کا یہ عظیم انسان اپنی صوفی روایات سے جڑا ہوا تھا۔ اتنی مختلف جہتوں میں کام کرتا، کہیں کمال کا مصور، کہیں سیاست دان، کہیں ماہر تعمیرات۔ ان سب کے ساتھ

شاعری کے والیوم۔ اِس سلسلے میں وہ دانتے Chaucer (قرونِ وسطیٰ کا انگلش شاعر) اور Galoards جیفرے (لاطینی شاعر) کی طرح کا ہی تھا۔ شاعر، ادیب، مترجم، سیاست دان، ماہرلسانیات، ماہرتعمیرات، صوفی کتنے روپ تھے اِس نوائی کے۔

اس وقت کا ہرات علم وادب کا گہوارہ، اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز گردانا جاتا تھا۔ شہنشاہ تیمور بذات خود علم وفن سے بہرہ ور اور اس کا بانی وسرپرست تھا۔ علی شیر خود چغتائی امر (جنہیں فارسی میں میر کہا جاتا تھا) سے تعلق رکھتا تھا جو اُس وقت کی سوسائٹی کی ایلیٹ کلاس تھی۔ باپ غیاث الدین کچکینا kichkina خراسان کے حکمران شاہ رخ مرزا کے محل کا افسرِ اعلیٰ تھا۔ ماں بھی محل میں شہزادے کی گورنس تھی۔ خاندان تیمور شہنشاہ کے بہت قریب تھا۔ اپنے پہلے ٹرکش دیوان کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے۔

میرا باپ تو محل باڑی کی مٹی جھاڑتا تھا\
ماں وہاں خادمہ تھی\
خود میں اُس درباری باغ کی بلبل یا کوّا\
اس باغ سے باہر جو کچھ بھی ہوتا\
میری روح جدائی کی ٹیسوں سے بے حال رہتی

عظیم تاریخ دان Hondamir کے مطابق عہد ساز شاعر نطفی نے اس کے بچپن میں اُسے دیکھا۔ بات چیت کی اور کہا۔

''بہت فطین بچہ ہے۔ نامور ہوگا۔''

1447ء میں خاندان کو ہرات سے بھاگنا پڑا کہ شاہ رخ کی موت نے خراسان میں ابتری کی صورت کو جنم دیا تھا۔ علی شیر نے اپنی تعلیم مشہد ہرات اور سمرقند سے حاصل کی۔ علی شیر نوائی کی زندگی سادہ بے حد مذہبی اور مجرد قسم کی تھی۔ شادی نہیں کی۔ ملازمت کا جہاں

تک تعلق ہے خراسان کے سلطان کے منتظم اور مشیر اعلیٰ تھے۔ وہ ماہر تعمیرات بھی کمال کے تھے کہ تعلیمی درسگاہیں، مسجدیں، خانقاہیں، سرائے، پل، حمام بہت کچھ تعمیر کروایا۔ تعمیرات میں سب سے اہم صوفی شاعر فریدالدین عطار نیشاپور کا مقبرہ ہے اور ہرات کا مشہور مدرسہ۔ تعمیرات، ادب، شاعری اور دیگر بے شمار حوالوں سے اِس عہد کو تیمور کا دُورِ نشاۃ ثانیہ کہا جاسکتا ہے۔

آغاز کا کچھ کام پرانی ازبک زبان میں ہے۔ مغرب میں اِسے چغتائی لٹریچر کہا جاتا ہے۔ نوائی ترکی زبان کا بہت بڑا مدّاح تھا۔ وہ اِسے فارسی زبان پر فوقیت دیتا اور مقابلتاً افضل گردانتا تھا اور اِس بارے وہ بڑا واضح اور دوٹوک تھا۔ شاعری کو اِس نے اپنی مقامی زبان میں کرنے کو ترجیح دی۔ شاید کہیں اس کی دلی محبت کا جھکاؤ بھی یہاں شامل تھا۔ اس نے اِسے اپنے کام سے ثابت بھی کیا۔ جب لکھنا شروع کیا تو قلمی نام نوائی رکھا۔ علی شیر نوائی نے ترک زبانوں میں انقلابی سطح کا کام کیا۔ تیس سالوں میں تقریباً تیس والیوم کا کام جس نے چغتائی زبان کو محترم و معزز بنا دیا۔ بہت سا کام فارسی میں بھی ہے۔ یہاں قلمی نام فینی تھا۔ عربی میں البتہ قدرے کم ہے۔ اِس منفرد چغتائی زبان میں شاعری کرنے کی وجہ سے ترکی بولنے والی پوری دنیا میں وہ ترک لٹریچر کے اولین بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔

نظموں میں بہترین کام زیادہ تر چار دیوانوں میں موجود ہے۔ بہت سا کام شاعری کے مجموعوں میں بھی پایا جاتا ہے جو تقریباً 5000 اشعار پر مشتمل ہے۔ شاعری کی انفرادیت کا اندازہ اِس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُس کے کام کا ہر حصّہ زندگی کے مختلف حصّوں کا منفرد انداز میں ترجمان ہے۔

اِن نظموں کی ایک اور نمایاں خوبی غزل کی ساخت ہے۔ قدیم عربی شاعری کے انداز و اطوار کے ساتھ غزل خراسان اور وسط ایشیا میں پھیلتی چلی گئی۔ جس پر صوفیانہ رنگ

ڈھنگ اثر انداز ہوتا گیا۔اس کی ساخت کے ڈھانچے میں وہی مخصوص محبت اور جدائی کا رنگ غالب رہا۔

استنبول کی سلیمان ذی شان لائبریری میں نوائی کے مندرجہ ذیل دیوان موجود ہیں۔

1۔ غاراب الصغیر (بچپن کے اسرار) 2۔ نوادرالشباب (جوانی کی ندرتیں)

3۔ بدی الوسط (اُدھیڑ عمری کے معجزے) 4۔ فوائدالکبیر (بڑھاپے کے فوائد)

اس کا پہلا چغتائی ترک دیوان ''غاراب الصغیر'' بہت ساری وجوہات کی بنا پر بہت دلچسپ ہے۔اس کا دیباچہ ہی اندر کی ساری کہانی کھول دیتا ہے۔

جوانی کے جو شیلے جذبوں کا پاگل پن جس نے شاعر کو سنجیدہ مطالعے،موسیقی اور شراب سبھوں سے قدرے دور کر دیا تھا۔اِس کا اظہار احمد عبداللہ حجازی کی سوانح حیات کے خاکے میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔سلطان حسین کے لئے شکر گزاری کے گہرے جذبات کہ جو کردار سلطان نے اپنے وقت میں علم وفنون کو عروج دینے اور اس کی شاعری کو سنوارنے میں ادا کیا وہ لائق صد تحسین ہے۔شاعری میں اس کا اظہار اس طرح سامنے آیا ہے۔

جب بادشاہ نے درستگی کے لئے قلم ہاتھ میں پکڑا
تب ہر سطر شاہکار بنی اور ہر لفظ معتبر ٹھہرا

علی شیر نوائی کے بہت سے دیگر اہم کاموں میں خمسہ بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ پانچ رزمیہ نظموں کی صورت میں موجود ہے۔ایک طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ نظامی گنجوی کے خمسہ کی کسی حد تک نقل ہے۔

1۔ حیرت ال ابرار (صالح لوگوں کے اسرار) 2۔ فرہادوشیریں

3۔ لیلیٰ ومجنون 4۔ سبعہ سیّار (سات سیارے)

5۔ سدسکندری (سکندراعظم کے بارے)   6۔ لسان اطیر

نوائی کے خمسہ کی دوسری داستان شیریں فرہاد جو 1484ء میں لکھی گئی اس کا شمار کلاسیک میں ہوتا ہے۔رومیوجیولیٹ کی طرح کی رومانی داستان وسط ایشیا کی محبوب کہانی۔ اسی طرح چار موسموں پر بھی قصیدے ہیں۔

ترک شاعروں کی نوائی نے بہت مختلف انداز میں بھی تربیت کی۔''میزان ال اوزان'' یعنی میٹروں فاصلوں پر بھی شاعری کی اصطلاحیں ایجاد کیں۔''مجالس ال نفیس'' میں بڑے لوگوں کی مجلسی محفلوں کے آداب پر پوری عصری شعرا کی سوانح حیات اوراُن کے کام کی تنقیدی جائزوں پر مشتمل کتاب 450 خاکوں پر مشتمل ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مجموعے کوسونے کی کان سے مشابہت دی جاسکتی ہے کہ جس نے امیر تیمور کے زمانے کی خوبصورت ثقافتی اوردلکش تصویریں کھینچ دی ہیں۔

''منطق لسان'' بظاہر پرندوں کی بولیوں پرمگرایک بے حدانوکھی وضع کی کتاب جواس کے فلسفیانہ اورصوفیانہ نظریات پر مبنی ہے۔انسان جسے خدا کی ضرورت ہےاور تلاش ہے۔دنیا بھر کے پرندوں کومثالیہ انداز میں کردار بناتے ہوئے جواپنے بادشاہ سے دوراور اس کی کھوج میں ہیں۔سوال پیدا ہوتا ہے یہاں کیا وہ نیشا پور کے فریدالدین عطار کی شہرہ آفاق کتاب ''منطق الطیر'' سے متاثر ہوا۔

Waqfia وقفیہ بھی نوائی کا ایک اہم دستاویزی کام ہے۔اسے بھی 1481ء میں فینی کے نام سے لکھا گیا۔اس میں شاعر کی دنیاداری سے بھری ہوئی زندگی کی جھلکیاں ہیں۔رومانیت کا وہ کسی حدتک قائل تھااوراس کی روزمرہ زندگی میں کتنا دخل اس کا تھا۔اس کے تشنہ خواب اس کی ادھوری رہ جانے والی خواہشوں سبھوں کے عکس ان کا اظہار بہت دل پذیرانداز میں سامنے آتا ہے۔ Wagfiya تیرھویں صدی کی سماجی اور ثقافتی زندگی کی

بہترین عکاسی کرتی کتاب ہے۔اسی طرح لیلیٰ مجنون چھتیس ابواب پر مشتمل 3622 اشعار پر مشتمل۔یہ بھی انہی سالوں میں لکھی گئی۔

''سروج المسلمین''۔ یہ اور اہم کام ہے۔اسلامی قوانین اور اسلام کے پانچ اہم ستون شریعہ، نماز، زکوٰۃ، اور حج۔اُسے حکومت ازبکستان نے 1992ء میں بہت اہتمام سے چھاپا۔

نورالدین عبدالرحمٰن جامی کی نغمات انس کو چغتائی ترکی میں ترجمہ کیا۔اور اسے کیا خوبصورت نام دیا،'' نسیم المحبت ''۔اس کے صوفیانہ اور مذہبی خیالات اس کتاب میں بھرپور انداز میں سامنے آئے۔فارسی کی شاعری بھی 6000 لائنوں پر مشتمل ہے۔

نوائی کا آخری شاہکار کام Muhakmat al-Lughatayn محاکمتہ اللغتین کا ہے۔1499 میں لکھی جانے والی یہ کتاب دراصل دوزبانوں کے درمیان ادبی تقابلی جائزہ لیتی نظر آتی ہے۔یہ کام بھی وہ بڑے دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔عورت کے چہرے پر حسن کے نشان کے لیے ترکی میں جولفظ موجود ہے وہ فارسی میں نہیں۔چغتائی زبان میں الفاظ کے تین چار معنی بہت عام ہیں۔جبکہ بقول نوائی کے فارسی میں نہیں۔یعنی دو زبانوں کا موازنہ۔فارسی اور ترکی کی صورت میں ہوا۔جہاں بہرحال انہوں نے بڑے مضبوط دلائل سے ترکی زبان کی وسعت پذیری، اس کا لوچ، رس اور صحت کو افضل گردانا۔

یورپ میں علی شیر نوائی کے نام اور کام سے شناسائی بہت دیر میں ہوئی۔ڈینس ڈیلی Dennis Daily کو پڑھیئے کہ وہ اِس ضمن میں کیا کہتا ہے۔

تمہارے سامنے ایک خداداد لکھاری ابھرتا ہے جو شاید تمہارے لیے میری طرح نہیں ہو۔میرے لئیے تو سب سے پہلا سوال خود اپنے آپ سے تھا کہ یہ شاعر کون ہے؟ اور میں نے اس کے بارے اب تک کیوں نہیں سُنا اور پڑھا؟ میری عمر کے بہت سے لوگوں کی

طرح میری بھی توجہ تعلیم اور مغربی ادب پڑھنے پر ہی مرکوز رہی۔ پھر جب دوسرے خطوں کے ادب نے توجہ کھینچی تو سب سے پہلے فارسی کے صوفی رومی اور حافظ نے متاثر کیا۔

مگر نوائی کو پڑھنا کتنا حیرت انگیز تھا۔ رومی اور دوسرے شعرا کی طرح نوائی کی نظمیں بھی اپنی ظاہری چمک دمک کے ساتھ ساتھ معنی کی بھی بہت گہرائی میں بھی اُترتی ہیں۔ پڑھنے میں لُطف دیتی، دوبارہ اور سہ بار پڑھنے پر اُکساتی آپ کے قلب ونظر میں سکون اتارتی چلی جاتی ہیں۔

دیکھیے ذرا۔

کتنے سال میں گوشہ نشین رہا
خواب، خواہشیں اور منظر اکساتے ہیں
کتنے سال میں نے خود کو چھپایا
کہ زندگی کے موتیوں کی کھوج کروں
یہ حیران کرنے والی بات نہیں
کہ نوائی صحرا کی طرف چل پڑا
اس تسکین کے حصول کے لیے
جو درد عشق نے پیدا کیا
اور یہی تو وہ ہے جو اس کے اندر گہرائی میں اُتر گیا

ذرا اِسے پڑھیئے۔

میرے نزدیک ذہنی وسعت اور خوش نصیبی کے بغیر
بے صبری کی آگ بھسم کر دینے والی ہے
عقل وخرد کے محافظ غائب ہو گئے ہیں

اور میر کارواں متوقع آگ سے بچاؤ کے لیے بے بس ہے
ایک برق سی کوندی ہے اور اس نے مجھے بدل کر رکھ دیا
بھیڑ کا بہاؤ پھٹتا ہے
اور جیسے آگ کا سمندر سا بن جاتا ہے
سمجھو
نوائی میں اپنے درد سے منکر ہو جاتا ہوں
جیسے Masandran کے جنگل آگ سے سرخ ہو جاتے ہیں۔
یہاں نوائی کا ایک اور انداز دیکھیے......
تمہارے بغیر بہار میرے لیئے
دوزخ جیسی ہی ہے
جو بن پر کھلا ہوا سرخ پھول
جیسے دہکتی آگ ہو
یہ ہرگز عجیب بات نہیں
کہ جنت بھی دوزخ جیسی ہی ہے
اگر وہاں تمہاری دید نہیں
اس کے خوابوں کی فینٹسی جب مجھے محسوس ہوتی ہے
میرے چہرے پر آنسو درد و غم کی جھریوں کی قطاریں بنا لیتے ہیں
طبیب بیمار آدمی کے لیے لذیز پھل تجویز کرتا ہے
یہ حیرت کی بات نہیں
اگر تمہارے شریں لب تضحیک آمیز رویہ اختیار کریں

بے رحم حسینہ، ستم گر حسینہ
روح اپنی عدم وجودیت میں کسی ہاتھ تھامنے کی متمنی ہو رہی ہے
کیونکہ اسے احساس ہے
یہ وجود اپنی صورت میں بڑا ٹیڑھا اور گنوار ہے
مت کہو کہ نوائی بے لباس ہے
نہیں وہ پہنتا ہے
عدم وجودیت کا چوغہ
بدقسمتی کا پیرہن جسے جھوٹ نے سیا ہے
دسویں دن کا چاند جب کمان کی صورت رہ جائے
تب آسمان
بادشاہ کے نیلے گھوڑے کے سامنے شاہی نقیب بن جاتا ہے

اسے بھی پڑھیئے ......

میں تمہارے بغیر زندگی گزارنا
جان گسل اذیت سے مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔
اے روح مرجانا بہتر ہے
بجز راس زندگی کے جو تمہارے بغیر گزرے
مردے سانس نہیں لیتے
میری آہ وبکا اور چیخ وپکار بے ثمر ہے
اگر تم مجھ پر نظریں نہ ڈالو۔
یہ ایسے ہی ہے

جیسے دنیا کی نظروں سے اوجھل بلند و بالا پہاڑوں پر بجلی چمک جائے
میرے رنج والم و وارفتگی کے کوئی معنی نہیں تمہارے بغیر
بالکل ایسے ہی جیسے پہاڑوں پہ بجلی گرے
رنج والم اور فکر سے مردوں کو بھلا کیا غرض
لیکن تم سے جدائی کا رنج مجھے چور چور کر دیتا ہے
جدائی کی تکلیف سے آسمان میرے سر پر پھٹ گیا ہے
دیکھیں یہ دن آخر کار کیا رنگ دکھاتے ہیں
اگر تم عہد وفا کرو تو نوائی لافانی ہو جائے
تم سے جدا ہو کے تو اک پل بھی ممکن نہیں میرا زندہ رہنا
میری خواہش ہے کہ کبھی کسی پر ایسا مشکل وقت نہ آئے
جیسا کہ مجھ پر ہے
تمہارے بغیر میری ہوش مندی، عقل و خرد اور کارِ دُنیا سب بیکار ہیں

سچ تو یہ ہے کہ نوائی وسط ایشیا کے ترک لوگوں کے محبوب شاعروں میں سب سے اہم نام ہے۔ اُسے بلاشک وشبہ چغتائی زبان وادب کا بہت بڑا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔ اس زبان پر اس کی مہارت اور کام کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اُسے نوائی کی زبان کا ہی درجہ دے دیا گیا ہے۔ سوویت اور ازبک ذرائع کا اعتراف ہے کہ ازبک زبان کا بانی بلاشبہ نوائی کو ہی کہا جاسکتا ہے۔

1941ء میں پورے سوویت یونین میں نوائی کا پانچ سو سالہ جشن منایا گیا تھا۔ پورے وسط ایشیا میں بے شمار مقامات اور جگہیں اس کے نام پر منسوب ہوئیں۔ تاشقند میٹرو اسٹیشن، انٹرنیشنل ائیر پورٹ۔

تاہم اب آزادی کے بعد از بکستان نے اپنے شاعر کو ابدیت کا پھول کا ٹائیٹل اس کی پانچ سو اکہترویں 571 سالگرہ کے موقع پر دیا ہے۔

اس کی نظم کے اس بند سے اُسے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اِسے ختم کرتی ہوں۔

گرینائیٹ کے انبار میں موتی کی طرح
راکھ کے ڈھیر میں دہکتے کوئلے کی طرح
کانٹوں کے درمیان سرخ گلاب کی طرح
اور بے جان وجود میں ایک صاحبِ علم روح کی طرح

☆☆☆

قصّہ ایک افسانہ لٹنے کا

بنیادی طور پر میں ایک اُستاد ہوں۔عرصے سے میری خواہش ایک اچھا ادارہ کھولنے کی رہی تھی۔1990 میں قدرت نے موقع فراہم کیا۔تیرہ سال تک مخلوط تعلیمی سلسلہ چلتا رہا۔گرلز سکول کا جب سیکنڈری بورڈ کے ساتھ الحاق ہوا تو لڑکوں کو الگ کرنا ضروری ٹھہرا۔یوں بھی ہمہ وقت بچے بچیوں کی نگرانی مسائل پیدا کر رہی تھی۔والدین کا بھی پریشر تھا۔چنانچہ چار کنال کی جگہ خرید کر اس پر عمارت کی تعمیر شروع ہوگئی۔چونکہ یہ ایک بڑا پروجیکٹ تھا اس لئے میرے شوہر کو تعمیراتی نگرانی کے لیے رات گئے تک سائٹ پر ٹھہرنا پڑتا۔موقع غنیمت سمجھتے ہوئے میں بھی گھر سے لکھنے پڑھنے کا سامان اٹھا لائی اور چھوٹے سے کمرے میں دھری الماری میں اسے سجا دیا۔اِن ادھورے اور کچھ مکمل مسوّدوں میں ایک ایسا افسانہ بھی تھا جسے میں نے مکمل تو کر لیا تھا پر اِس کی کانٹ چھانٹ ابھی باقی تھی۔کئی بار اِسے کھولتی،قلم ہاتھ میں پکڑتی کچھ تھوڑا بہت کام کرتی پھر اُکتا کر اُسے سنبھال دیتی۔

گذشتہ تین چار سالوں سے میں اس کے ساتھ یہی سلوک کرتی چلی آ رہی تھی۔ میرے حسابوں افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خاصا متنوع تھا۔اُسے ٹریٹمنٹ بھی اچھا دینے کی کوشش کی گئی تھی۔پر اس کی نوک پلک دُرست ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔کبھی میرا جی چاہتا کہ میں اس کی فوٹو کاپی کروالوں،کہیں یہ اِدھر اُدھر ہی نہ ہو جائے۔پر اس وہم کے باوجود میں اپنی ازلی سُستی کے ہاتھوں معاملہ آج کل پر ہی لٹکاتی رہی۔

دونوں ونگز کے درمیان تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا۔معروف دانشور میکالے

کے مطابق کہ ہر جتن کرو اور پیدل چلنے کے لیے وقت نکالو۔ میں نے بھی اس فاصلے کو اپنی واک کا ایک حصّہ بنانا ضروری سمجھا۔ چار پانچ چکریوں میرے معمول کا حصّہ بن گئے کہ کبھی میاں سے گپ شپ کرنے، کبھی چائے پینے کا بہانہ ہوتا، کبھی کھانا کھانے کا اور کبھی لڑائی کرنے۔ لڑائی بالعموم میاں کی شاہ خرچیوں کے سلسلے میں ہوتی۔ گرلز کیمپس کے ملازموں میں سے ایک دو چلبلے سے چھوٹی سی پُھر لی چھوڑ دیتے۔ میڈیم وہاں تو آج مٹھائی آئی ہے، آج آئس کریم پارٹی ہو رہی ہے۔ میں جانتی ہوں میاں انتہائی فضول خرچ انسان ہے۔ اس کے ہاتھ میں موریاں نہیں مورے ہیں۔

اب جب لڑنے کے لیے جاتی، وہ ساری میری بکواس بہت سکون سے سُنتا اور پھر مدھم سی مسکراہٹ چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہتا ''اری او نیک بخت۔ دیکھنا اتنی گرمی میں کام کر رہے ہیں۔ ان کا شوگر لیول ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ اِس بہانے شوگر اندر چلی جائے گی۔'' چلو میں بھی مطمئن ہو جاتی۔

عمارت مین روڈ پر بن رہی تھی اور میں چلنے کے لیے ہمیشہ دوسری سب لین استعمال کرتی جس کے دونوں اطراف پر گھر ضرور تھے پر ٹریفک کم ہوتی۔

انہی دنوں عید الفطر آ گئی۔ ہفتہ اتوار ساتھ مل جانے کی وجہ سے چھٹیوں کا دورانیہ قدرے لمبا ہو گیا۔ میں نے سوچا اِس بار اِس افسانے کو گھر لے جاؤں گی اور ہر صورت اِس کا تیاپانچہ کر کے اسے کوئی نہ کوئی شکل دے دوں گی۔

آخری دن میں نے الماری کھولی۔ افسانے کو فائل میں سے نکالا۔ سفید چھوٹے سے شاپر میں ڈالا۔ افسانہ چار تہوں میں فولڈ شدہ تھا۔ دو تین جوڑے جرابوں کے بھی خانے میں پڑے تھے انہیں بھی اُسی شاپر میں ڈال لیا۔ ایک طرف ہزار کے دو نوٹ اور ایک سو کا نوٹ رکھا ہوا تھا وہ بھی اٹھا لیا۔ پہلے میں نے انہیں بھی شاپر میں ڈالنے کا سوچا پھر یونہی انہیں

موڑ کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ملازم سے کہا کہ وہ صاحب سے کہہ دے کہ میں گرلز ونگ چلی گئی ہوں۔ جب وہ گھر جانے لگیں تو مجھے وہاں سے لے لیں۔

اب میں شاپر کو ہاتھ میں جُھلاتی اپنے راستے پر ہو لی۔ ابھی میں نے نصف راستہ ہی طے کیا تھا جب آناً فاناً دو ہاتھوں نے ایک جھپٹا مار کر شاپر میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ بھونچکی سی ہو کر میں نے اپنے اردگرد دیکھا۔ ایک موٹر سائیکل پر سوار یہ دونو عمر لڑکے تھے۔ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس مجھے ایک پل میں ہی ہو گیا تھا۔ اپنی قیمتی متاع کے یوں چھن جانے پر میں باؤلی سی ہو کر ان کے پیچھے بھاگی۔ تیز بھاگتے ہوئے میں دہائیاں دیتی جا رہی تھی۔

''وے پُتر، وے سوہنیا، وے اے افسانہ اں ۔افسانہ وے تیرے کُجھ کم دا نیں ۔سِٹ جانہیوں ۔(پھینک جا اسے)''

پچپن سالہ عورت بگٹٹ اُن کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ رُونکھی آواز میں دہائیاں دے رہی تھی۔

''ارے بیٹے پھینک جاؤ اس کو۔ یہ تمہارے کچھ کام کا نہیں۔'' میری آواز بہت بلند تھی۔ میں پاگلوں کی طرح، کسی جنونی کی طرح بھاگ رہی تھی اور بولتی جا رہی تھی۔

اور جب وہ موڑ مڑ گئے۔ میں رُک گئی۔ آنسو میرے گالوں پر بکھر گئے تھے۔ میرے اندر جیسے غم و غصے کا بھانبڑ سا مچ اٹھا تھا۔ کسی لڑاکا جاہل اور دُکھیاری عورت کی طرح میری زبان نے چند گالیاں فضا میں اُچھال دیں۔

حرامزادے۔ کنجر دے تخم، شہدے، کمینے۔

اُس سمے نہ مجھے اپنی حیثیت کا کوئی احساس تھا اور نہ یہ یاد تھا کہ جہاں میں کھڑی ہوں اِن دورویہ گھروں میں بہت سارے بچے میرے سکول میں پڑھنے آتے ہیں۔

مجھے سوفی صد یقین ہے کہ جب انہوں نے وہ شاپر کھولا ہوگا۔کاغذوں کی پھولا پھرولی کی ہوگی اور اُس میں کچھ نہ پا کر اُسے کسی کھائی کھڈے میں پھینکتے ہوئے یقیناً میرے بارے میں کچھ اسی طرح کی گوہرافشانی کی ہوگی۔

کمینی، شہدی، زنانی ورے دناں اچ کاغذ لیئی پھردی اے۔(کمینی کنجوس عورت تہواروں والے دنوں میں کاغذ لیے پھرتی ہے۔)

☆☆☆

کچھ ستم وقت کے اور کچھ ہمارے

اب یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہمارے کالم نویس ایاز امیر بھی کیا دبنگ آدمی ہیں۔ پاکستانی جیسے منافقت سے بھرے معاشرے میں جو درست سمجھتے ہیں اُسے ڈنکے کی چوٹ پر کرنے اور برملا کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ چند دن پہلے میں رؤف کلاسرا کا کالم پڑھ رہی تھی جس میں اُنھوں نے اسمبلی کے اُس سیشن کا ذکر کیا جس میں تمام اسمبلی نے یک آواز ہو کر طالبان سے معاہدے کی منظوری دی تھی۔ اس اسمبلی میں اس معاہدے کے خلاف اُٹھنے والی واحد آواز جناب ایاز امیر کی تھی۔ مت بھولیے کہ اُس وقت طالبان کے خوف کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے جغادری اُن کا نام زبان پہ لانے سے ڈرتے تھے۔ لیکن آفرین ہے جناب ایاز امیر پر کہ اُنھوں نے بوقت قیام سجدے میں جانے کی بجائے کھڑے ہو کر دلیری سے اپنا موقف بیان کیا۔

اب پس پردہ کیا مصلحتیں تھیں، کیا عزائم تھے، کیا خوف اور ڈر تھے۔ کِس کِس بات کا رونا رویا جائے اور حقائق کو کہاں تک تجزیوں کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

اب اگر غیر جانبداری سے بات کریں تو ہمارے مقتدروں نے اس طالبان نامی عفریت کو کِس کِس طرح پھلنے پھولنے دیا۔ اُن سے امن معاہدے کیے، مگر وہ شتر بے مہار کی طرح پھیلتے ہی چلے گئے اور بعد ازاں حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ ہمارے اعلیٰ سرکاری عہدیداران کی پشاور کا نام سن کر ہی جان نکل جاتی تھی۔

جنرل راحیل شریف کے بارے میں کچھ بھی کہیں لیکن ایک بات کا کریڈٹ انہیں

دینا پڑے گا کہ جب ہمارے تمام لیڈران طالبان سے مذاکرات کی رٹ لگائے ہوئے تھے، اس اللہ کے بندے نے طالبان کے خلاف آپریشن شروع کیا اور اس عفریت کا قلع قمع کیا۔آنے والے دنوں میں پاکستان کی تاریخ جب بھی لکھی جائے گی جنرل راحیل کو ایک ایسے شخص کے طور پہ یاد رکھا جائے گا جس نے پاکستان کی سمت تبدیل کی۔

سچی بات مجھے ایکسٹینشن سے بے حد چڑ ہے،لیکن میرا خیال ہے کہ میاں صاحب نے جنرل صاحب کو ایکسٹینشن نہ دے کر اپنے اور ملک دونوں کے ساتھ بے حد زیادتی کی۔دلاوروں کی قدر نہ کی۔ کیسے کیسے لوگ اِس منحوس جنگ میں اپنوں کی ہی مسلط کردہ بلاؤں اور عفریتوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ماسوائے فوج کے کیا کبھی سول سوسائٹی نے اُن کو خراج تحسین پیش کرنے کی زحمت بھی کی۔ چوہدری اسلم،عفت اللہ غیور اور بے شمار ماؤں کے لال جو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ابدیت حاصل کر گئے،کیا کبھی کہیں اُن کا ذکر ہے۔اُن کی قربانیوں کا کوئی مول ہے؟ کوئی قیمت دے سکتا ہے۔ممکن نہیں،مگر ہم پر اتنا قرض تو واجب ہے کہ اُن کی قربانیوں کو یاد رکھیں۔حکومتی سطح پر پذیرائی کریں۔اُن کے خاندانوں کی ذمہ داری اٹھائیں۔اگر ریاست خود کو اِس طرح ذمہ داری اٹھانے سے گریزاں نظر آتی ہے تو آخر کچھ فرائض ہم لوگوں کے بھی تو ہیں۔ہم جو عوام ہیں،ہم میں سے ہی کچھ کی نام نہاد فلاحی تنظیموں اور این جی اوز کے بھی لمبے چوڑے سلسلے ہیں،مگر کیسے لوگ ہیں ہم جنہیں اپنی ذات کے علاوہ کچھ اور سوجھتا ہی نہیں۔میڈیا کو بھی کیا پڑی ہے۔اس کے ہاں تو ریٹنگ کی دوڑیں ہیں۔اب تو ویسے بھی میڈیا کے حالات کافی نازک ہیں۔

آہ! ہم نے کیا کیا اپنے ہاتھوں سے برباد کیا۔میری عمر کے لوگ جب اپنے ماضی میں جھانکتے ہیں تو انہیں اپنا بچپن،اپنی جوانی کس قدر رنگینیوں سے بھری نظر آتی ہے۔میلہ شالامار کا شاید کچھ لوگوں کی یادوں میں ہو۔گاؤں سے تعلق والے لوگوں کو میلے ٹھیلوں کا بہت

تجربہ ہوگا۔ گھروں کے سامنے کشادہ میدانوں میں راتوں کولڑکے لڑکیوں کا اکٹھے کھیلنا کتنی عام سی بات تھی۔ فلم اور میوزک پروگرام دیکھنے کے لیے سہیلیوں کے ساتھ پروگرام بناتے اور گھروں میں میلاد پر جا رہے ہیں، جیسے بہانے گھڑے جاتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے غربت میں بھی بہت امیر بچپن گزارا جہاں نہ فرقہ بندی تھی، نہ مسلکی اختلاف اور نہ ہی لسانی وصوبائی تعصّبات۔ ہمارے گھر کے نچلے حصّے میں بنگالی کرایہ دار تھے۔ ایرفورس کے نان کمیشنڈ فوجی۔ مجھے یاد ہے میری مرحومہ ماں اُن کا بے حد خیال کرتی تھیں۔ ہمارے بچوں کا بھی بچپن بھی بہتر تھا۔ ہاں ایک بہت اہم تہوار ہوتا تھا بسنت نامی، ہفتوں کیا جس کے لیے مہینوں تیاریاں ہوتی تھیں۔ سارے شہر میں ایک ترنگ، ایک امنگ رقصاں رہتی۔ آسمان کی چھتیں نیلے پیلے رنگوں سے سج جاتیں۔ ایک بہت دلچسپ سا واقعہ بھی سُن لیجیے۔

بسنت کی صُبح تھی۔ میں نماز کے لیے اٹھی۔ میں نے دیکھا میرا بڑا بیٹا جو اس وقت کوئی آٹھ نو سال کا تھا بیڈ پر نہیں تھا۔ سوچا شاید باتھ روم میں ہو۔ کوئی پون گھنٹے کے بعد جب میں واپس بیڈ روم میں آئی تو اُسے نہ پا کر پریشان ہو اٹھی۔ اب پورے گھر میں ڈھونڈنے کے بعد بھائی کے گھر بھی پتہ کروالیا۔ کہاں گیا آخر؟ والدین کی بے کلی عروج پر تھی۔ اِدھر اُدھر پتہ کروالیا۔ گھر کے سامنے مسجد تھی۔ بچہ جمعہ پڑھنے ضرور مسجد جاتا تھا۔ وہاں ہونے کا کوئی امکان تو نہیں تھا۔ مگر پاگلوں جیسی کیفیت میں دیور کو دوڑایا۔ پتہ چلا کہ کونے میں بیٹھا دعائیں مانگ رہا تھا۔ میں نے اپنے بہتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مانگ رہے تھے میری جان۔''

''امّاں اللہ میاں سے کہا تھا کہ آج ہوائیں پورب سے پچھّم کی طرف چلیں اور ہم بہت گڈیاں لوٹیں۔ یہ بھی کہا تھا کہ اللہ میاں جی آج ابو ہمیں شام تک کچھ نہ کہیں۔''

آپ اس اختصارے بھری کہانی سے بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔ ہم نے تو اُس کو

بھی خون کا کھیل بنا ڈالا۔لوگوں کا اتنا خون بہا کہ حکومت نے پتنگ بازی پر پابندی لگا کر اپنی جان چھڑائی۔آپ سٹیج ڈراموں کا حال دیکھ لیں۔بھیو دگی اور لچر پن کی وہ گرواٹ ہے کہ خدا کی پناہ۔

دل اس وقت پارہ پارہ ہوتا ہے جب مختلف ملکوں میں ہونے والے تہوار دیکھتی ہوں تو حسرت ہوتی ہے کہ یہ کس قسم کے ٹوٹے پھوٹے تہوار ہیں لیکن انہیں منانے میں اُن کی انتظامیہ اپنے بہترین نظم وضبط،نفاست اور سلیقے طریقے سے ایسی بھرپور جان ڈال دیتی ہیں کہ رشک آتا ہے۔ ہمارے تہوار کس قدر حسین اور اوریجنل تھے۔لیکن ہم نے کیا کیا؟ ہم نے اُن سب کا ناس مار ڈالا۔کیا ہم نے کبھی سوچا ہم خوشیوں کے لیے کتنی ترسی ہوئی قوم ہیں۔

مجھے تو افسوس اپنی نئی نسل کا ہے۔اپنے پوتوں کو دیکھتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ اِن بے چاروں نے زندگی میں دیکھا کیا ہے؟ دم بھر کو گھر سے قدم نہیں نکال سکتے۔نتیجتاً مبائل فونوں سے چمٹ کر رہ گئے ہیں۔قومیں جب زوال پر آتی ہیں تو زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوتا ہے۔کیا کرکٹ،کیا ہاکی،کیا سکواش،کیا رہ گیا ہے ہمارے پاس فخر کرنے کے لیے۔

☆☆☆

کچھ میری بھی سُن اے چارہ گر

ہائے یہ کیسی حسرت ہے میرے دل میں کہ کوئی معجزہ ہو جاتا۔ ہمارے پیارے جنرل صاحب اپنا استعفیٰ لکھ کر اِن سبھوں کے منہ پر مارتے اور کہتے ''لو سنبھالو اپنی یہ عنایت۔ مجھے نہیں چاہیے۔ نالائق لوگو تم لوگوں نے تو مجھے تماشا بنا دیا ہے۔ میری جگہ لینے والے کا حق کیوں مار رہے ہو۔ غلط روایات نہیں پڑنی چاہیں۔'' مگر آرزوئیں تو خاک ہونے کے لیے ہی ہوتی ہیں۔

ہاں البتہ ایک تو داد دینی پڑے گی کہ قوم کی حس مزاح اپنے عروج پر ہے۔ شاندار لطیفے اور تبصرے چشمے کے سربند پانیوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر باہر آرہے ہیں کہ ہنسنے کے ساتھ ساتھ بندہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہوتا ہے اللہ یہ کیسا پاگل پن ہم سب پہ طاری ہو گیا ہے یہ سلسلہ کہاں جا کے رُکے گا۔ ہمارے پاس مسائل کا انبار پہلے کیا کم تھا کہ اب ایکسٹینشن کے نام پہ نیا کٹا کھول لیا ہے۔ ہائے کب بالغ ہوں گے؟ کب عقل آئے گی؟ 72 سال کے بوڑھے ہو رہے ہیں۔ تف ہے ہم پر کہ آج تک ان غیر ضروری مسائل سے ہی باہر نہیں نکل سکے۔ جی چاہتا ہے کہ میڈیا والوں اور اپنے تیار کردہ اینکر حضرات سے پوچھیں کہ کیا اِس ملک میں ایکسٹینشن کے علاوہ بھی کچھ اور ہے یا نہیں۔ لگتا ہے کہ ایک سرکس لگا ہوا ہے۔ ایک پرفارمنس ختم ہوتی ہے تو کوئی نئی شروع ہو جاتی ہے۔ ہمارا میڈیا بس اللہ دے اور بندہ لے۔ اب آپ ہی مجھے بتایئے میاں نواز شریف پاکستان میں ہوں یا لندن میں ہماری صحت پر کیا

فرق پڑتا ہے؟ اگر جنرل باجوہ کی جگہ کوئی اور چیف آجائے تو پھر کونسا آسمان گر جائے گا۔بہرحال یہ تو سب جانتے ہیں کہ فوج میں بہ حیثیت ایک ادارہ ٹرانسفرز، پوسٹنگز اور پروموشن کا ایک مربوط نظام موجود ہے۔ وہ تمام جنرل صاحبان جو لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے ہیں وہ اِس قابل ہوتے ہیں کہ فوج کی کمان سنبھال سکیں۔تو پھر جنرل باجوہ پر اتنا خصوصی لُطف وکرم کیوں؟ اللہ رحم کرے ملک میں خدانخواستہ کوئی ہنگامی صورت بھی نہیں۔لوگوں کو لام وام پر بھیجے جانے والا کوئی چکر وکر بھی نہیں تو بھئی عزت آبرو سے انہیں بھیجو گھر۔توئے توئے ضروری کروانی ہے۔

سچی بات ہے غالب بے طرح یاد آرہا ہے۔

حیران ہوں کہ روؤں دل کو یا پیٹوں جگر کو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں اک نوحہ گر کو میں

ہائے ہم نے کبھی اپنے آپ سے سوال کیا ہے کہ 72 سالوں میں ہم نے کس کس چیز کا ستیاناس نہیں کیا۔بندر کے اُسترے کی طرح ہمارے ہاتھ جو لگا ہم نے اُس کی درگت بنا ڈالی۔اب حال یہ ہے کہ ساری سمتیں کھوئے بیٹھے ہیں۔اِس میں بھی یقیناً کوئی شک نہیں کہ موجودہ حالات کی بہت بڑی ذمہ دار یہ حکومت ہے۔لیکن کیا اِس سے پہلے ملک میں دودھ شہد کی نہریں بہ رہی تھیں۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا Governance Structure گل سڑ کے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔

چاہے بیوروکریسی ہو یا ہمارا عدالتی نظام، ہر چیز مکمل زوال کا شکار ہو چکی ہے۔ موجودہ حکومت اور پرانی حکومتوں میں فرق صرف تجربے کا ہے۔پرانے لوگ چونکہ اسی سسٹم کی پیداوار تھے اور اس کو بہت اچھے طریقے سے جانتے تھے تو اِس کو لے کر چلتے رہے۔جیسے ہی یہ نئے چہرے آئے ہر چیز دھڑام بوس ہوگئی۔مجھے لگتا ہے ہمیں اِس وقت شدید ضرورت

ہے تحمل سے بیٹھنے کی اور سوچنے کی۔ یہ گلا سڑا بوسیدہ نظام زیادہ دیر نہیں چل سکتا۔ یہ بات تو مجھ جیسی کوتاہ فہم بھی جانتی ہے کہ ہمارے پاس ایک چیز نہایت فراوانی سے موجود ہے۔ وہ ہے تجربہ۔ ایک لحاظ سے یہ ایک آئیڈیل صورتحال بھی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کہ جب سوویت ٹوٹا اور اپودھاپی پڑی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا۔ شریف اور کمٹیڈ لوگوں کا پتّہ ہوگیا۔ بدمعاشوں اور زبردستوں نے جو جو سمیٹ سکتے تھے سمیٹ لیا۔ نہ کہیں شنوائی اور نہ کہیں دادرسی۔ مہنگائی کا جن بے قابو تھا۔ تب ایک فائدہ تو ہوا۔ لوگوں نے صورت حال کو سنجیدگی سے لیا۔ مقامی صنعتیں میدان میں اُتریں۔ مارکیٹ قابو کی۔ قانون کی بالادستی قائم کی تو میرے خیال میں ہر تخریب کے پہلو سے تعمیر نکلتی ہے۔ اب اگر اپنی صورت حال کا جائزہ لیں اور اِسے ایک بامقصد کوشش کا حصّہ بنالیں۔ کیونکہ ہم ہر طرح کے سسٹم کو نافذ کر کے اس کے برے اثرات سے کماحقہ واقف ہو چکے ہیں۔ ہم مکمل مارشل لاء سے لے کر جوڈیشیل ایکٹوزم یا ہرڈ جمہوریت تک قریباً ہر نظام حکومت کے ثمرات نہ صرف چکھ چکے ہیں بلکہ اُن کی دی ہوئی چوٹیں بھی ابھی تک سینک رہے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل لوگ انقلاب کی بہت بات کرتے تھے اللہ خوش رکھے اِس حکومت کو جس نے ایک محدود پیمانے پر انقلاب اور تبدیلی کا ٹریلر چلا کر قوم کا یہ شوق بھی کسی حد تک پورا کر دیا ہے۔ یہ بھی مقامِ شکر ہے کہ ابھی صرف 10% انقلاب پہ یہ حال ہے تو مکمل انقلاب پہ کیا حال ہوسکتا ہے؟

اور اگر پھر بھی انقلاب کا کیڑا نہ مرے تو دور کیا جانا اپنے غارِ یار چین کو ہی دیکھ لیجیے۔ انقلاب سے عوام کے بخیے اُدھڑ گئے تھے۔ 30 سال تو چین کو صرف سیدھا ہونے میں ہی لگ گئے۔

اگر خالص جمہوریت کے ثمرات دیکھنے ہیں تو انڈیا کو دیکھ لیجیے، کیسا فاشٹ ہے جو انڈیا کی جڑیں کھودرہا ہے۔ ہاں یاد آیا اپنے ہٹلر صاحب بھی تو جمہوری طریقہ حکومت سے ہی

اقتدار میں آئے تھے۔ گو کہ ہم اِس کو آج تک ایک برائی ہی سمجھتے رہے ہیں۔ لیکن مقتدر اداروں کے کنٹرول کی وجہ سے ہمارے سیاستدان اُس حد تک کھل کھیل نہیں سکے جس حد تک وہ باقی جگہوں پہ کھل کھیلے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اِس وجہ سے وہ پرفارم بھی نہ کر سکے۔ تاہم ہر حال میں Institnitonal Oversight ہی زبردست چیز ہے۔ ذرا سوچیے اب اگر ہم اِن تمام تجربات اور اپنی قومی نفسیات کو سامنے رکھ کر ایک نئے نظام کے بارے میں متفق ہو جائیں اور یہ طے کر لیں کہ اب یہ ملک اسی نظام کے تحت چلے گا تو یقین جانیے ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ایک دفعہ ہماری سمت درست ہو جائے اور ادارے ایک دوسرے پر بھروسے اور یقین کے ساتھ اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے کاموں پہ توجہ دینا شروع کر دیں تو ہم بہت جلد ترقی کی منزلوں کو طے کر سکتے ہیں۔ ورنہ ہمارا ترقی معکوس کا سفر تو چل ہی رہا ہے۔ دیکھیے یہ کب دھڑام بوس ہوتا ہے۔

☆☆☆

رُوس کے عظیم قومی شاعر الیگزینڈر پشکن
کی شادی کی دلچسپ کہانی

الیگزینڈر پشکن نے ماسکو میں نتالیا کو پہلی بار دیکھا۔

نتالیا گنچارووا۔سولہ سال کی بالی عمر کی چنچل وشوخ وشنگ لڑکی جس کے حسن اور اداؤں کی رُوس کی ایلیٹ کلاس میں دُھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ کس قدر دلچسپ بات ہے کہ اس کی محبت کا آغاز اگر نتالیا کے نام سے ہوا تو اختتام بھی نتالیا کے نام سے ہو رہا تھا۔

''نتالیا میرے دل میں ہی نہیں دماغ میں بھی گھس گئی ہے۔'' اُسنے اپنی ساس کو لکھا تھا۔

سُسرال کو شادی کی ذرا جلدی نہیں تھی۔ انکے مطالبات بھی بے شمار تھے اور تحفظات کی بھی لمبی لسٹ تھی۔ گو پُشکن کے باپ نے بولدی نو کی جائیداد اس کے نام کر دی تھی۔ شاہی ملازمت بھی مل گئی تھی کہ شہرت بطور شاعر مسلمہّ ہو چکی تھی۔ کتابوں کی آمدنی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ پر زندگی میں میانہ روی اور اعتدال نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔

شاعر کا دل بُری طرح اس پر آ گیا تھا۔ اُسکے لئے وہ کسی دیوی کا روپ دھار گئی تھی۔ اپنی مشہور نظم ''میڈونا'' اور ''اونیگن'' میں اُس کی دلی خواہش کُھل کر سامنے آتی ہے۔ کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ میں اپنا گھر بھی بناؤں گا اور پرانے شاہکاروں سے اسے سجاؤں

گا۔اب میرا مطمع نظر گھر والی ہے۔میری سب سے بڑی تمنا پُرسکون زندگی اور گوبھی کے سوپ کا پیالہ ہے۔''میڈونا'' میں اُس نے نتالیا کے حسن کو حُسن مریم سے تشبیہ دی اور پاکیزگی مسیح ابن مریمؑ جیسی چاہی۔نظم میں اُس کا یہ اظہار کہ اسکی تخلیق اس خوبصورت رنگ وروپ کے ساتھ خدا نے بنائی ہی اُسکے لئے ہے۔خوبصورتی اور رعنائی کے اس مجسمے کو وہ اپنے گھر میں دیکھنے کا خواہشمند ہے کہ جسکے ریشے ریشے میں اُسکی مشقت گھلی ہوئی ہے۔

دل کھول کر اُسنے دلہن اور سُسرال کی خواہشوں کو پورا کیا۔شادی 1831ء میں جس شاہانہ انداز اور کرّ وفر سے ہوئی اُسنے اُسے ساٹھ ہزار روبل کے قرضے کے نیچے دبا دیا تھا۔

شادی سے قبل وہ مضطرب سا تھا۔بے چین سا،عجیب سے جذبات واحساسات کی یلغار کی زد میں آیا ہوا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''کیا یہ انتہائے مسّرت ہے۔'' اُسنے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ہاں،نہیں شاید۔''

اُسنے باری باری تینوں جواب خودکو دیئے۔پر پھر بھی کہیں اضطراب تھا۔

اور شادی سے اڑتالیس گھنٹے قبل وہ تانیہ کے پاس گیا جسکا خانہ بدوشوں سے تعلق تھا۔

''تانیہ کچھ گاؤ۔کوئی ایسی چیز جو میرے لیئے خوش قسمتی کی تعبیر ہو۔تم جانتی ہو میں شادی کر رہا ہوں۔''

تانیہ کی خوبصورت غزالی آنکھوں میں گذرے دنوں کے خوبصورت عکس جھلملائے۔بغیر ایک لفظ بولے وہ اٹھی اُس نے گٹار اٹھایا۔قالین پر بیٹھی۔تاروں سے نکل کر جو گیت فضا میں بکھرا،اُسمیں حُزن وملال کا وہ رچاؤ تھا جس نے ساری فضا کو پل جھپکتے

میں غمناک کر دیا۔شاعر نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا اور کسی چھوٹے سے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تانیہ کی آنکھیں بند تھیں۔لمبی گردن پورے وقار سے کھڑی تھی۔گیت کا حُزن اور شاعر کی سسکیاں پورے ماحول پر پھیلی ہوئی تھیں۔

''آہ'' بہت دیر بعد اُسنے سر اٹھایا اور کہا۔''اس گیت نے مجھے ختم کر دیا۔یہ کسی بڑے صدمے کی پیشین گوئی ہے خوشی کی نہیں۔''

اور جب تقریب عرُوسی میں ایک دن باقی تھا۔اُسنے اپنے دوستوں سے کہا۔

''تو آؤ کہ میرے ساتھ مل کر میرے کنوارپنے کی زندگی کو دفن کرو۔''

اور اسکے گہرے درجن بھر دوست اکٹھے ہوئے اور چاہا کہ محفل موج و مستی ہو۔پر حیرت زدہ ہوئے کہ وہ کیسی اذیت میں ہے۔

اپنی جوانی کو،اپنی آزادی کو،الوداع کہنے کیلئے اُسنے اپنی نظم میں سے چند اشعار پڑھے۔

''میں موت کب چاہتا ہوں۔مجھے تو زندگی کی آرزو ہے۔میں غم سے آگاہ ہوں اور فکر و پریشانی سے بھی میرا تعلق ہے۔''

ایسے اشعار جیسے وہ جوانی کو رخصت نہیں کر رہا تھا بلکہ زندگی سے رخصت لے رہا تھا۔جیسے وہ نئی زندگی کو نہیں بلکہ موت کو خوش آمدید کہہ رہا ہو۔جیسے آج کے بعد اسکی زندگی میں کل نہیں ہوگا۔

اور میز کے گرد بیٹھا اُسکے دوستوں کا ٹولہ دہشت زدہ سا اُسے دیکھتا تھا اور پھر اُسنے رندھے گلے اور بھرائی آواز میں انہیں خدا حافظ کہا اور اپنی منگیتر سے ملنے چلا گیا۔

یہ اٹھارہ فروری 1831ء کا سرد برفیلی کٹیلی ہواؤں کے جھکڑوں میں جھولتا جھومتا

دن تھا۔ پُشکن کی شادی کا دن۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی ماسکو کے چرچ Ascension میں ہو رہی تھی۔ ماسکو کی ایلیٹ کلاس چرچ میں اس اتنی شاندار شادی اور اخراجات کے تخمینوں پر تبصروں اور حاشیہ آرائیوں میں مصروف تھی۔ زرق برق گاؤن پہنے اور منقش ٹوپیاں اوڑھے داڑھیوں والے پادری منتظر تھے۔

دلہن کی آمد، اسکا شاہانہ عروسی لباس، روشنیوں کا سیلاب اور گیتوں کی آوازیں سنہری کارپٹ پر چلتی دلہن کی تمکنت، حسن اور بانکپن اتنا بھرپور تھا کہ وہ مسکرایا۔ اپنی گردن کو اکڑایا۔ سینے کو اوپر اٹھایا اور اپنی قامت کو لمبا کیا کہ دلہن اس سے لمبی تھی۔

سیٹوارڈ نے تقریباتی کراؤن اُنکے سروں پر رکھے اور پادری نے انہیں زندگی اکٹھے گذارنے کے دعائیہ جملے کہے۔

اور جب انگوٹھیاں پہنائی جا رہی تھیں۔ اچانک ایک آرائشی سنگار پٹی فرش پر گری۔ خود کو اس سے بچانے کیلئے وہ جھُکا۔ رحل سے ٹکرایا۔ صلیبی مجسمہ اور گوسپل ایک بھدی آواز سے گرے اور پشکن کی کینڈل بجھ گئی تھی۔

شاعر کھڑا ہوا۔ چہرے پر پیلاہٹوں کی زردی کے ساتھ۔ ڈوبتی شکستہ آواز اسکے ہونٹوں سے نکلی۔

''All the bad omens''

نتالیا سے شادی پر وہ خوش تھا۔ گو شادی مسائل کے انبار لے کر آئی۔ غیر معمولی شخصیت غیر معمولی عزم و حوصلہ والا۔ جی داری سے کھڑا رہا۔ جم کر کام کیا۔

نتالیا کو دراصل یہ احساس ہی نہیں تھا کہ جس نے اُسے پسند کیا، اُسے چاہا اور اپنی شریک زندگی بنایا وہ کیا ہے۔ مہنگے ترین ملبوسات، منفرد جیولری، اپنے گرد عاشقوں کا ہجوم اور عیش و عشرت سے لبریز زندگی اُسکا منتہا تھا۔

1831ء میں شادی ہوئی اور 1835ء تک وہ چار بچوں کی ماں بن چکی تھی۔ماریا الیگزینڈر، گریگوری اورنتالیا۔آغاز کا کچھ وقت اُس نے پشکن کی جاگیر پر گزارا۔کیپٹل پیٹرز برگ میں آنے کے بعد اُسنے باقاعدگی سے کورٹ سوسائٹی میں جانا شروع کردیا۔مداحوں اور عاشقوں کا ہجوم اسکے گرد اکٹھا ہوگیا تھا جن میں زارنکولس اوّل سرفہرست تھا۔پشکن کونفرت تھی زار سے''Cloud''میں بادل کے استعارے میں اُس نے زار کو ہی مخاطب کیا تھا۔

یہ شب وروز چکّی کے اُن دوپاٹوں کیطرح تھے جن میں وہ پس رہا تھا۔زارنکولس کیطرف سے ملنے والا کورٹ ٹائیٹل بہت توہین آمیز تھا جس نے اُسے غضبناک کیا۔پرنتالیا کا رویہ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز تھا۔

ابھی اسپر ہی اکتفا نہ تھا کہ دارلحکومت کی فضاؤں میں نتالیا کے ایک نئے سکینڈل کی افوائیں اڑیں۔یہ فرنچ نوجوان جارج ڈی انتھیس (George d' Anthes) حسن وجوانی اوروجاہت کا دلآویز نمونہ جسے ڈچ سفیر ہیکرن نے اپنے بیٹا بنایا ہوا تھا۔

دی جیپسز''The Gypsis''اُس کی شہرہ آفاق نظم کے کردار اگر حقیقی تھے تو الیکو کا کردار اُسکا تخلیق کردہ تھا۔رُوسی شہری مرد۔خانہ بدوش زیمفیرا کی ماں تاریکی میں جب اُسکے باپ کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی جاتی ہے تو شاعر کہانی کے ہیرو الیکو کی زبان سے زیمیفرا کے باپ بوڑھے خانہ بدوش سے کہتا ہے کہ تم نے اُس درندے کا پیچھا کیوں نہ کیا۔دونوں کو گولی کیوں نہ ماری۔بوڑھے کا جواب اُسکے من کو نہیں لگا تھا جب اُس نے کہا۔

''محبت پر تو کوئی اختیار نہیں اور جوانی آزاد ہوتی ہے۔''

جب زیمفیرا ابھی کسی اور کے ساتھ دل لگاتی ہے اور رات کی تاریکی میں اپنے عاشق سے ملنے جاتی ہے تو الیکو دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے.یہ کہتے ہوئے کہ محبت

میں کیسی شراکت داری؟

تو وہ بھی الیکو ہی تھا۔ جوش غضب اور رقابت سے بھرا ہوا۔

''تو پھر آؤ۔ ڈوئل لڑتے ہیں۔'' اُسنے للکارا۔

یہ خوفناک اور شدید قسم کی ڈوئل تھی۔ بڑا اعلی نشانہ باز تھا۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی شرطوں کا فیصلہ گولیوں سے کرنے کا عادی تھا اور ہمیشہ جیتا تھا۔

''تو پھر کیا ہوا؟ وہ زندگی سے کیسے ہار گیا؟''

''جو دل سے ہار جائیں۔ زندگی بھی انہیں ہرانے پر تل جاتی ہے۔''

اُسکا تو غیظ و غضب اُسے اٹھا کر لے گیا تھا۔ وگرنہ وہ تو ہارا ہوا تھا۔

شدید زخمی تھا۔ لوگ اٹھا کر اسی گھر میں لائے۔ اور پورا پیٹرز برگ اس گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر ماتم کی کیفیت میں تھے۔ غضبناک تھے۔ موت کی خبر کو دو دن تک چھپایا گیا۔ دو دن بعد بھی ہجوم اتنا بپھرا ہوا تھا کہ آدھی رات کو خاموشی سے میت گورسک مناسٹری میخائلوفسکائے کے نزدیک اسکی ماں کے پہلو میں دفن کے لئے لے جائی گئی۔

میں اُس کمرے میں تھی جہاں اُسے زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔ وہ بستر جہاں اُسے لٹایا گیا۔ وہ بندوق جس سے وہ زخمی ہوا۔ میز پر پڑی وہ گھڑی جو اُسکی آخری سانس کے ساتھ ساکت کردی گئی تھی۔ چھوٹی سوئی دو (2) اور تین (3) کے درمیان اور بڑی نو (9) پر۔ وہ آگاہ تھا اپنے مقام سے۔ ایسے ہی تو اُسنے نہیں لکھا تھا کہ ایکدن رُوس کی سرزمین پر میرا نام ہوگا، دنیا کی زبانوں پر میرا کلام ہوگا۔ اور زارِشاہی کا منارہ میری عظمت کے سامنے سرنگوں ہوگا۔

☆☆☆

پاکستان کے حالات پر روسی انستاسیا کی چٹھی

چٹھی ملی ہے۔ پرانی ڈاکیے والی نہیں، بجلی والی۔ گھگھڑ منڈی سے۔ چٹھی پیٹرز برگ کی انستاسیا کی ہے۔ وہ اپنے پاکستانی سسرال آئی ہوں۔ ماشاءاللہ سے سسرال سیاست میں بڑا نام رکھتا ہے۔ لکھتی ہے۔ گذشتہ ڈھائی ماہ سے یہاں ہوں۔ پاکستانی سیاست کی شعبدہ بازیاں سُن سُن کر مجھے تو کچھ یوں لگتا ہے جیسے میں پیٹرز برگ یونیورسٹی کے طلبہ کو نکولس دوم کے عہد کو پڑھا رہی ہوں۔ راسپوٹین کی خود ساختہ روحانی علمیت کی قصہ کہانیاں اور اُن کے اثر ونفوذ پر بحث کر رہی ہوں۔ کتنے ڈھیر سارے سوالوں نے سر اٹھا کر مجھ سے کچھ پوچھا ہے۔ اب میں من وعن یہ سوال نہیں لکھ رہی ہوں۔ کہ کیا تمہارا ویسے مجھے کہنا چاہیے تھوڑا سا میرا ابھی یہ ملک اِس وقت کچھ مخفی، کچھ سفلی، کچھ معجزاتی قوتوں کے زیر اثر ہے؟ کیا سلطنت کے اہم امور پر عملیات کا کوئی اثر ہے؟ مملکت کے کام وظیفوں اور دعاؤں کے مرہون منت ہیں۔ کیا ہم آخری زار نکولس دوم کے جیسے دور میں سے گزر رہے ہیں۔ کیا دارالحکومت پر راسپوٹین جیسے جھوٹے اور عیار لوگوں کا اثر پھیلا ہوا ہے۔ اسلام آباد پیٹرز برگ کے بیسویں صدی کے آغاز کی جھلکیاں نہیں پیش کر رہا ہے؟ کیا اس کے در ودیوار پر وہ فیصلے رقم نہیں ہو رہے ہیں جو مستقبل کی کوئی اچھی تصویر نہیں دکھا رہے ہیں؟ کیا ہمیں کچھ نشان دہی ہو رہی ہے جو یہ بتا رہی ہے کہ قوموں اور ملکوں کی زندگیوں میں انقلاب کیوں آتے ہیں؟

تاریخ کی اُستاد ہونے کے ناطے مجھے تو 1910 کے روس اور آج کے پاکستان میں بڑی گہری مماثلت نظر آتی ہے۔

اس میں تو بہر حال کوئی شک نہیں کہ پاکستانی توہمات ،اعتقادات اور واہموں میں گھری رہنے والی قوم ہے۔ستاروں کی چالیں،معجزوں کی برکات اور پیشن گوئیوں پر ایمان دراصل حکمرانوں کے نالائق اور کمزور ہونے کی دلیلیں ہیں۔نکولس دوم اپنے باپ الیگزینڈر رسوم جیسے بہادر، جی دار اور پرعزم انسان کی بجائے کمزور، بزدل، تیز حکومتی فہم و فراست سے عاری اور بیوی کے اشاروں پر ناچنے والا زار تھا۔

اپنے سسرالی گھر میں ہونے والے تبصروں میں مجھے اس ملک کے اقتدار کے ایوانوں میں جو جو قصے کہانیاں سُننے کو مل رہی ہیں۔اُن سب میں مجھے اس دور کی جھلک نظر آتی ہے۔

راسپوٹین کے زار شاہی میں داخل ہونے کے اسباب میں انہی عملیات اورروحانیت کا پر تو نظر آتا ہے۔چار بیٹیوں کے بعد پیدا ہونے والا بیٹا الیکسی ہوموفلیا Homophilia کا مریض ہے۔اس کی بیماری نے ماں باپ کا چین اڑا رکھا ہے۔اس پس منظر میں پوکروسکو کا ایک دیہاتی جس کا بچپن چوریوں اور آوارہ گردیوں میں گزرا۔مختلف خانقاہوں، گرجاؤں، ان کے پادریوں سے مباحثے، مذاکروں اور مناظروں میں اُلٹے سیدھے مخفی علوم پر دسترس سے وہ کچھ ماورائی قوتوں کے حامل انسان کے طور پر مشہور زار شاہی کے ایوانوں میں بچے کے معالج کے طور پر داخل ہوتا ہے۔اس کی سامرانہ اور ساحرانہ کاوشیں بچے کو اس کے درد اور تکلیف سے نجات کا باعث بنتی ہیں۔بس تو وہ دھیرے دھیرے ان کی کمزرویوں کے سبب اہم امور میں داخل ہو گیا تھا۔اس سے ملتی جلتی کیفیت معاف کرنا شاید تمہیں بُرا لگے مگر جب صوبوں کے سربراہ بزدل اور کمزور ہوں اور فہم وفراست سے تھوڑا خالی ہوں۔اشاروں پر چلتے ہوں۔انداز جہاں بانی میں کمزور ہوں تو ایسے میں اِس نوع کے توہمات پروان چڑھتے ہیں۔ایک جیالے اور پرعزم انسان کے ہاں

اِن کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جہاں تک مجھے اِس ملک کے سربراہ کی خصوصیات کا علم ہوا ہے۔ وہ دلیر اور جی دار تو ہے مگر ضدی اور ہٹیلا بھی ہے۔

سسرالی گھرانہ کاروباری بھی ہے اور زمیندار بھی۔ 60 کی دہائی کو میرا سُسر بہت یاد کرتا ہے کہ صنعتی عروج کا زمانہ تھا۔ صنعتوں کو قومیانے اور امن کی مخدوش صورت نے سرمایہ دار کو بھگا دیا۔ آج معیشت کا ڈھانچہ منہ کے بل پڑا ہے۔ چند سال پہلے میرے دیوروں نے روس کے لیے چاول کی سپلائی شروع کی۔ اپنی زمینوں کا چاول۔ روس ہم سب کا ایک طرح اپنا ملک ہے مگر پاکستانی بیوروکریسی نے ہم لوگوں کو زچ کر دیا۔

اب یہ بھی تو حیرت کا مقام ہے کہ کلیدی کرسیوں پر افراد کا انتخاب روحانی اشاروں پر ہوتا ہے۔ اُن کی مسلسل نالائقیاں بھی قابل گرفت نہیں۔ کیونکہ اِسے کرسی پر بٹھائے رکھنے میں کچھ غیبی اشارے ہیں۔

مجھے پندرھویں صدی کے عثمانیہ سلطنت کے بانی سلطان محمد فاتح کا زمانہ یاد آیا ہے۔ قسطنطنیہ یعنی موجودہ استنبول کا محاصرہ جاری ہے۔ مشرقی یورپ کے عیسائی حکمران گرجوں اور چرچوں میں بلند آواز میں سلطان کی ناکامی اور اس کے تباہ ہونے کی دعائیں مانگ رہے ہیں۔

سلطان محمد نے اپنی جنگی حکمت عملی اور تیاریوں کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔ دعا ہے مگر عمل میں ہر ہر پہلو پر نظر ہے۔ شکست اور فتح دونوں صورتوں کی شکل میں حکمت عملیاں بڑی واضح اور منظّم انداز میں ترتیب دی گئیں۔

اِس تناظر میں آج کے پاکستانیوں ،کیا مسلمانوں کا وہی کردار نظر آتا ہے۔ ہندوستان نے کشمیر کے ساتھ جو کرنا تھا وہ کرلیا۔ آپ لکیر کو پیٹ رہے ہیں۔ خالی خولی نعروں سے خود کو طفل تسلیاں دے رہے ہیں۔ حکومت کے ذمہ دار سیٹوں پر بیٹھنے والے

لوگوں کے بچگانہ بیان پڑھ اور سُن کر ہنسی آتی ہے کہ ان لوگوں نے کشمیر کے مظلوموں کی مدد کرنی ہے۔

چٹھی نے مجھے افسردہ اور ملول کر دیا ہے۔انستاسیا پاکستانی انجنیر شاہد کی بے حد پیاری بیوی ہیں۔ پیٹرز برگ کی بہت سی میری یادیں اس سے وابستہ ہیں۔اب ایسے میں مجھے شام کا انقلابی شاعر نزار قبانی کیسے نہ یاد آتا۔آپ بھی ذرا اُسے سُن لیجیے۔

اب اگر آسمانوں نے تمہاری ضمانت نہیں دی
تو اُسے کوسو مت
حالات کو بھی لعن طعن مت کرو
خدا انہیں فتح دیتا ہے جنہیں وہ چاہتا ہے
خدا کوئی ہتھیار گھڑنے والا لوہار تو نہیں
یاد رکھو
ہمارے دشمن ہماری سرحدوں میں رینگ کر نہیں آئے
وہ تو چیونٹیوں کی طرح
ہماری کمزوریوں کے ذریعے آئے ہیں

☆☆☆

میں کاٹھی شہزادی شارلٹ اپنے نہال لنڈے کی عاشق

گذشتہ ڈیڑھ دو سالوں سے ایک تصویر مجھے مسلسل ہانٹ کرتی ہے۔ یہ مجھے ایک ایسی گم گشتہ دنیا میں لے جاتی ہے۔ جواب کہیں میرے خوابوں اور یادوں میں دفن ہے۔ یہ آنکھیں ہی نہیں بھگوتی جذبات کا طوفان بھی اٹھاتی ہے۔کوئی شدت سے یاد آنے لگتا ہے۔ جب بھی یوٹیوب کا بٹن کلک ہوا، سامنے ایک پیارا سا ،معصوم سا، سنجیدہ سا، قدرے پھینی سی ناک والا چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ہلکی آسمانی زمین پر ذرا تیز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا فراک پہنے جس کی باڈی پر چپہ بھر اسی رنگ کی سموکنگ کی کڑھائی اُسے دلکش ہی نہیں کلاسیک بھی بناتی ہے۔سنہری بالوں میں ربن کا بینڈ ہے۔ پاؤں میں سفید جرابیں اور نیلے جوتے ہیں۔ بھلا یہ کون ہے؟ شہزادی شارلیٹ ہے یہ۔موجودہ ملکہ برطانیہ کی پڑپوتی ،شہزادی ڈیانا کی پوتی ، کیٹ اور ولیم کی بیٹی ۔اب کوئی پوچھے کہ میری اس تصویر سے کیا نسبت ہے؟

’’ارے بھئی ہے نا‘‘۔ میں جانتی ہوں آپ نے کہنا ہے لو کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔شاہی خاندان کی بچی کا تم جیسی فقیر فقری سے کیا واسطہ اور تعلق۔ پر جناب ذرا صبر کریں ۔پس منظر میں کہانی ہے ایک ۔سُناتی ہوں آپ کو۔ تو وقت یہی کوئی 1950اور1951 کا ہے۔

مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کی مضافاتی بستیوں سے اٹھ کر آنے والے میرے

گھرانے کی جٹی مٹیار عورتوں کو جو رشتے ناطوں کی گنجل سنگلیوں میں ایک دوسری سے یوں پیوست تھیں کہ پھوپھیاں ممانیاں بھی ہیں اور چچیاں سگی خلائیں بھی اور الا ماشاء اللہ سب کی سب تیز طرّار، جھانسی، کانپور، لکھنو اور دلّی بھائیوں اور شوہروں کی ملازمتوں کے سلسلے میں دیکھے ہوئے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے یہ ڈشکریاں قصّے کہانیوں اور سیر سپاٹوں کی دلدادہ جب لاہور جیسے قدیم اور تاریخی شہر میں آ کر بسیں تو انہوں نے سب سے پہلے سیاہ لیڈی ہملٹن کے برقعے سلوائے۔ اُنہیں اوڑھ اتواروں کو شوہروں اور بچوں کے ساتھ تانگوں میں لدلدا کر تاریخی جگہوں پر جانا اپنا معمول بنالیا۔ کبھی شالامار باغ جا دھمکتیں۔ کبھی دلی دروازے، بھاٹی گیٹ اور رنگ محل کی یاترا کر آتیں۔ ساون کے سہانے اور رم جھم برستے دنوں میں گڑ کے میٹھے اور نمکین پوڑوں اور آموں کی پیٹیوں کے ساتھ مقبرہ نور جہاں اور جہانگیر پر ڈیرہ جماتیں۔ کسی اتوار لاہور اسٹیشن سے چھک چھک کرتی گاڑیوں میں بیٹھ کر شیخوپورہ جا اترتیں وہاں سے ہرن مینار پہنچتیں۔ ساری دیہاڑی سیر سپاٹوں میں گذار کر گھروں میں واپس آ کر اگلے کئی دنوں تک اس شہر کا کانپور، جھانسی اور دلی سے مقابلہ ہوتا۔ پھر کہیں اندر کی گہرائیوں سے ٹھنڈی آہیں نکال کر کہتیں۔

''ہائے دیس کا تو مقابلہ ہی نہیں۔'' ایسی آہیں اور باتیں وہ کبھی اپنے شوہروں کے سامنے نہ کرتیں کہ انہیں لعن طعن کا ڈر ہوتا کہ گھر کے مرد پکے مسلم لیگی تھے کہ جنہوں نے اپنے گاؤں کے 80,80 سال کے بوڑھوں کو اپنی کمروں پر لاد کوسوں کا پینڈا مارا تھا اور پولنگ اسٹیشنوں پر اُن کے پاکستان کے لیئے ووٹ ڈلوائے تھے۔

ان ڈشکریوں کے لیئے اپنے کسی عزیز کی عیادت کے لیئے پانچ چھ کوس پر واقع میو اسپتال پیدل جانا تو کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔

پھر ایک دن ان پینڈو عورتوں نے ایک عجیب سی ایکٹویٹی کی۔ یہ بہار کے دن ہی

تھے ۔ جب انہوں نے چھوٹے بچوں کو بڑے بچوں کی تحویل میں دیا۔چھت پر ہولیں بھوننے اور کھانے کے عمل میں انہیں مصروف کیا اور خود بُرقعے اوڑھ کر کہیں چلی گئیں۔

شام ڈھلے جب میں جو پانچ چھ سال کی بچی تھی نیچے اُتری۔ مجھے محسوس ہوا جیسے گزشتہ سال کی آسمان کے سینے پر دیکھی ہوئی قوس وقزح ہماری انگنائی میں اُتری ہوئی ہے۔ فرش پر ریشمی کپڑوں کا بازار سا بکھرا ہوا تھا۔خوشگوار حیرتوں کے ساتھ میں نے پلکیں جھپکا جھپکا کر انہیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھا۔لمبی لمبی فراکیں، چھوٹے چھوٹے گھگھرے، اُن پر ہاتھ پھیرا۔ یوں لگا جیسے ہاتھ تو کہیں مکھن پر پڑے ہوں۔جیسے کچی ملائی ہواُن کے نیچے۔سرسر کرتے پھسلتے دور تک چلے گئے تھے۔

''یہ ادھر میری طرف کرو۔لو یہ تم نے خریدا تھا۔'' جیسی آوازوں کے ساتھ اس سارے ڈھیر کی بندر بانٹ ہوگئی تو میری چنبیلی کی سی رنگت والی اماں اپنے حصے کا مال اُٹھا کر کمرے میں لے آئی۔شوق واشتیاق کا ایک جہان اپنی آنکھوں میں سموئے میں ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔تب ایک تھیلے میں سے انہوں نے ایک فراک نکالا۔اتنا خوبصورت، نیانکور ،آسمانی زمین پر نیلے چھوٹے چھوٹے پھولوں والا۔ باڈی پر اسی رنگ کی چپہ بھر سموکنگ۔ا ماں نے تھیلے سے سفید جرابوں کا جوڑا نکالا اور ساتھ میں جوتوں کا جوڑا بھی۔

آج سوچتی ہوں وہ فراک وہ جرابیں وہ جُوتے یقیناً کسی شہزادی یا شاہی فانوادے کی کسی بچی کے ہوں گے کہ ستتر سال بعد بھی رائل گھرانہ آج کی شہزادی کو من وعن اسی رنگ ڈھنگ کے کپڑے پہنا رہا ہے۔میری ماں کے دل میں کیا تھا۔اگلے دن اس نے مجھے نہلایا۔ وہی فراک پہنایا۔اُسے دھویا بالکل نہیں۔وہ اچھا زمانہ تھا۔چیزیں بھی خالص تھیں اور لوگوں کے دل بھی خالص تھے۔جرابیں پہنائیں، بوٹ چھوٹے تھے۔امّاں نے

چھری سے پچھلے حصّے کو کاٹ دیا اور پاؤں میں سلیپروں کی طرح پہنا دیا۔ بالوں میں کنگھی کی۔ ٹیڑھی مانگ نکالی۔ پٹیاں بنائیں۔کلپ لگائے اور میرا ماتھا چوم کر بولی۔''میری شہزادی۔'' کالی کلوٹی یہ لڑکی اپنی ماں کی شہزادی ہی تھی نا۔

بس تو یہی وہ دن تھے جب لنڈے سے میرا وہ تعلق اور ربط استوار ہوا جو آنے والے وقتوں میں ہڈیوں اور گوڈوں میں بیٹھا اور جو عشق بنا۔ میٹرک تک تو جو ماں نے پہنایا۔ میں نے پہنا۔ پر کالج جا کر پر پھوٹے۔ مصنوعی جیولری، سچے موتیوں، نایاب و نادر اشیاء اور بہترین کپڑے کی لنڈے کی زیر زمین دوکانیں سبھی میں نے کھوج لیں۔ کالج میں میرے سوئیٹروں انتہائی قیمتی شفون کے ڈوپٹوں اور قیمتی قمیضوں کی دھوم تھی۔

آغاز میں تو کوئی میری قیمتی قمیض یا سوئیٹر کو شانے سے چٹکی میں پکڑ کر''ارے! یہ کہتے ہوئے اُف بھئی کس قدر شاندار ہے۔ کہاں سے لیا ہے؟'' جیسا استفسار کرتا تو میں بڑی سچ پتری بنتے ہوئے آنکھوں میں معنی خیز مسکراہٹ کی چمک بھر کر ابروں اور کویوں کو ٹھمکا لگاتے اور دائیں بازو کو پیچھے کی جانب لمبا سا جُھلا ر دیتے ہوئے ایک خفیہ اشارہ دیتی۔ جسے سمجھ کر مخاطب زور سے ٹھٹھا لگاتا۔

پر پھر میں نے جانا کہ یہ تو کھوتا کھوہ میں ڈالنے والی بات ہے۔ اسی لئے یونیورسٹی کے زمانے میں یورپ کے مختلف ملکوں میں میرے بے شمار چچا ماموں سٹیل ہوگئے تھے۔ جن کی میں بڑی لاڈلی اور دُلاری بھانجی بھتیجی آئے دن ان کی جانب سے تحفے وصول کیا کرتی۔

ڈھاکہ یونیورسٹی قیام کے دوران ایک بار جب میں اخبار خواتین کے لیئے گورنر احسن کی بیگم کو انٹرویو کرنے گئی۔ مسز احسن نے میری قمیض کے کلر کمبی نیشن اور کپڑے کی بے حد تعریف کی تو میں نے شکریہ کہتے ہوئے دل میں کہا۔

''لو بھئی قیمت وصول ہوگئی اس کی تو۔''

یاد آیا تھا۔ ''خدایا'' کس قدر تکرار ہوئی تھی دوکاندار سے۔ میری طرف سے پیش کردہ قیمت پر وہ دیدے گھما کر بھناتے اور مجھے ایک طرح پھٹکارتے ہوئے بولا تھا۔

''بابا معاف کرو۔ بھیجا نہیں چاٹو۔ آگے جاؤ۔ تم کو کچھ معلوم نہیں کپڑے کا۔''

میں بھی اول نمبر کی ڈھیٹ ہڈی تھی۔ بحث کرتے ہوئے دل میں اُسے صلواتیں سناتے ہوئے'' کمبخت سُور کا بچہ۔ تم سے تو زیادہ پہچان ہے مجھے۔ جانتی نہ تو تیری دو دو ٹکے کی باتیں سُنتی۔'' جیسی بحث آج بھی بے اختیار لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

☆☆☆

پیٹرز برگ میں میخائل ویزالیوچ کی کھٹی میٹھی باتیں

پیٹرز برگ کے پیٹر ہاف میں میری میخائل سے ملاقات ہوئی۔ وہ ریلنگ کے ساتھ کھڑا فن لینڈ کے پانیوں کو دیکھتا تھا۔ گورا چٹا، اُونچا لمبا، موٹا تازہ، جس نے بڑی شُستگی سے میرے پاس آ کر مجھ سے میری وطنیت کا سوال کیا تھا۔

حیرت و مُسرت سے میں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے اُسے دیکھا اور اُس کا سوال اُسی کو لوٹا دیا۔

''میں تو رُوسی ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''ارے تو اُردو اتنا خوبصورت بولتے ہو۔ میں تو اندازوں میں ہی اُلجھ رہی تھی۔''

''مجھے تو فارسی اور عربی پر بھی عبور ہے ۔ پنجابی سے بھی تھوڑی آشنائی ہے۔ میرے بُہت سال کراچی میں گذرے۔ مشرق وسطیٰ کے مختلف شہروں میں رہا۔ آج کل دبئی میں ہوں۔ آخری زار فیملی کا قریبی رشتے دار بھی ہوں۔''

یہ میخائل ویزالیوچ تھا۔

بڑی دلچسپ شخصیت تھی۔ چھوٹتے ہی مجھ سے رائے طلب کرنے لگا۔ اُس وقت میں پیٹر ہاف کے تحیرّ اور اُس کے سحر میں گُم تھی۔ اس لئے احمقوں کی طرح بول پڑی۔

''یہ شبستانِ حرم، یہ عشرت گاہیں، ظلم و جبر چیخوں اور کراہوں پر اُٹھائیں اِن کی۔ کیا بولوں؟ کیا نہ بولوں۔''

زبردست قہقہہ گونجا تھا وہاں۔ ''خدا کے لئے اِس خود ساختہ قسم کی مظلومیت کو اتنا

فنٹاسٹک رنگ مت دیکھیئے۔زار کھا پی گئے۔پھولوں کی سیج پر سوئے یا کانٹوں کے بستروں پر۔بات سادہ سی ہے کہ جن پر ظلم کئے اُن کی ہی آل اولادوں کے لئے روزی کا سامان چھوڑ گئے۔اُن کی اپنی نسلیں تو ذبح ہو گئیں،سان پر چڑھ گئیں یا بھاگ بھگا گئیں۔ذرا اندازہ تو لگائیے اِن عشرت کدوں کا جن میں سے بُہت سے میوزیم بنے ہوئے ہیں۔جہاں چپّے چپّے پر موجود اُدھیڑ عُمر، بوڑھی، جوان، دیہاتی،شہری عورتیں اور مرد رزق روٹی کماتے ہیں۔خزانوں میں دھڑا دھڑ روبل جمع ہوتے ہیں۔عقل آ گئی ہے انہیں۔کھول رہے ہیں دُنیا پر اپنے دروازے۔کچھ محل ٹریننگ سینٹرز میں تبدیل ہو گئے ہیں جہاں عام آدمی کے بچے کی کِسی نہ کِسی شعبے میں تربیّت ہوتی ہے کہیں لائبریریاں بن کر علم کے قیمتی اثاثوں کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔اور آپ بھی دل پر ہاتھ رکھ کر کہیئے کہ یہ محل مینارے نہ ہوتے تو آتیں یہاں۔چجھو کے چوبارے کے لئے کون پینڈے مارتا ہے۔وہ تو ماڑا موٹا آپ کا بھی اپنا ہوگا۔‘‘

میں تو سچی بات ہے۔دل کھول کر ہنسی تھی۔یہ رُخ تو مانو جیسے آنکھ اوجھل دماغ اوجھل تھا۔

کوئی ساتھ ہے یا اکیلے،ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اُس نے درمیان سے ہی اُچک لی۔آپ نے بچپن یا نوعمری میں کبھی محبت کی؟ وہ میری طرف متوجہ تھا اور میں اِس عجیب اور بے ہودہ سے سوال پر سٹپٹا سی گئی۔

’’میں جانتا ہوں۔آپ جواب نہیں دیں گی اور دیں گی تو انکار کریں گی۔پاکستانی خواتین کی ذہنیت کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔‘‘

مُجھے غصہ آیا۔عجیب آدمی ہے۔کیسے بے تُکے سوال کرتا اور خود ہی جواب دیئے جا رہا ہے۔

میری اِس گومگو اور عجیب سی کیفیت کو اُس نے یقیناً محسوس کیا تھا۔فوراً وضاحتی بیان شروع کر دیا۔سوال کامُدّ عا تو بس اتنا سا تھا کہ مخاطب آدمی اگر کسی ایسی واردات سے گزرا ہو تو دوسرے کے جذبات سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

پیٹرز برگ میری اولین محبت کا امین شہر ہے۔اسکی قابل ذکر جگہیں،اس کی گلیاں، اس کے محلے،اس کے بازار،کونسی جگہ ایسی ہے جہاں میں اُس کے ساتھ نہیں گھوما تھا۔اُس کا سحر میری یادوں میں ہمیشہ جھلملا تا ہے،اور یہ پیٹر ہاف جس کے چپے چپے پر میری یادیں دفن ہیں۔آج انہیں زندہ کرنے آیا ہوں۔

میں ورونیژ کے ایک گاؤں سے ہوں۔ماسکو سے کوئی دوسومیل دُور کا ایک شہر۔

پیٹرز برگ کی ملٹری اکیڈمی میں پڑھنے کے لئے آیا تھا۔بس تو یہیں یُورال کے پہاڑوں سے اُتر کر آنے والی اُس شہزادی سے میری ملاقات ہوئی۔

''کب کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''پچیس سال ہوتے ہیں۔میں اُس وقت کوئی بیس سال کا تھا۔''

انسان زندگی کے جھمیلوں میں جتنا بھی اُلجھ جائے،جتنی چاہے دولت کما لے،دُنیا گھوم آئے،مگر جب کبھی وقت اُسے اُس جگہ لے آئے تو پھر وہ اُنہی جگہوں پر اپنی نوسٹلجیائی حسیات کو تسکین دینے کے لئے ضرور جاتا ہے۔

میں پیٹرز برگ میں چھ سے آٹھ جون تک منعقد ہونے والے ورلڈ اکنامک فورم رشیا CEO میں شرکت کے لئے آیا ہوں۔وقت نکال کر اُن یادوں سے ملنے کے لئے بھاگا ہوں۔

''شادی وادی نہیں کی تھی اُس سے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تو مر گئی۔بچہ ٹھہر گیا تھا۔اُسے ضائع کروانے لگے۔بس اسی میں کام خراب

ہو گیا۔

کتنی جلدی کہانی ہی ختم کر دی تم نے تو۔ میں نے تاسف سے کہا۔ چند لمحے خاموشی میں گذرے۔

''کمیونسٹ دور کو کِس نظر کِس زاویے سے دیکھتے ہیں؟''

''ذاتی حوالے سے بدترین،قومی حوالے سے بہتر، سچی بات ہے میں نے تو اپنے آبا وٗاجداد کے اُس عرُوج کو نہیں دیکھا تھا۔اُس طرزِ زندگی کو جو میرے پردادوں کی تھی۔ بس صرف سُننے کی حد تک جانتا ہوں۔ورونیژ کے قصبے نواژیو تینے میں میرے آباء کا گھر ''کولاک'' کہلاتا تھا(یعنی بڑے زمیندار کا گھر)۔اب کولاک کی شان وشوکت کا کیا بتاؤں کہ دریا کے اُونچے کنارے پر لائم اور بید مجنوں کے درختوں میں گھرا پختہ محل نما گھر جس کی چھت لوہے کی مضبوط چادروں سے ڈھپنی ہوئی، چوبی بھاری کنڈیوں والے پھاٹک،نقشین کھڑکیاں اورساری آبادی کے وسط میں بنا ہوا یہ گھر ایسے ہی دِکھتا تھا جیسے ٹاٹ کے بھدّے بدرنگے ٹکڑوں میں شوخ رنگا مخمل کا ٹوٹا لگ جائے۔اِس گھر کے مکین چمڑے کے جوتے پہنتے ،ریشمی قمیضوں پر سیاہ واسکٹیں زیب تن کرتے اور پورے علاقے میں من مانیاں کرتے پھرتے۔

اب غریب کِسان کی زندگی ذرا سوچئیے! زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکڑی کے ہلوں سے کاشت کاری، چرخی والے کنوؤں سے آبپاشی ،گھاس پھونس کی چھتوں والے جھونپڑوں میں رہنے، چھال کے جُوتے اور ماڑے موٹے کپڑے پہننے اوررُوکھی سوکھی کھانے پر بسر ہوتی۔انقلاب نے رگڑا دیا۔جو دادا سے لے کر والد تک کو چڑھا۔میرا زمانہ تو پھر بھی سنبھالے کا دور تھا۔یہ تو کہنا پڑے گا کہ پوری قوم انقلاب سے سرشار ملک کی تعمیر نو میں جُت گئی تھی۔ بڑے انقلابی کام ہوئے۔غربت اور جہالت کے اندھیروں سے رُوس

چھلانگ مار کر دُنیا کی دوسری سپر پاور بنی۔

تاہم گھٹن، یکسانیت، زبان پر پابندی، سوچ پر پہرے، بے رنگ شب و روز۔ اُوپر کے لوگوں کے زاروں جیسے ہی اللّے تللّے۔ ایک محنت کش کمیونسٹ یہ سب دیکھتا تھا اور کڑھتا تھا پھر کمیونسٹوں کے جتھے بورژوا گروپوں سے مل گئے اور سسٹم کی کایا کلپ ہوگئی۔

گورباچوف اور اُس کے حواری گلاس نوسٹ (آزادی اظہار و خیال) پرسترائیکا (سیاسی اور اقتصادی بہتری) اور ڈیموکریٹائزیشن کے نعرے لگاتے نئے گھوڑوں کی صورت میدان میں اُتر پڑے۔ اُنہوں نے اپنے رنگوں کی پچکاریاں ماریں۔ اب نئے شہسوار میدان میں ہیں۔

''میخائل جب سوویت ٹوٹا اُس وقت تم کہاں تھے؟ اور تمہارے احساسات کیا تھے؟''

''میں تو ماسکو میں تھا۔ فوجی بغاوت کی ناکامی کے بعد لوگوں کے ساتھ ریڈ سکوائر میں خوشیاں مناتا پھرتا تھا۔ ارے بھئی ٹڈ منگے روٹیاں تے گلاں ساریاں کھوٹیاں۔''

اُس کے پنجابی محاورہ بولنے پر میں تو حیران رہ گئی تھی۔ میری حیرت پر کوئی اظہار کی بجائے اُس نے بات جاری رکھی۔

چودہ ریپبلکیں آپ نے اپنے ساتھ باندھی ہوئی ہیں۔ اب وہ آزاد ہونا چاہتی ہیں۔ بھئی ہونے دو اُنہیں۔ سنٹرل ایشیا پر تقریباً ڈیڑھ صدی اور بالٹک ریاستوں پر کوئی نصف صدی ڈنڈا چلا لیا آپ نے۔ شوق پورے ہو جانے چاہئیں تھے۔ آپ کی اپنی معیشت کا یہ حال کہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لئے فرلانگ لمبی قطاریں۔ ڈبل روٹی مل گئی ہے تو گوشت نہیں۔ آلو ملے تو پنیر نہیں۔

کوئی ازم انسانی پیٹ اور اُس کی ضروریات سے آگے نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی

ازم انسانی پیٹ اور اُس کی ضروریات سے آگے نہیں۔ اُن دنوں ایک لطیفہ بُہت مشہور ہوا تھا۔ میخائل ہنسا آپ بھی سُنیں۔

ماسکو کی ایک خاتون گوشت لینے کے لئے تین گھنٹے سے ایک قطار میں کھڑی تھی۔ اِس سارے وقت میں قطار نے اِنچ برابر آگے حرکت نہ کی۔

خاتون چلّائی۔

''بس بُہت ہوگیا۔ میں گورباچوف کو قتل کرنے جا رہی ہوں۔''

وہ قطار سے نکل کر بگولے کی طرح اُڑتی نظروں سے غائب ہوگئی۔ صرف ایک گھنٹہ بعد واپس آگئی۔

''کیا ہوا؟'' اُس کی ساتھی عورتوں نے پوچھا۔

''تم نے گورباچوف کو قتل کر دیا؟''

''اُس کو قتل کرنے والوں کی قطار بُہت لمبی تھی اور میرے پاس اتنا وقت نہیں۔''

سچی بات ہے میں نے میخائل ویزا لیوچ کی کمپنی سے بُہت لُطف اُٹھایا۔ کچھ جانا۔ کچھ سیکھا۔ وقتِ رُخصت جب اُس نے مصافحہ کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا میں نے برگر کے بند جیسے اس کے ہاتھ کو اپنے سوکھے سڑیل ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''میخائل تمہارا بُہت شکریہ۔ اِسی اجنبی سرزمین پر ایک رُوسی کے منہ سے اُردو سن کر مزہ آیا۔''

☆☆☆

لُٹنا میرا استنبول کے کیپلی کارسی میں

توپ کپی سرائے میوزیم کی آرمینیائی طرزِ تعمیر کی خوبصورتیوں، پچی کاری وتزئین کاری کی ہوش رُبا رنگینیوں سے طلسم زدہ سے باہر آئے تو کسی اور طرف منہ مارنے کی بجائے گرینڈ بازار کا رُخ کیا کہ لیرے ختم تھے اور گرینڈ بازار سے ملحقہ منی چینج آفس کا لڑکا انگریزی سمجھتا تھا۔

سو ڈالر کا نوٹ سوراخ سے اندر گیا۔ پیسے لیے اور ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل آ گئے۔

ادائیگی کیلئے تہہ کیے ہوئے سارے لیرے کھولے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہلکے نیلے رنگ کے ایک نوٹ کو چُھوا ''یہ تو متروک ہو چکا ہے۔''

''ہیں''

میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں، اب میں گُم سُم سی کھڑی تھی۔ ایک سو تیس لیروں کے ساتھ ہاتھ ہو گیا تھا۔ گویا تقریباً پانچ ہزار پاکستانی روپے کو ٹُھک لگ گیا تھا۔ جاپان اور تائیوان کے سیاح میرے قریب ہی کھڑے اس مسئلہ کو خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اُن میں سے کسی نے کہا۔ ''فوراً پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔''

اس استفسار پر کہ پولیس اسٹیشن کہاں ہے؟ تائیوانی نے چھوٹا سا بازو پھیلا کر گلی کے کونے کی طرف یوں اشارہ دیا جیسے پولیس اسٹیشن تو یہیں اِسی کونے میں ہی ڈیرے ڈالے بیٹھا ہے۔

میں اور سیما اب اس نئی مہم پر نکلیں۔ پولیس اسٹیشن میں سناٹا تھا۔ ایک نوجوان کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔

سلام کے جواب میں تپاک تھا۔ پاکستان کا جان کر لہجے میں محبت کا اظہار تھا۔

میں نے مسئلہ گوش گزار کیا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

''کیا وصولی کی کوئی رسید لی تھی۔'' سرنفی میں ہلایا۔

''جگہ پہچانتی ہیں۔آدمی کو شناخت کر لیں گی؟ میرا جواب جوشیلی قسم کی ''ہاں'' میں تھا۔

''گھبرائیے نہیں آپ کے پیسے ضرور آپ کو ملیں گے۔مگر چوں کہ یہ criminal case ہے۔آپ کو کرمینل پولیس اسٹیشن جانا ہوگا۔یہ تو ٹورزم پولیس اسٹیشن ہے۔بیازت یہاں سے زیادہ دور نہیں۔''

اور جب وہ واکی ٹاکی پر غالباً بیازت والوں کو میرے بارے میں بتا رہا تھا میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''ارے میں کون ہوں؟ ٹورسٹ نہیں۔''

اس وقت مجھے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ جیسے میں لاہور کے نولکھا پولیس اسٹیشن میں بیٹھی ہوں اور مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ محترمہ یہ کیس تو رنگ محل پولیس کا ہے۔وہاں جائیے۔

گاڑی کے لیے معذرت ہوئی۔ٹیکسی منگوا دی گئی اور یہ بھی تاکید ہوئی کہ اسے صرف پانچ لیرے دینے ہیں۔اس وقت مجھے پھر اپنی پولیس اس گمان کے ساتھ یاد آئی تھی کہ وہ یقیناً ایک غیر ملکی خاتون کو ٹیکسی میں رولنے کی بجائے گاڑی میں بھیجتی۔

ماشاءاللہ سے ٹیکسی ڈرائیور نے ہیرا پھیری میں پاکستانیوں کو بھی مات کر دیا تھا۔ اللہ جانے کن کن راستوں پر بگٹٹ بھاگا اور میٹر بڑھائے چلا جاتا تھا۔جونہی ایک چوک پر گاڑی رُکی۔ ''تاکسیم Taksim'' پر نظر پڑی۔سیماں نے بے اختیار اپنے گھٹنے پر دو ہتڑ مارا۔

تاکسیم بیاگلو Beyoglu کا مرکزی چوک ہے جہاں سے مختلف جگہوں کو

راستے نکلتے ہیں۔ ہاتھوں میں نقشے پکڑ کر صبح سے شام تک بسوں اور ٹراموں میں خجل خواریوں سے ہمیں شہر کے چہرے مہرے سے خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ میٹر پچیس لیروں کی نشاندہی کر رہا تھا۔

پھر ایک جگہ گاڑی روک کر اُس نے سامنے بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ اس وقت 34 لیرے روز روشن کی طرح میٹر پر جگمگا رہے تھے۔ ہم ٹیکسی سے اُترے۔ پانچ لیرے کا نوٹ میں نے فرنٹ سیٹ پر پھینکا اور جی داری سے کہا۔

''ہم پاکستانی عورتوں کو تم نے کیا اُلو کی پٹھیاں سمجھا ہے۔ ہمیں یہی دینے کو کہا گیا تھا۔''

بعد کے سالوں میں جب میں کہیں پیٹرز برگ میں روسی بوڑھی عورتوں کے ہاتھوں لٹی، جنہوں نے میرا ایک طرح مل کر گھیراؤ کر لیا تھا۔ اُس دن مجھے بے اختیار وہ ترک ڈرائیور یاد آیا تھا۔ شریف تھا بے چارہ۔ اُتر کر ہمیں گاٹے سے پکڑ لیتا تو چونتیس 34 لیرے کیا سو لیرے دے کر جان چُھڑاتے۔

بہر حال میں نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔

سیڑھیاں شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھیں۔ استنبول کا سارا شہر کم بلندی والی ڈھلانی پہاڑیوں پر ایک مربوط اور خوبصورت ترتیبی صورت میں بکھرا ہوا ہے۔

پولیس افسر کے سامنے میری داستانِ امیر حمزہ پھر شروع ہوئی۔ یہ بھی مقام شکر تھا کہ اُس کے پاس انگریزی کا تھوڑا سا دال دلیہ تھا۔ تفتیشی سوالات ہوئے۔ نتیجہ جو سُنایا گیا وہ کچھ یوں تھا کہ چونکہ اب رات کے آٹھ بج رہے ہیں اور آفس بند ہو گیا ہے۔ لہٰذا کل نو بجے تشریف لائیے۔ ہر طرح کی مدد کی جائے گی۔

صبح نو بجے جب مطلوبہ جگہ پہنچی۔ ماشاءاللہ سے سیٹ پر ایک نیا چہرہ بیٹھا تھا۔ دو

نو جوان لڑکے کسی بات پر زور زور سے بول رہے تھے۔ تھانے والا تو ماحول ہی نہیں تھا۔

بیان شروع ہوا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر ممکنہ سوالوں کے جواب بھی اس میں شامل کر دیئے کہ فضول کی تفتیشی تکرار سے جان چھٹے۔

پر جونہی خطابت کے عمل سے فارغ ہو کر میں نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔ میرا جی اپنا سر پیٹ لینے کو چاہا کہ میں اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجا رہی تھی۔ وہ بٹر بٹر میرا منہ دیکھتا تھا۔ ''ہائے وے میریا ربّا'' اس وقت جی تو چاہا کہ یا تو اُسے ایک تگڑی قسم کا جھانپڑ دوں یا پھر ایک زوردار اپنے سر پر ماروں اور میں نے مارا، پر سر پر نہیں پاؤں پر۔ گلے سے نکلتی کرخت آواز نے چھت پھاڑ دی۔

''ہے یہاں کوئی جو میری بات سُنے۔''

فوراً ہی سامنے والے دروازے سے ایک لڑکی بھاگنے کے سے انداز میں میرے سامنے آ کر بہت شُستہ انگریزی میں بولی۔

''بتائیے کیا بات ہے؟''

میری بولتی کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

''اللہ یہ کمبخت اِس حُسنِ جہاں سوز کے ساتھ پولیس اسٹیشن پر کیا کر رہی ہے۔ اسے تو کہیں کسی بغداد کوشک، کسی مجید کوشک میں ہونا چاہیے تھا۔''

لڑکی پھر بولی۔ ''بتائیے کیا مسئلہ ہے؟''

چلیے جناب کہانی پھر دہرا دی گئی۔

اُس نے یوں چٹکی بجائی جیسے انگلیوں کی پوروں میں طلسماتی جن مقید ہو۔

''ابھی یہ پولیس مین آپ کے ساتھ جائے گا اور سارا مسئلہ حل کر آئے گا۔ ذرا بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے پولیس مین کو دیکھا چُوچہ سا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ مجھے گاڑی میں بٹھائے گا اور گاڑی شور مچاتی، ہوٹر بجاتی، ہٹو تر کو! راستہ دو، کا عملی مظاہرہ کرتی گرینڈ بازار میں داخل ہو کر منی چینج آفس کے سامنے رُکے گی۔

''واللہ کس قدر مسرُ ور کُن نظارہ ہو گا۔'' میں نے تصور میں اس منظر سے حظ اُٹھاتے ہوئے آنکھیں نچائیں۔

پر جب بڑا سا پُختہ میدان کراس کرنے کے بعد وہ اگلے ڈھلانی راستے پر اُترنے لگا تو بے اختیار میں رُک گئی۔

''گاڑی کدھر ہے؟'' میں نے ہوا میں ہاتھ لہرائے۔

وہ ہونقوں کی طرح میری صورت دیکھتا تھا۔

استنبول کے سلطان احمت ایریا کی گلیاں تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بازار تھے۔ پھر وہ ایک جگہ آ کر رُک گیا۔ میں خوابیدہ سی گلیوں کو دیکھتی تھی۔ بازار ابھی انگڑائیاں لے رہے تھے۔

گرینڈ بازار۔ اُس نے سامنے بازار کی طرف اشارہ کیا۔

بازار چہرے مہرے سے تو ویسا ہی تھا۔ پر میں نے بھونچکی سی ہو کر اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ نہ وہاں کوئی منی چینج آفس، نہ دوسری سمت خوبصورت مسجد۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ چلو خیر کسی نے رہنمائی کی اور پھر چل پڑے۔

ہو بہو گرینڈ بازار جیسے ایک اور بڑی سی سرنگ نما دروازے کے نمودار ہونے پر بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ پر اب اُس سُن وٹے کی بجائے میں خود بھاگی۔ نورِ عثمانیہ جامع (مسجد) چلاّ چلاّ کر کہا۔ پھر کسی نے اُسے سمجھایا۔

ٹانگیں پھر چلیں۔ اب جس بازار میں داخلہ ہوا۔ تھوڑا سا ہی چلنے کے بعد مجھے

اندازہ ہوگیا کہ ہم صحیح راستے پر ہیں۔اور جائے وقوعہ بس آنے ہی والی ہے۔

میرا قیافہ درست تھا۔ جونہی بازار کا اختتام ہوا۔نور عثمانیہ مسجد اور منی چینج آفس دونوں نظر آ گئے تھے۔ میں نے فوراً اُسے بازو سے تھاما۔اندر لے گئی اور لڑکے کی سمت اشارہ کر دیا اور خود کونے میں بنے چھوٹے سے زینے پر کھڑی ہو کر کاروائی کے جائزے میں مصروف ہوگئی۔

ایک عجیب سی بات مجھے محسوس ہوئی۔لڑکے نے صرف ایک چھلچھلتی نگاہ سے مجھے دیکھا اور چہرہ جُھکا لیا۔

اور جب پولیس مین اُس سے بات کرنے لگا تو وہیں کونے سے ایک اونچا لمبا خوش شکل تیس کے ہیر پھیر میں نوجوان کھڑا ہو کر اُس سے اُلجھنے لگا۔یقیناً وہ آفس کا انچارج ہوگا۔

تھوڑی سی گرما گرمی اور تُو تُو میں میں کے بعد پولیس مین مجھے باہر لے آیا۔ باہر ڈیوٹی دیتے وردی والے سپاہی اکٹھے ہو گئے تھے۔ انہیں وہ مختصراً کچھ بتا کر سامنے والی دوکان سے مترجم لے کر آیا جس نے مجھے بتایا کہ وہ یکسر انکاری ہیں۔

اپنے دفاع میں میں نے دلیل دی کہ میں تین ستمبر کو استنبول میں داخل ہوئی ہوں۔میرے پاس یہ متروک شدہ اتنا بڑا نوٹ کہاں سے آسکتا ہے؟''

یہ بات پولیس مین کو سمجھائی گئی۔ وہ پھر اندر گیا۔ میں بھی ساتھ تھی۔ اب پھر زوردار گفتگو شروع ہوگئی۔ پولیس مین بے چارہ بھیگی بلی اور اُس کا باس بُل ٹیریئر۔

چار بار یہ آنیاں جانیاں ہوئیں۔پھر ہم دونوں باہر آ گئے۔مترجم آیا جس نے مجھے کہا کہ میں پولیس اسٹیشن جا کر تحریری درخواست دوں تا کہ اس پر ایکشن ہو۔

اتنی مشقت بھری خجل خواری کے باوجود میری ہنسی چھوٹ گئی تھی۔ ہونٹوں اور

آنکھوں میں بکھری اس ہنسی میں میں نے بہت دور تک گرینڈ بازار کے نقش ونگار کی شوخیاں دیکھیں اور پھر دونوں ہاتھ مترجم کے سامنے جوڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

’’جناب میں کیس کو ڈراپ کرتی ہوں۔ استنبول پولیس کی شاندار کارکردگی کو سیلوٹ مارتی ہوں۔

☆☆☆

عیسائیوں، یہودیوں اور آرمینیاؤں کے لیے اُن کا کوسموپولیٹن بغداد جانے کہاں گم ہوگیا؟

کاظمین کے ٹیکسی سٹینڈ پر حسبِ وعدہ میرا ٹیکسی ڈرائیو منتظر تھا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے منتدرل الزیدی Muntader-al-zaidi کی بش پر جُوتا پھینکنے والی شہرہ آفاق نظم کو پھر سُننے کی خواہش کی۔

افلاق ہنسا۔

''بس اسے ہی سنتے جانا ہے۔نہیں آج آپ نئی چیزیں سُنیں گی۔''

پھر گاڑی میں ایک دلکش آواز گونجی تھی۔کیا آواز تھی اور کیا گیت تھا؟

معلوم ہوا تھا کہ یہ Give me love کے Songs of the Broken hearted Baghdad سیریز کا ایک گیت ہے اور گلوکار رسید عبود ہے افلاق نے عربی میں گاتے ہوئے اُس کا تھوڑا سا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔

گانے سنتے ،جگہوں اور عمارتوں کے بارے میں باتیں کرتے کہیں چھوٹی، کہیں بڑی سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتے ،اردگرد دیکھتے نیشنل پارلیمنٹ ہاؤس کی عمارت نظر آئی تھی۔

عراقی گورننگ کونسل کے بارے میں جانکاری چاہ رہی تھی کہ سارے دلّے اور بھڑوے ہی ہیں یا کوئی کام کا دانہ بھی ہے۔

افلاق ہنسا تھا۔کام کا دانہ کیسے چلے گا؟ضمیر فروشوں اور بے غیرتوں کے ٹولوں میں۔ہمارا وہ شہرہ آفاق شاعر سعدی یُوسف سچا اور پکا انقلابی سوشلسٹ نظریات کا حامل

گذشتہ آمر کے دور میں بھی باہر تھا اور اب جب وہ ہمارے سکے سو دھرے (خیر خواہ ہمدرد) ہمیں اُس ظالم سے نجات دلانے ہوا کے گھوڑوں پر تیرتے ہماری زمین پر آ گئے ہیں۔سعدی یوسف اپنے وطن، اپنے گھر نہیں آ سکتا کہ اُس کا نام ناپسندیدہ لوگوں کی فہرست میں پھر سے شامل ہو گیا ہے۔بصرہ اُس کا آبائی شہر ہے اور وہ زمانوں سے پیاسا پھر رہا ہے۔پہلے صدام سے خائف تھا،اب ہمارے اِن نئے نجات دہندوں نے اُسے بین کر دیا ہے۔

اپنے گہرے دوست مظفر النواب کو خود پر عائد پابندی بارے بذریعہ نظم اطلاع دیتے ہوئے سعدی یوسف نے لکھا تھا۔

’’ان کی فہرستیں، میں تھوکتا ہوں اُن پر۔میں اُنہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اہل عراق جو اس سرزمین کی تاریخ کے وارث ہیں۔ہمیں اپنی بانس کی معمولی سی چھت پر بھی بڑا فخر ہے۔‘‘

عراقی میوزیم نے بہت وقت لے لیا تھا۔کچھ اور دیکھنے کی متمنی تھی کہ وقت بھی تو تھوڑا ہے۔جب میں نے اس کا اظہار کیا افلاق ایک اچھے بیٹے کی طرح بولا۔

’’آرام۔تھوڑا سا آرام۔تھکن آپ کے چہرے سے دُھواں دھار قسم کی بارش کی طرح برس رہی ہے۔موسم بھی اسوقت انتہا پر ہے۔میں چھ بجے آپ کو پک کروں گا۔‘‘

اُس نے مجھے 14 رمضان مسجد تحریر سکوائر میں اُتارا۔صد شکر کہ مشرق وسطیٰ میں مسجدوں میں عورتوں کا حصّہ بھی ہے۔یہاں خوبصورت قالین بچھے تھے۔خوشگوار اور لطیف سی ٹھنڈک کا رچاؤ فضا میں گھلا ہوا تھا۔

تھوڑا آرام کسری نماز سے فارغ ہو کر باہر آ گئی تھی۔ٹریفک میں تیزی اور لوگوں کے ہجوم بڑھ رہے تھے۔

’’چلو اچھا ہے میں ادھر ادھر گھومتی ہوں۔‘‘

ایک چھوٹے سے ریسٹورنٹ کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔قہوے اور حمس کا آرڈر کرنے کے بعد اردگرد کی رونقیں دیکھنے لگی جب دو اُدھیڑ عمر اور ایک نوجوان لڑکی وہاں آ کر بیٹھیں۔دونوں عورتیں سرخ و سفید، صحت مند جنکے غیر معمولی بھاری سینے اور کولہے عباؤں سے بھی چھلکے پڑتے تھے۔نوجوان لڑکی نے سکارف اور کھلے بازوؤں والی لمبی سی قمیض نما میکسی پہن رکھی تھی۔سینوں پر لہراتی بل کھاتی صلیبی زنجیروں نے مجھے بتا دیا تھا۔میں خوشدلی سے ان کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔جواباً انہوں نے بھی محبت بھری مسکراہٹ بکھیری۔حوصلہ پا کر میں ان کی ٹیبل پر گئی اور تعارف کے مراحل طے ہوئے۔

ڈیلی کریم اور جوزفین سیاب جن کے آبا و اجداد کوئی 1604 کے لگ بھگ ایران سے یہاں آئے تھے۔ڈیلی کریم شمالی عراق کے شہر موصل سے تھی یوں دونوں کی پیدائش اور بچپن جوانی سب بغداد سے منسلک تھے۔ڈیلی کی شادی موصل میں ہوئی۔اور وہ ابھی بھی وہیں تھی جبکہ جوزفین 1998 کے بعد سویڈن چلی گئی۔کوئی نو دس سال بعد وہ بغداد آئی تھی۔دونوں سہیلیاں بغداد کے نوسٹلجیا میں مبتلا تھیں۔انہیں اپنے بچپن کا وہ بغداد نہیں بھولتا تھا۔اُنکی یادوں میں بسا وہ شہر جو کوسموپولیٹین تھا۔جو بڑا ماڈرن اور ملٹی کلچرل تھا، جس میں رواداری اور برداشت کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔مختلف مذاہب کی رنگا رنگی جس کا حسن تھا۔دُکھ تھا۔کرب کا واضح اظہار تھا جوزفین سیاب کے لہجے میں۔آنکھوں میں اُتری نمی بھی بہت کچھ کہتی تھی۔

ہمارے آبائی گھر یہیں اِس پرانے بغداد کی اِسی شاہراہ رشید کی اطرافی گلیوں میں تھے۔ہماری عیدیں، رمضان، کرسمس، گڈ فرائی ڈے سبھی مشترکہ تھے۔یہیں ہماری یہودی خالہ رہتی تھی جو بعد میں بغداد کے جنوبی حصّے میں بنے جیوش کوارٹر میں چلی گئی تھی۔

میری ماں کی جگری سہیلی جسے ملنے کیلئے جانے کا ہمیں کتنا ارمان اور جنون رہتا تھا۔ جب کبھی ان کے ہاں جانے کا پروگرام بنتا ہم بہنیں اُچھل اُچھل کر ایک دوسرے سے کہتیں۔

''سوق حنونی (حنونی بازار) میں پھریں گے۔ ہائے فوابینز(Fawa Beans) بھی کھائیں گے۔''

میری چھوٹی بہن زبان تالو سے لگاتے ٹخ ٹخ کی آواز نکالتے ہوئے مستی میں آنکھیں نچاتی۔ ''کتنا مزہ آئے گا۔''

بلند و بالا خوبصورت بالکونیوں والے گھروں کی گلیوں میں غریب عراقی عورتیں Fawa Beans بیچا کرتی تھیں۔ اُسے چولہوں پر دھرے بڑے بڑے پتیلوں میں پکی فوابین کھانا کتنا پسند تھا؟ جوزفین تو ہمیشہ اُوپر سادہ دہی ڈلواتی پر نینی کو Dibis (کھجوروں کی چٹنی) ڈلوانا مزہ دیتا تھا۔

''میرے اُس بغداد کو نظر لگ گئی ہے۔'' نمی موتیوں کی صورت نچلی پلکوں میں ٹھہر گئی تھی۔

میرے اندر سے ہوک سی اٹھی تھی ہائے میرا لاہور اور کراچی بھی پچاس، ساٹھ ستر 70 کی دہائی میں ایسے ہی تھے۔ میرا کراچی تو عروس البلاد تھا جس کی راتیں جوان رہتی تھیں۔ میرے لاہور کا کیا کہنا تھا۔ مارڈالا ہمیں فوجیوں، سیاستدانوں کے مفادات اور ملاؤں کی انتہا پسندی نے۔ کچھ ایسا ہی رونا یہ ڈیلی رو رہی تھی۔

خلیجی جنگ میں بھی بہت نشانہ بنے۔ عراق پر امریکی حملے سے ہماری کیمونٹی بہت متاثر ہوئی۔ صدام کے بارے میں بات ہوئی تو کہنے لگی'' ہماری کیمونٹی کو اُس کے زمانے میں بہت سہولتیں حاصل تھیں۔ بہت آزادی تھی ہمیں۔ صدام جانتا تھا ہم امن پسند لوگ

ہیں۔''

کیتھولک عیسائیوں اور آرتھوڈوکس آرمینیاؤں کی عراقی کلچر ولٹریچر اور موسیقی میں بڑی خدمات ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہماری جوانی میں ہی جیوش کواٹر ویران ہوگیا تھا کہ ہمارے سب ملنے والے یہودی اپنی جائیدادیں بیچ باچ کر اسرائیل چلے گئے مگر ہم عیسائی کہاں جاتے؟

ڈیلی کریم کی آنکھیں گیلی سی ہوگئی تھیں۔

''موصل میں ہمارا ٹورزم کا بڑا بزنس تھا۔ نینوا میں میرے سسرال کے عالیشان ہوٹل تھے جو تباہ و برباد ہوگئے۔ اب انہیں بیچنا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ موصل میں عیسائی کیمونٹی خاصی تعداد میں تھی جو اب بہت تھوڑی رہ گئی ہے جن میں ہمارے جیسے عراق کی محبت میں لتھڑے لوگ ہیں۔

یہ کیسا اندھا تعصب پھیل گیا ہے کہ جسنے اُن ساری حسین روایات کو نگل لیا ہے؟ چرچوں کے خلاف نفرت بھڑکائی جارہی ہے۔ موصل میں دو بڑے چرچ نشانہ بنائے گئے۔ گذشتہ ماہ رمضان میں ایک ہینڈ بل چرچوں میں پھینکا گیا کہ جسمیں عیسائی کیمونٹی کو اپنے گہنگار سروں کو ڈھانپنے کیلئے کہا گیا وگرنہ دوسری صورت میں موت کا سامنا کرنے کی دھمکی تھی۔ یہ دھمکی القاعدہ یا زرقاوی کی طرف سے نہیں تھی بلکہ مسلم عراقی سٹوڈنس موصل کی جانب سے دی گئی تھی۔

خوبصورت لڑکی ملّی پہلی بار گفتگو میں شامل ہوئی۔

''فرانس میں جن دنوں حجاب کا مسئلہ حکومتی سطح پر زیر بحث تھا۔ اُن دنوں زیادہ شدت تھی۔ سوچنے کی بات ہے کہ وہاں موت کی دھمکیاں تو نہیں دی جارہی تھیں۔

میں نے لمبی سانس بھرتے ہوئے اُن تینوں کو دیکھا اور کہا تھا۔ ''میرے ملک کو

بھی کسی کی نظر کھا گئی۔ہم تو خود اسی ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔''

مغرب کی اذانیں گونجنے لگیں۔بتیوں کی پھیلتی جگمگاہٹوں میں منظروں کی دل ربا عی بڑی اپنایت لیئے ہوئے تھی۔لاہور کی مال روڈ کے منظر رقص کرنے لگے تھے۔

میں نے ڈیلی اور اُس کی عزیزہ جوزی سے اجازت لی۔مسجد آئی۔مغرب کی نماز پڑھی۔باہر نکلی افلاق انتظار میں تھا۔

☆☆☆

سچ بتائیے کبھی کبھی شوہر کو پھینٹی لگانے کو جی چاہتا ہے نا۔

اللہ مجھے معاف کرے۔ میری بتیسی اونچے ٹبوں پر اُگی کپاس کے پھولوں کی مانند کھلی پڑ رہی ہے۔ مارے خوشی کے دل میں لڈو سے پھوٹ پڑے ہیں۔ بھئی کیا کروں خبر ہی ایسی ہے کہ دل شاد ہو گیا ہے۔ ارے ایک میرا تھوڑی، یقین جانیں ہر اُس بی بی کا جو ریت روایت اور رواج کی گھمن گھیریوں میں پھنسی، کہیں اولاد کی زنجیروں میں جکڑی اور کہیں رشتوں کی لڑیوں میں پروئی اس گھریلو زندگی میں ہونے والی لعن طعن اور مار پیٹ قسم کی صورت کا سامنا کرتی ہے اور سچ تو یہ ہے کیسے اور کن جذبات سے کرتی ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چُھپی بات نہیں۔ آپ اِس اتنی لمبی تمہید سے اکتا تو نہیں گئے ہیں۔ تو لیجئیے پہلے خبر پڑھیے۔

ایک بیچارے ستم رسیدہ مصری شوہر نے اپنی بیوی کے خلاف اس کی مبینہ زیادتی پر ایک مقدمہ درج کروایا ہے جس کی بڑی دھوم مچی ہے۔

مصری شوہر نے کہا ہے کہ اُس کی بیوی اُسے اکثر زدوکوب کرتی ہے۔ اُسے اِس تشدد کی بنا پر ماضی میں کئی بار چوٹیں بھی آئی ہیں۔ دراصل گھریلو اختلاف کی وجہ سے جب بھی تلخ کلامی ہوئی اور اس نے شدت پکڑی، بیوی گھونسوں، مکّوں اور جوتوں سے مرمت کر دیتی ہے۔ اب میرے پیارے ہم سب قارئین میرے ہونٹوں سے اگر بے اختیار ہی ''شاباشے شیر دی اے بچیئے ٹھنڈ پادتی اے کالجے وچ۔'' (شیر کی بچی نے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔)

ابھی تھوڑی دیر قبل سیما پیروز سے اسی خبر پر بات ہوئی۔ ہنستے ہوئے بولی ۔ میں نے تو میاں کو بھی پڑھائی تھی اور ساتھ میں تبصرہ بھی کیا تھا۔ بات ہوئی نا۔ ہم جیسی پڑھی لکھی عورتوں کو ایک زوردار گونج کے ساتھ چپ کروا دیا جاتا ہے۔ سراسر غلطی صاحب بہادر کی ہی ہو مگر مردانہ انا کا شملہ سدا اونچا رہنا چاہیے۔ اُس کی کسی بات کی ہیٹی ہو یہ ہرگز ہرگز گوارا نہیں۔ تابعدار اولاد کا بھی زور ماں پر ہی چلتا ہے۔ دفع کریں امی آپ بس چپ ہو جایا کریں۔ اور شومئی قسمت سے اگر کہیں خاتون خانہ بھی بھڑک اٹھی تو پھر معاملہ ہلدی چونے والا ہی ہوتا ہے۔

یہاں مصری اور پاکستانی مرد کے حوالے سے تصویر کا ایک اور رُخ بھی مجھے یاد آ رہا ہے۔ ذرا اسے بھی سُن لیجیئے۔ میرے محلے کے ایک بے حد شریف النفس پی ایچ ڈی ڈاکٹر جو بہت سال سعودیہ رہے۔ وہاں سے ایک مصری خاتون بیاہ کر لائے۔ خاتون بہت ملنسار اور محبت والی تھیں۔ ایک دفعہ جب میں مصر جا رہی تھی خاتون نے اپنی چھوٹی بہن بوسیما تلبہ جو قاہرہ جدید میں رہتی تھی، کے لیے ایک پیکٹ میرے ہاتھ بھیجا۔ اب جب دو گھنٹے کی خجل خواری کے بعد اُن کے چھوٹے سے فلیٹ میں پہنچی اور باتیں واتیں شروع ہوئیں۔ خاتون نے پاکستانی شوہروں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔ بدذات مصری شوہروں کے اُس نے لتّے لیے۔ اُن کے ظلم وستم کے افسانے سنائے۔ دراصل وہ خود طلاق یافتہ تھی۔ ایک بیٹی کے ساتھ کسمپرسی کی سی زندگی گزار رہی تھی۔ یہ قصیدہ گوئی بند ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بوسیما تلبہ بس بھئی بس میرے صبر کو اتنا نہ آزماؤ۔ ہماری زبان کی ایک کہاوت ہے۔

''اسپغول تے کُجھ نہ پھول۔'' بس ڈھکی رہیں۔ مقدر سے آپ کی بہن کو اچھا شوہر مل گیا ہے تو یہ اُن کی خوش نصیبی ہے۔ وگرنہ اگر میں پھٹ پڑی تو پھر سب کچھ پھیتی پھیتی ہو جائے گا۔

ایک اور بڑا مزے کا واقعہ سُن لیں۔ ہماری دوست کی بیٹی کی موٹی تازی خادمہ آئے دن نیلوں نیل ہوئی رہتی۔ اپنی مالکن سے جھڑکیاں بھی کھاتی ،لعن طعن بھرے طعنے بھی سُنتی کہ لعنت ہے تم پر۔ ڈوب مرو کہیں جا کر۔ کمبخت ڈھائی پسلی کا وہ نشئی ،شرابی تم سے سنبھالا نہیں جاتا۔ سارا سارا دن تیرے میرے گھروں میں جوتے چٹخاتی اور کولہو کا بیل بنی پھرتی ہو۔ جو کماتی ہو وہ اجاڑ دیتا ہے۔ کمبخت ایک بار ہلدی چونا لگوانے والا کر دو۔ سدا سکھی ہو جاؤ گی۔ بات خانے میں بیٹھ گئی۔ بس تو ایک دن جب مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا ہی تھا ۔اُس نے کلاوے میں بھر کر زمین پر وہ پٹخنیاں دیں کہ درد بھری چیخوں کے ساتھ جو آوازیں سنائی دیں وہ بس معافی کی ہی تھیں۔ وہ دن اور آج کا دن سکھی ہو گئی۔

واقعی نسخہ تو بڑا ہی کام کا نکلا۔ ویسے آپ سے کیا پردہ۔ دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ متوسط گھرانوں کی جب ایک پڑھی لکھی عورت گھر کی معیشت کی گاڑی کے چلوا گلے نہ سہی پچھلے پہیے بنی سربراہ کے ساتھ شانہ بشانہ اس گاڑی کو چلانے میں اسی کی طرح کولہو کا بیل بنی ایسی صورت کا سامنا کرتی ہے کہ جب خیر سے یہ اللہ کی اعلیٰ اور افضل مخلوق کِسی چھوٹی سی بات پر ہنگامہ کھڑا کر لیتی ہے۔ زبان کے تیروں سے چھلنی کرنے کے ساتھ کبھی کبھی ہاتھ کے کرتب بھی دکھانے پر اتر آتی ہے۔ تب ایک حسرت بھرا لاؤ تو اندر ضرور بھڑک کر صدا لگاتا ہے کہ آئے ہائے نہ سیکھا، نہ سیکھا یہ جوڑے کراٹے۔ جو کہیں آتا ہوتا تو بس لمحوں میں ہی صاحب بہادر کے اِس تماشا برپا کرنے کے شوق کا تیا پانچہ کر دیتا۔ بیچاری کمزور ناتواں مخلوق آنسوؤں کے کھارے پانیوں میں چہرے کو نہلاتے ہوئے تصور میں ہی اِس فرضی صورت کے حسین انجام سے لُطف اندوز ہونے لگتی ہے۔

اب ایک اور دلچسپ سا بڑا ہی ذاتی قصہ سُن لیجیئے۔ میاں کی ممانی گذشتہ سال فوت ہوئیں۔ چند دنوں بعد فرمانے لگے ،بھئی بڑی ہی جنتی بی بی تھی۔ ہمیشہ شوہر سے کہتی تھیں خدا کرے میرا مرنا آپ کے ہاتھوں میں ہو۔ اب ایک بار سُنا۔ دو بار سُنا۔ تیسری بار

بھی رقت آمیز لہجے میں یہ گوہر افشانی سُن لی۔ چوتھی بار جب بولنے لگے میری کمبخت زبان خاموشی اور مصلحت کی پٹڑی سے ایک گڑگڑاہٹ سے نیچے لڑھک پڑی اور گونجنے لگی۔

''صاحب اگر آپ یہ سب مجھے اس لیے سُنانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں بھی اُن نیک بی بی کی طرح کسی ایسی ہی خواہش کا اظہار کروں تو اطمینان رکھیے کہ مجھے ایسا کوئی ارمان اور چاہت نہیں۔

کسی نہ کسی نے تو پہلے جانا ہی ہے یہ آپ بھی ہو سکتے ہیں اور یہ میں بھی ہو سکتی ہوں۔

☆☆☆

درویشوں کا ڈیرہ

ڈاکٹر خالد سہیل سے ہلکی پُھلکی شناسائی ان کے مضامین کے حوالے سے ہی تھی۔ یہ امیر حسین جعفری تھے۔اردو ادب کے مایہ ناز شاعر اختر حسین جعفری کے منفرد شاعر اور دانش ور بیٹے جنہوں نے کینیڈا میں اُن کی قربت میں بارہ تیرہ سال کا عرصہ گزارا۔ پاکستان آئے اور ہمارا اُن سے مکمل غائبانہ تعارف کروایا۔کہیں اُن کے ایک خواب کا بھی ذکر ہوا تو پہلی مبارک باد ڈاکٹر خالد سہیل کو۔آپ کوئی خواب عرصہ دراز سے بنتے چلے آرہے ہیں،تو اس خواب کا پورا ہونا بھی تو خوش قسمتی ہے۔میں سمجھتی ہوں یہ ایک ہشت جہت شخصیت والے انسان جو ایک مسیحا ہے، ماہر نفسیات ہے،علم و ادب کا شناور ہے،مفکر اور دانش ور ہے نے ذہین، جذبات سے بھری ہوئی، حساس اور خوبصورت ادب تخلیق کرنے والی لڑکی کے روحانی ملاپ کی آمیزش سے ایک ایسا تجربہ کیا ہے جس نے ترک ناول نگار ایلف شفق کی The Forty rules of love کی طرح ادب میں ایک نئی طرحدار اور منفرد روایت کو جنم دے کر اِس تخلیقی کاوش کو خانوں میں بانٹ دیا ہے۔آپ اِسے وکھری ٹائپ کا ناول کہہ لیں۔افسانوی مجموعہ سمجھ لیں۔یہ جگ بیتی ہوسکتی ہے۔آپ بیتی کا نام دے سکتے ہیں۔

آپ کا جی چاہے سفرنامے کا نام دے لیں کہ یہاں سات سمندر پار سے لیکر ماضی کی گھپاؤں میں جانے کے راستے اور پگ ڈنڈیاں ہیں جن پر چلتے ہوئے آپ کہیں دانشوروں کو سُنتے ہیں۔آپ پر جہانوں کی حکمت کے راز افشا ہوتے ہیں۔کتاب بھری پڑی

ہے مگر ایک آدھ مثال پڑھ لیجیے۔درویش رابعہ کے ایک سوال پر کہ انسان کی بڑائی اوراس کی عاجزی کا کیا رشتہ ہے، کہتا ہے۔علم میں غروراور تخلیقی صلاحیتوں میں نرگسیت ہے۔اسی لیے بہت سے عالم مغرور ہو جاتے ہیں اور بہت سے فنکار خود پرست۔اس کے خیال میں فن کی ریاضت کے ساتھ ساتھ من کی ریاضت بہت ضروری ہے کہ یہ بندے میں عاجزی ،انکساری اور بڑائی پیدا کرتی ہے۔درویش کے مطابق دانائی کے راز جاننے کے تین راستے ہیں۔ پہلا وجدان، دوسرا جمالیات اور تیسرا منطق۔ پہلا سنت صوفیوں اور سادھوں کا راستہ،دوسرا شاعراور فنکاروں اور تیسرا سائنس دانوں کا۔درویش،شاعراور فنکار کو بھی معیار کی حد بندیوں میں قید کرنا ہے۔چھوٹا فنکار چھوٹا انسان، بڑا فنکار چھوٹا انسان، چھوٹا فنکار بڑا انسان، بڑا فنکار بڑاانسان۔

کتاب پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسے دونوں کی شخصیتوں کی پرتیں کھلتی ہیں۔دھیرے دھیرے ،دھیمے دھیمے ،کہیں بچپن ،کہیں جوانی،کہیں طالب علمی اور کہیں حال۔اس سفر میں ان کے اندر دبی ہوئی بہت سی نا آسودہ آرزوئیں ،خواہشیں ، جذبات و احساسات کے طوفان،سوچوں کی گھمن گھیریاں اور مشکلات قاری سبھوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ایسے میں رابعہ کا برگزیدہ لوگوں کی طرف جانا اور روحانی تجربات سے مستفیذ ہونا جب کہ درویش کا مختلف کرداروں کے روپ دھار کر ان کے تجربات سے آپ کے علم میں اضافہ کرنے کی کاوش ہے۔

مکالمہ سوال اس سارے تخلیقی عمل کی جان ہیں۔جس کے سہارے وہ ایک دوسرے کے دل کی گہرائیوں تک اُترتے ہیں۔دانائی اور حکمت کے موتی ذہن کی بند سیپوں میں پلتے ہیں اور باہر آتے ہیں۔زندگی کا سچ کڑی حقیقتوں کی صورت عیاں ہوتا ہے۔ درویش دن کے طلوع ہونے اور رات کے نمودار ہونے جیسے سچ کا اظہار کرتا ہوا گویا کہتا ہے

چالیس سال کے بعد نئے تجربات نہیں ہوتے۔ پرانوں کی تکرار ہوتی ہے۔ درویش کا خیال ہے کہ شاعر، ادیب اور فنکار کی بقا اور اس کی نئی زندگی کے لیے، نئے تجربات بہت ضروری ہیں۔ اس کے خیال میں رابعہ سے ملاقات اور یہ سلسلہ بھی ایک نیا تخلیقی تجربہ ہے۔

ایک نئے تجربے کا یہ انوکھا سا خیال واحساس شاید کہیں درویش کے لاشعور میں تھا۔ جسے اُس نے ایک آدھ بار کچھ عملی صورت دینے کی کوشش بھی کی۔ مگر تخلیق کار کی تشفی نہ ہوئی۔ لُطف نہ آیا، سیرابی نہ ہوئی۔ دراصل درویش کو اپنے بچپن میں اپنے صوفی والد کی لائبریری سے تذکرۃ الاولیا پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اِس دیومالائی ہستی رابعہ بصری کی شخصیت اور فلسفہ حیات نے اُسے اتنا متاثر کیا کہ درویش اس کے سحر میں مبتلا ہو گیا۔

رابعہ مثبت سوچ وفکر والی وہ لڑکی ہے جو اکثر و بیشتر چیزوں کے روشن پہلو دیکھتی ہے۔ شر سے خیر کا پہلو کشید کرتی ہے۔ نامساعد حالات کے جبر اور گھٹن کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکتے ہوئے اپنی ایک تصوراتی دنیا بساتی ہے۔ جب بھی وہ گھٹن کا شکار ہوتی ہے وہ اپنی اُس جنت میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے بھی کبھی یہ خیال تھا کہ میں کسی سے اتنا بھرپور تخلیقی مکالمہ کروں گی۔ ایک ایسے شخص سے جو لکیر کا فقیر نہیں ہوگا، نہ ہی مصلحت پسند ہوگا۔ اس کے اپنے نظریات وافکار ہوں گے۔ اور یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ رابعہ نام جو ہمیشہ درویش کو ہونٹ کرتا تھا۔ اسی نام کی لڑکی سے اس کی ملاقات ہوگئی۔ سچی بات ہے وہ جو کہتے ہیں کہ ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں۔ اُسے یہ نئی دنیا مل گئی۔

اُسے رابعہ الربا کی قربت میسر آ گئی۔ اور وہ جو زمانوں سے زندگی، موت، حیات، محبت، نفرت، دوستی ودشمنی، مرد، عورت کے تعلقات جنس اور دیگر حیاتی رازوں کو جنس مخالف سے مکالمہ کر کے آگہی حاصل کرنے کا خواہش مند تھا۔ اپنے اِس تجربے میں کامیاب ہوا۔ بھلا اب وہ کیسے نہ کہے کہ مجھے لگتا ہے جیسے اِس سلسلے نے ایک خوبصورت پینٹنگ کی

صورت اختیار کر لی ہے۔ایسی پینٹنگ جس میں اُسے قوس وقزح کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔

قاری درویش کی سوچ سے اتفاق کرتا ہے کہ اس میں کہیں مکالمے کا رنگ ہے، کہیں وہ سائنس دانوں کی تھیوریوں سے آشنا ہوتا ہے، کہیں ادب کے ذائقے چکھتا ہے، کہیں زندگی کے تجربات سے لبالب بھرے واقعات اور مشاہدات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔اس کے مطابق ان رنگوں میں سب سے گہرا اور پائیدار رنگ دوستی کا ہے۔یہ رنگ جو بقیہ سب رنگوں پر غالب آتا جا رہا ہے کیونکہ یہ دوستی، خلوص، اپنائیت، عزت واحترام، محبت کے جذبات سے لدی پھندی ہے۔اِس عمل میں جو اہم بات نظر آتی ہے وہ سیکھنے اور سکھانے کا عمل ہے۔

آپ دونوں کا بہت شکریہ۔آپ نے اپنے قاری کو خوبصورت تحفہ دیا اور اُسے مالا مال کیا۔

☆☆☆

سندر بن کے جنگلات، عید اور میں

یہ دسمبر 1969 کا رمضان ہے۔ڈھاکہ یونیورسٹی بند ہے۔رقیہ ہال میں بشمول میرے خال خال لڑکیاں رہ گئی ہیں۔کچن کی بوڑھی دادیوں کو میری سحری افطاری کا بڑا فکر رہتا ہے۔اُنہیں میری عید کی بڑی فکر ہے۔یہ جاننے پر کہ میں عید منانے اپنی دوست کے ساتھ باریسال سے بیس میل دور صاحب رائے گاؤں جارہی ہوں اُن کے چہروں پر طمانیت بھری مسکراہٹ پھیل گئی ہے۔یہ ممتا سے بھری بوڑھیاں جنہیں بنگالی، بہاری، پنجابی کی سیاست سے کچھ سروکار نہیں۔بس محبت میں لُتھڑی انسانیت کے ماتھے کا جھومر کیسے اس وقت بے طرح یاد آرہی ہیں۔

اس بوڑھے ڈرل ماسٹر کی یاد نے بھی آنکھیں بھگودی ہیں۔عصر سے افطاری تک آڈیٹوریم کے چکنے فرش پر میری دھواں دھار قسم کی اسکیٹنگ اُسے مضطرب کیے رکھتی۔''بس کرو۔روزہ ہے تمہارا اور ہاں عید کرنے گھر جاؤ گی۔''نہیں تو۔اپنے گھر ہی تو عیدیں کرتے کرتے اتنی بڑی ہوئی ہوں۔اس بار تو پوربو دیس میں عید ہوگی۔''میری بات پر وہ کھل اٹھتا ہے۔لفٹ مین نورالزماں، گیٹ کے دربان نومی اور مونو، دھوبی، موچی جن سب سے میری محبتیں تھیں۔میری پوربو پاکستان میں عید منانے کو مسرت بھرے جذبوں سے سراہ رہے ہیں۔شوق وارفتگی کے جذبات میرے بھی انگ انگ سے پھوٹ رہے ہیں۔

ساری رات راکٹ کا سفر کچھ سوتے کچھ جاگتے میں گزارنا بھی زندگی کا ایک حسین تجربہ تھا۔ صبح اپنے تمام تر حُسن کے ساتھ پدما کی لہروں پر اتر آئی تھی۔ اونچے اونچے مٹیالے بادبانوں کی کشتیاں سُبک روی سے تیر رہی تھیں۔ نواحی علاقوں کے ماہی گیر چلتی کشتیوں میں کھڑے وزنی جالوں کو پورے زور سے پانی میں پھینک رہے تھے۔ یہ بھاٹیا مارا گھاٹ کا نواحی علاقہ تھا۔ دریا کا دہانہ کہیں کم اور کہیں زیادہ چوڑا تھا۔ چند عورتیں راکھ سے برتن مانجھ رہی تھیں، ہری، پیلی، سرخ ساڑھیوں والی۔ کچھ ایک طرف غسل کر رہی تھیں، کہیں کہیں اِکاذُکا مرد لوگ بھی نہاتے نظر آرہے تھے۔

اور راکٹ اپنی منزل کی طرف گامزن تھا۔ تاڑ اور سپاری کے قد آور درخت جھومتے تھے۔ ہر سو آنکھوں کو تازگی دینے والا سبزہ تھا۔ دور سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی پانی میں گھلتی جا رہی تھی۔ چمکتی کرنیں مختلف راستوں سے دریا میں اترتی آرہی تھیں۔ ''اللہ! یہ بنگال کی صبح ہے! اتنی حسین!!'' میں بے اختیار خود سے بولی تھی۔

''فضول میں ہی لوگوں نے صبح بنارس کا محاورہ بنا رکھا ہے۔ میرے خیال میں تو صبح بنگال سے زیادہ حسین صبح برصغیر کے کسی شہر کی نہیں ہوسکتی۔''

باریسال کے ساحل پر کشتیوں، سٹیمرز، لانچوں، بجروں اور دخانی جہازوں کی اتنی ہی کثرت تھی جتنی ڈھاکہ کے صدر گھاٹ پر۔ لانچیں اور راکٹ مختلف جگہوں سے آجا رہے تھے۔ لکڑی کے تختے بچھائے گئے اور ان پر ٹھپ ٹھپ کرتے ہم سب باہر آگئے۔

تب دورویہ درختوں سے گھرے ٹین کی چھتوں والے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ ذکیہ کے چچازاد بھائیوں کا گھر تھا۔ دو دن یہاں قیام کے بعد ہمیں صاحب رائے جانا تھا۔ کچے صحن میں سفیدے کا درخت پَر پھیلائے کھڑا تھا۔ دومنزلہ مکان سارا لکڑی اور ٹین سے بنا تھا۔ انگنائی میں مرغیاں کٹ کٹ کرتی پھر رہی تھیں۔ اس گھر کی لڑکیاں بھی کچھ مرغیوں کی

طرح بے شمار تھیں جو گننے میں نہیں آ رہی تھیں۔ ذکیہ نے اپنی بھاوجوں اور چچی کے قدم چھوئے اور اُن سبھوں نے مجھے محبت سے مسکرا کر دیکھا۔

ہریالی میں نہاتے صاف ستھرے خوب صورت شہر باریسال میں گھومتے زیرِ تعمیر میڈیکل کالج کو دیکھتے ہوئے واپسی کی۔

دوپہر کا کھانا پُر تکلف تھا۔ کوئی، سنگی اور ٹھینگرا مچھلیوں کو نہایت عمدگی سے پکایا گیا تھا۔ مرغ روسٹ تھا۔ مگر بریانی میں پیاز اور کشمش کا استعمال کچھ زیادہ ہی کیا گیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے دفعتاً میں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دسترخوان پر عین میرے سامنے بیٹھے ذکیہ کے بوڑھے بھائی اپنے منہ سے کانچ کے بنٹے جتنی گولی نکال کر پلیٹ میں رکھ رہے تھے۔ پلیٹ کے کنارے پر تین ایسی ہی گولیاں پہلے بھی پڑی تھیں۔ یہ کیسی جادوگری ہے؟ کھایا ماچھ بھات جا رہا ہے اور اندر سے بنٹے نکل رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ ذکیہ نے یقیناً میری آنکھوں سے ٹپکتی حیرت اور نگاہوں کا ان گولیوں پر جماؤ محسوس کر لیا تھا۔ ہنسی اور بولی۔

''ارے! یہ مچھلی کے کانٹے ہیں جنہیں اکثر لوگ منہ ہی منہ میں اکٹھا کر لیتے ہیں۔'' یہ کس قدر دلچسپ اور انوکھا انکشاف تھا۔

پھر یوں ہوا کہ اس وقت جب میں گھونٹ گھونٹ ڈاب پی رہی تھی، اس لڑکے نے جو ذکیہ کا رشتے میں بھتیجا تھا اور جس کا نام منصور الحق تھا، نے اُن سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ وہ اس ویسٹ پاکستانی مہمان لڑکی کو کھلنا نیوز پیپر مل دکھانا اور سندر بن کے جنگلات کی سیر کروانا چاہتے ہیں۔

میں تو جیسے گُنگ سی ہوگئی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی اولڈ ڈھاکہ میں مشہور آرٹسٹ زین العابدین سے ملنے گئی تھی۔ پیچ در پیچ گلیوں میں چلنا اور اس عظیم فنکار کے ایک چھوٹے سے گھر کی بیٹھک میں بیٹھنا میرے لیے بڑا مسرور کن تھا۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر

آرٹسٹ کی ایک پینٹنگ آویزاں تھی۔ سندری درختوں سے گھری کھپریل کی ایک جھونپڑی، جس کے پس منظر میں ایک نحیف ونزار بوڑھا کشتی کی مرمت میں جتا ہوا تھا۔ سبک خرامی سے بہتا ہوا دریا، ایک گھاٹ اور بانس کی جیٹی، بھاگتے ہرن اوران کے بچوں کی ڈاریں۔ منظر جیسے میری آنکھوں میں منجمد ہو گیا تھا۔

منحنی سے بدن والے دھوتی اور بٹنوں والی چھوٹی سی قمیض پہنے زین العابدین نے میرے جذب کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ سندر بن کا سین ہے۔ اب کوئی مجھے وہی منظر دکھانے کی پیشکش کر رہا تھا۔ میں نے منصور الحق کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''آپ چہرہ شناسی کے ماہر لگتے ہیں۔ یقیناً آپ نے میرے چہرے پر سندر بن دیکھنے کی خواہش کے کسی عکس کو دوڑتے پھرتے دیکھ لیا ہوگا۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔''

اور صرف آدھ گھنٹہ بعد میں اور ذکیہ سٹیمر میں بیٹھی منصور الحق کی بیوی سے پروگرام کی تفصیل سن رہی تھی۔

بگھیر گھاٹ سے کھلنا تک کا سفر سڑک سے۔ پیپر مل میں منصور کے مینجر دوست کی میزبانی۔ صبح چالنا تک لانچ اور پھر وہاں سے کشتی میں سندر بن کے جنگلات کی سیر۔

سٹیمر کی تیز رفتاری لہروں سے گتھم گتھا ہو کر انہیں پٹخ پٹخ کر پھینک رہی تھی۔ بگھیر گھاٹ سٹیمر کا پہلا پڑاؤ تھا۔ گھاٹ پر انہیں ڈاب پینے کا کہہ کر منصور الحق گاڑی کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ خوبصورت پانیوں کے سفر کے بعد بگھیر گھاٹ سے کھلنا تک زمینی سفر کا ایک اپنا حُسن تھا۔ پختہ سڑک جس کے دونوں جانب ناریل اور سپاری کے درختوں کی بہتات تھی، پان کی بیلوں کی کثرت بھی دیکھنے کو ملی۔ بیس پچیس میل کا یہ سفر پل جھپکتے میں ہی طے ہو گیا۔ اور جب شام کے سائے ڈھل رہے تھے، گاڑی دریائے بھیرب کے کنارے

واقع پیپر مِل کے احاطے میں داخل ہو رہی تھی۔ جنرل مینجر عزیز الرحمٰن کی بیوی کی پور پور میں جیسے بنگال کا جادو بول رہا تھا۔ گھر کے بڑے چھوٹے بچے بھی روزے سے تھے، ایسے میں چائے حلق سے نیچے اترنی مشکل ہوگئی تھی۔ پھر پیپر مِل کی سیر کرائی گئی۔ کاغذ کی تیاری کے سب مراحل دکھائے گئے اور میں نے جانا کہ سندر بن کے ڈیلٹاؤں کی دلدلی زمین میں اگنے والے گیوا درخت اس صنعت کے لئے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ گیوا لکڑی کو دریا میں بھگونے، کاٹنے، پیسنے اور مشینوں پر رولروں کی صورت میں لپیٹنے، کٹنے تک کے مرحلے کتنے مشکل تھے کہ جس کا اندازہ دیکھے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

گاڑی میں ہی کھلنا شہر کا مختصر چکر لگا۔ خاصا بڑا ضلع ہے۔ بھیرب، جمنا اور مدھومتی جیسے دریاؤں سے گھرا ہوا۔

جب میں سونے کے لئے لیٹی میں نے کئی بار خدا کا شکر ادا کیا کہ صاحب خانہ نے باتیں کرتے ہوئے ایک بار بھی یہ نہیں کہا تھا کہ ان کے سندر بن کی لکڑی اور اتنی محنت ومشقت سے تیار کردہ پیپر سے ویسٹ پاکستان زرِمبادلہ کما رہا ہے۔ ناشتے میں صرف ڈاب پی اور چائے کا کپ لیا۔

فارسٹ گھاٹ سے لانچ میں بیٹھے اور دریائے بھیرب میں سفر کا آغاز ہوا، تھوڑے سے سفر کے بعد لانچ دریائے پسر میں داخل ہوگئی۔ بگھیر گھاٹ پر پڑاؤ ہوا پھر لانچ چالنا جا رکی۔ چالنا بہت بڑی بندرگاہ تھی جس کی توسیع کا بیشتر کام ہو چکا تھا اور کچھ ابھی بھی جاری تھا۔ منگلا سے ہم لوگ سمپان (کشتی) میں بیٹھے۔ سمپان عرب جہاز رانوں کی مخصوص وضع کی ایجاد کردہ کشتیوں کا نام ہے۔

سندر بن کا سلسلہ پیروجپور، باقر گنج، چالنا، منگلا، مورلگینی اور جنوب کے چھوٹے چھوٹے ضلعوں سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ حیرتوں کا سفر تھا، فطرت کا حسن اپنی

رعنائیوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اتنا ننگا تھا کہ میں سناٹے میں آ گئی تھی۔ آنکھوں میں دہشت اور خوف کے سائے لرزنے لگے تھے۔ شاید گدلی آنکھوں میں حُسنِ فطرت سمونے کی تاب نہ تھی۔ سمپان جیسے جیسے آگے بڑھ رہی تھی۔ دیو قامت سبز درختوں کے جھنڈوں کے پیچھے لشکارے مارتی ہرنوں کی ڈاریں، بے کراں پانیوں اور سبزے کے سلسلے، ''پروردگار! شدت جذبات سے جیسے میرا مُو مُو فریادی بن گیا۔ میرا یہ وطن! حسن و رعنائی کا شاہکار۔ میری آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ چوڑے پتوں والے گیوا اور سندری کے درختوں، چیتوں، شیروں، رائل بنگال، ٹائیگرز، زہریلے سانپوں، اژدھوں اور خوفناک بھیڑیوں کے متعلق منصور الحق مجھے بتا رہا تھا پر میرے کان جیسے بند تھے اور آنکھیں بدلتے منظروں سے پھٹی پڑ رہی تھیں۔ مورلگینی سے کشتی ایک چھوٹی ندی میں داخل ہوئی۔ یہ جنت کا کوئی ٹکڑا ہے جو آسمان کے سینے کو چیرتا ہوا یہاں آ گرا ہے۔ میں نے بے اختیار سوچا تھا۔

کافی آگے جا کر دائیں ہاتھ ایک گاؤں کے آثار تھے۔ پھر کشتی نے گھاٹ کو چھوا اور ہم سب بانس کی جیٹی پر چلتے ہوئے زمین پر آ گئے۔ دہشت ناک خاموشی درختوں میں گھرے بانسوں کے گھر جن کی دیواروں پر پھیلی رنگ برنگے پھولوں والی بیلیں۔ پھٹی پرانی ساڑھیوں میں دو عورتیں، تین بچے اور مرد بیٹھے چٹائیوں کے بنڈل بنا رہے تھے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں سے سورج کے سنہری روپ کہیں کہیں مینا کاری کر رہے تھے۔ ہم ان کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ منصور الحق کے جاننے والے لوگ تھے۔ چائے اور کھجور کے گُڑ سے بنے مُرنڈے سے تواضع ہوئی۔ میں گھر کے اندر گئی، کمرے کی ایک ایک چیز جیسے زبان سے کہتی تھی کہ ہم گردن گردن تک غربت میں دھنسے ہوئے ہیں۔ میں انہیں کچھ دینا چاہتی تھی پر رک گئی کہ خوف نے گھیر لیا تھا کہ کوئی کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ مختلف نالوں اور بڑی ندیوں کے شارٹ کٹ راستوں سے ہوتے ہوئے شام ڈھلے ہماری باریسال واپسی ہوئی۔

اس رات جب جب میری آنکھ کھلی میرے ہونٹوں پر دسیوں نہیں بیسویں بار یہ دعا تھرکی تھی۔ پروردگار میرا وطن کتنا خوبصورت ہے۔ اِسے ہمارا نصیب کیئے رکھنا۔

تب نہیں جانتی تھی کہ خدا کے فیصلے میرٹ، انصاف اور خلوص پر ہوتے ہیں۔

☆☆☆

میلانیوں اور رومیوں کی نوک جھونک
کراچی اور لاہور والوں جیسی ہی

"دی لاسٹ سپر" دیکھنے کے بعد اب باہر بینچ پر بیٹھی گھونٹ گھونٹ دودھ پیتے کبھی لوگوں پر نگاہیں ڈالتے اور کبھی نقشے کو دیکھتے سوچوں کی گھمن گھیریوں میں تھی کہ آگے کیا دیکھنا ہے؟ وہیں بیٹھے بیٹھے نقشے کو کھولا ضرور۔ مگر اگلا آیٹم "لیونارڈو کا گھوڑا" دیکھنے سے انکاری ہوگئی۔ ''بس بھئی بس بہت خراج تحسین پیش کر دیا ہے میں نے۔ ونچی کے علاوہ بہت کچھ اور بھی ہے میلان میں۔''

''میلان کے ڈاؤن ٹاؤن چلتی ہوں۔ میلان کا مرکز، حد درجہ حسین، اسکی تاریخ و تہذیب سے لدا پھندا۔ اسکی گلیوں میں نکلتی ہوں اور خوب خوب سیر سپاٹا کرتی ہوں۔'' اور جب بس سے اُتری تو ڈوموکا وہ بھریا میلہ اپنی رعنائیوں سے گویا جگمگا سا رہا تھا۔ گلیریا Galleria کی سہ منزلہ عمارات کے رنگ و روپ اور حسن کو دیکھتے ہوئے خود سے کہتی ہوں۔ ''اف کتنی فنکاری کا غازہ انکے منہ ماتھوں پر تھپا ہوا ہے۔''

اب چلتی جا رہی ہوں اور آگے کھلے گلیارے سے باہر نکلتی ہوں تو سانس رک جاتی ہے۔ اُف ایسا خوبصورت منظر شاندار عمارتوں سے گھرا میدان۔ ایک جانب اونچے سے پیڈسٹل پر کھڑا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا وہی محبوب جینئس لیونارڈو ونچی اپنی لمبی داڑھی، لمبے چوغے اور اپنا ہائیڈرو انجنیرنگ ہیٹ پہنے وجود میں اپنے علم کی بے پایاں وسعتوں کو حلم اور عاجزی سے سمیٹے آنکھیں جھکائے، ہاتھ ناف پر باندھے گویا جیسے اِس خوبصورت لاسکالا اوپیرا ہاؤس کو تعظیم دیتا ہو۔ کمال کی بات ہی تھی نا کہ اُس نے میلان کے نہری سسٹم کو لاک ز Locks کے تحت کیا۔ اس سسٹم نے 1920 تک بڑی کامیابی سے کام کیا۔ نیچے اس

کے چار نوجوان شاگر د مختلف سمتوں میں کھڑے ہیں۔ مشتاقانِ دید کا ایک ہجوم اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تصویر کشی اور کہیں ایک دو پوڈیم کے نیچے لکھی گئی تحریروں کو پڑھنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

اور جب دھوپ زیتونی رنگی ہوتے ہوتے بلند و بالا عمارتوں کے بنریوں پر ٹکنے لگی۔ تب تک میں نے چلتے چلتے میلان کے اس ڈاؤن ٹاؤن کی دائیں بائیں مڑتی گلیوں اوران کے دہانوں سے پھوٹتے مختلف سکوائرز دیکھ لیئے تھے۔ اوراب میں پیازہ ڈل ڈومہ کے کھیتڈ رل کی سیڑھیوں پر بیٹھی ابھی ابھی میکڈونلڈ سے خریدی گئی آئس کریم چاٹتے ہوئے کتنی مسرورسی ہوں۔ آنکھیں اوپر اٹھا کر نیلی چھت والے کا شکریہ بھی ادا کر دیا ہے۔ بھلا زندگی کے ایسے خوشگوارترین لمحات اُس کی عنایت ہی ہیں نا۔ کہ جب آپ اپنی پسندیدہ جگہ پر بھی ہوں اورسکون وطمانیت کی لہریں بھی اندر موجزن ہوں۔ تو شام اب بنیروں پر بیٹھی ہے۔ سامنے فرش پر کبوتروں کی مست خرامیاں جاری ہیں۔ دلبروں کے رنگ ڈھنگ بھی شام کا حُسن بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں ایسی چاہتیں نصیب نہ ہوئیں تو بھئی دوسروں کو دیکھ کر جلیں کڑھیں کیوں؟ خوش ہورہے ہیں۔ تبھی ایک خاندان میرے قریب آ کر بیٹھ گیا ہے۔ پاکستانی نژاد اٹلی میں عرصہ پچیس سال سے مقیم۔ بیوی، بیٹا، بیٹی، شوہر عزیز احمد بڑا گالڑی قسم کا بندہ۔ پل نہیں لگا تھا کہ یوں گُھل مل کر باتیں کرنے لگا جیسے میں تو اسکی سگی آپا، اُس کے ماں باپ کی پہلوٹھی کی اولاد ہوں۔ تاہم تھا تیز بندہ۔ گرم سرد زمانے اور حالات کا چشیدہ، نظر میں وسعت تھی اور دماغی طور پر بہت تیز۔ میلان تو اسکی پوروں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا کونسا گلی کوچہ تھا جس سے وہ ناواقف تھا۔

اُس نے فوراً پوچھا۔ ''وایا دانتے Vaya Dante سٹریٹ نہیں گئیں۔'' میرے انکار پر بولا۔ ''تو یہاں بیٹھی کیا کررہی ہیں؟ وہاں جایئے۔'' مجھے اس کے انداز

تخاطب پر تھوڑا سا غصہ آیا۔تنک کر بولی۔''میں کھیر تتی تتی کھانے کی عادی نہیں۔ٹھنڈی کر کے مزے مزے سے کھاتی ہوں۔میلان کا مرکزی حصّہ ٹھوٹھی میں جمی کھیر جیسا ہے۔''

بڑا ہنسا۔تیز آدمی تھا سمجھ گیا تھا کہ مجھے بُرا لگا ہے۔فوراً وضاحت کرنے لگا۔

''بھئی کیا بات ہے اُس کی۔شام کے خوبصورت لمحوں میں جب وہاں اکارڈین بجتا ہے۔بائیک کی گھوں گھوں فضاؤں میں گونجتی ہیں۔قدیم کرداروں کے کاسٹیوم پہنے گھومتے پھرتے کردار آپ کے ساتھ تصویریں اترواتے ہیں۔بہت مزہ آتا ہے سچی وہاں جا کر۔''''ابھی تو میں کافی دن ہوں یہاں۔کل روم کیلئے ٹکٹ لینا ہے تو اِسے بھی دیکھنے جاؤں گی۔''بہر حال بندہ دلچسپ تھا۔اُس نے تو میلانیوں اور رومیوں کے وہ مزیدار قصے سُنائے۔شمال اور جنوبی سمت کے علاقوں کے اپنے اپنے ورثے کی بڑائی اور تفاخر کی داستانیں۔روم اور میلان کی آپس کی مقابلے بازیاں۔بڑی ٹُسل رہتی ہے میلان اور روم میں۔''ارے بھئی ویسی ہی نا جیسی ہمارے ملک میں کراچی اور لاہور والوں کی ہے۔

ساتھ ساتھ اسکی رنگ کمنیٹری نے گویا سماں باندھ دیا تھا۔

''کراچی والوں کو لاہوری پینڈو اور لاہور پنڈ لگتا ہے۔بس یہی حال اِن میلانیوں کا ہے۔روم والے تو انہیں نری سُستی کی پنڈیں،اور زمانے بھر کے کاہل نظر آتے ہیں۔وہ تو منہ پھاڑ کر کہتے ہیں۔کام کے نہ کاج کے،دشمن اناج کے۔حکومتی نوکریاں کرتے ہیں اور مزے لوٹتے ہیں۔ایک تو کام کیلئے مخصوص گھنٹے اسمیں بھی ان کی ڈنڈیاں۔ابھی دفتروں میں آ کر بیٹھے ہیں کہ وقفہ آ گیا ہے۔بندہ پوچھتا ہے۔بھئی کا ہے کا؟ جی کافی بریک ہے۔اب کیا ہے؟ یہ لنچ بریک ہے۔اب ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ ہورہی ہے۔دوستوں،محبوباؤں،کبھی عزیزوں اور بیوی بچوں کے فون سننے بھی تو ضروری ہیں۔ارے نرے چور اُچکے یہ رومی۔حکومت کے ٹیکسوں پر موجیں مارتے ہیں۔یہ ہم میلانی

ہیں جو خون پسینہ ایک کر کے حکومت کا ٹیکسوں سے گھر بھرتے ہیں۔''

میرا تو ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

اور یقیناً آپ کو نہیں پتہ ہو گا کہ یہاں بڑی زوردار قسم کی جنوبی حصوں سے علیحدگی کی تحریکیں بھی چلتی رہتی ہیں۔ تو اب تصویر کا دوسرا رخ بھی سُنیئے۔ روم والے بھی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ نخوت سے نتھنے پھیلاتے اور تبصرہ کرتے ہیں۔''ارے ہٹاؤ اِن میلانیوں کو ہم تو ویسے ہی اِن ہندسوں میں اُلجھے، ہمہ وقت دو اور دو چار کے چکروں میں پھنسے، ایک سے گیارہ یورو بنانے والوں کو رڈ کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مزہ ہی نہیں ان کے ہاں۔ کمبخت مارے خود بھی پیسہ کے دُھن چکر میں اُلجھے ہوئے اور شہر کو بھی دُھند کے غبار میں ڈبوئے رکھتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے ہمیں بھی اس کا اعتراف ہے کہ ملازمتوں کے مواقع زیادہ ہیں اِس شہر میں۔ میرٹ کا بھی یہ میلانی بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر بھئی کاروبار جو کرتے ہیں۔ ذاتی اور اپنے تو میرٹ کا خیال نہ رکھیں گے تو اور کیا کریں گے؟ دونوں کو ایک دوسرے سے ڈھیروں ڈھیر شکائتیں، کہیں غیر مہذب ہونے، کہیں روم کو ایک گندہ شہر سمجھنے اور کہیں میلانی خشک لوگ ہیں وغیرہ مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کی خوبیوں کا بھی خوشدلی سے اعتراف کرتے ہیں۔ یہ سب سُننا میرے لیئے کتنی بڑی تقویت کا باعث تھا کہ میں جو ایسے ہی حالات کی زخم خوردہ تھی اور نہیں سوچتی تھی کہ ایسی صورت اٹلی جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی ہو سکتی ہے۔ سکوائر روشنیوں سے جگمگانے لگا تھا کہ دھوپ اپنا بوریا بستر سمیٹ چکی تھی۔ فیملی نے مجھے اپنا کارڈ دیا۔ گھر آنے کی دعوت دی۔ شام بہت خوشگوار رہی کہ مجھے نہ صرف انہوں نے اپنے ساتھ رکھا بلکہ میٹرو سے مجھے اُس گاڑی میں بھی سوار کرا دیا جس نے مجھے چیزاتے پہنچانا تھا

☆☆☆

زندگی کے ہزار رنگ

تو بات بس اتنی سی تھی کہ دنیا کے نقشے پر کسی نازنین کے رُخسار پر گرے خوبصورت آنسو کی صورت دکھائی دینے والے ملک سری لنکا کے مرکزی شہر کولمبو کی بجائے ہم نگمبو کی طرف آخر کیوں چل پڑے تھے۔ دراصل ساری کارستانی اُس لڑکے کی تھی جو ہماری بکنگ کے معاملات دیکھتا تھا۔ اس نے سری لنکا کے مغربی ساحل کے ایک حد درجہ خوبصورت شہر نگمبو ٹاؤن بارے وہ گڈے باندھے تھے کہ ہماری پٹڑی کا کانٹا ہی بدل گیا تھا۔

نگمبو کا سی سٹریٹ کا علاقہ Lewis palace کہلاتا ہے۔ اسکی تنگ سی سڑک پر تین میل تک چلتے رہے۔ عالیشان ہوٹل، کیتھولک چرچ، ریسٹورنٹ، گھریلو دستکاریوں کی دُکانیں سرخ ڈھلوانی چھتوں والے پینٹ ہوئے گھروں کے مناظر نظروں میں یوں نمایاں ہوئے تھے جیسے املتاس کے پھولوں کا رنگ ایکدم آنکھوں میں کھُب سا جاتا ہے۔ کہیں کسی کسی دوکان پر ہم نے تانکا جھانکی بھی کی۔

''فشنگ ولیج چلا جائے۔'' میں نے کہا۔

اب بس میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ بس کیا تھی جیسے کینکارڈ طیارہ ہو۔ تنگ سی سڑک پر گولی کی طرح بھاگی جاتی تھی۔ سٹیرنگ تو ظالم کے ہاتھوں میں جیسے کھلونا سا بنا ہوا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایسے سر پھرے اور من چلے تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔ یہ سانولا سلونا سا تحفہ بھی انہی میں سے ایک ہوگا۔ پر نہیں جی بعد میں جب سری لنکا کے مختلف شہروں کی سڑکوں پر بس پیمائی کی تو عقدہ کھلا کہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ کوئی آدھ انچ بھی دوسرے سے کم نہیں ہاں زیادہ ہی ہوگا۔ ایسے ویسے من موجی اور آپ پُھدرے سے پاکستانیوں کو بھی پیچھے چھوڑ بیٹھے تھے۔ کمبختوں کا بس نہیں چلتا تھا کہ بسوں کو

بگٹٹ بھگاتے بھگاتے سمندر میں ہی جا کر دم لیں۔

جہاں اُترے۔ وہیں سے کئی راستے مچھیروں کی بستیوں کیطرف نکلتے تھے۔ سرکیوں اور پلاسٹک کی چادروں سے بنے شیڈوں کے نیچے آبنوسی رنگتوں والے مرد اور عورتوں کا ایک ٹولہ بات بات پر ٹھٹھے لگاتا لمبے چوڑے جال کی ڈوریوں کو گانٹھنے میں لگا ہوا تھا۔ موٹی موٹی عورتوں کے گالوں کی اُبھری ہڈیوں پر اندرونی صحت مندی کی چمک کا ایک لشکارہ سا تھا جو فی الفور آنکھوں پر گرتا تھا۔ گداز ننگی پنڈلیاں اور سڈول ننگے بازو سامانِ وحشت نظر تھے۔

جب پاس بیٹھے تو پتہ چلا کہ مرد کیا یہ بظاہر بھدّی بھدّی سی ناک والی عورتیں بھی ٹوٹوں میں انگریزی بول کر اپنا آپ ظاہر کرسکتی ہیں۔ بڑا کھلا ڈلا ماحول تھا۔ قہقہے اور چہلیں تھیں۔ قریب رکھا ٹرانسسٹر زور شور سے بج رہا تھا۔

شاید کوئی نیا گانا شروع ہوا تھا۔ جیسے وہاں طوفان سا آ گیا۔ عورتیں چٹکیاں بجاتے ہوئے بولوں کو دہرانے لگیں۔ بڑے مزے کا منظر تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں نے گیت کے بارے پوچھا تو پتہ چلا کہ محبت کرنے والا اپنی محبوبہ سے معافی مانگ رہا ہے۔ اُسے آنسو پونچھنے کیلئے کہہ رہا ہے۔ اُسے ترغیب دے رہا ہے کہ وہ اُسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے۔ میں ہنس پڑی۔

''یہ تو اُلٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ تمہارے ہاں کیا ایسا ہوتا ہے؟''

عورتیں کھلکھلا کر ہنسیں۔ بڑے ٹھسّے سے گالی نکالی اور مردوں کی ماں بہن ایک کردی کہ یہ ہوتے ہی کمینے ہیں۔ یہ سب گانوں میں ہے۔ عملی زندگی میں ایسا کہاں؟ کیسی دھڑلے والی عورتیں تھیں۔

''کتنا کما لیتے ہیں روزانہ؟''

سوال پر ایک بڑا قہقہہ اور ہاتھ کا بڑا سا پھیلاؤ اُن جھونپڑیوں کی طرف ہوا جو ساحل کے ساتھ ساتھ تا حد نظر تک پھیلی تھیں۔ موٹے موٹے سیاہ ہونٹوں پر ہنسی کے ساتھ ساتھ آنکھوں نے کہا۔''دیکھ لیجیے کتنی کمائی ہے۔''

ذرا فاصلے پر مچھلی بیچتی اور عورتیں بھی دوکانداری چھوڑ کر شیڈ تلے آ گئیں۔ تھوڑی سی گپ شپ اُنکے ساتھ رہی۔ رنڈی رونے تو ایک جیسے ہی تھے مہنگائی کے، عورتوں کا وہی پرانا پسندیدہ گلہ شکوہ۔

بچوں کی تعداد پوچھنے پر پتہ چلا کہ حکومت کی خاصی سختی کے باوجود بھی نمبر اکثر بڑھ ہی جاتا ہے۔ بڑی کمبختیں تھیں۔ سیاہ مسوڑوں سے جھانکتے موتی جیسے دانتوں اور چمکدار آنکھوں سے چھلکتی معنی خیز مسکراہٹیں بہت سے افسانے سُناتی تھیں۔

تعلیم، یونیفارم اور کتابوں کی فراہمی سب حکومت کی ذمہ داری ہے۔ بچے کو ہر صورت سکول جانا ہے۔ حکومت کا حکم ہے۔

اس حکم کی پاسداری کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے؟ جاننا چاہا اور جواب تھا۔ فائدے اور بھلے کی بات کیوں نہ مانیں۔ ملک سو فیصد لٹریسی سطح کو ایسے ہی تو نہیں چھو رہا ہے۔

کہیں سینے میں " کاش " کی ہوک اُٹھی تھی۔ ہمارے ہاں تو تعلیم کہیں کسی ترجیحی کھاتے میں ہی نہیں۔ اگر کہیں حکومت یہ نیک کام کرنے پر تُل جائے تو مقامی آبادیاں مزاحمت کھڑی کر دیتی ہیں۔ مجھے یاد آیا تھا ضلعی حکومت نے ضلع چلاس اور اس کی تحصیلوں میں بچوں کے لیے ضروری سکول جانے اور وظائف کے اجراء کا اعلان کیا اور اس کی تکمیل کے لیے زور زبردستی بھی ہونے لگی۔ ایک دن ایک مقامی نوجوان لڑکا ہیڈ ماسٹر کے کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔

''تم کو سکول لگانا ہے تو لگاؤ۔ پر شام کو لگاؤ نا بابا۔ یہ سویرے سویرے کا سلسلہ تو ہم

کو مافق نہیں۔''

ہیڈ ماسٹر نے رسان سے کہا۔''سکول تو صبح ہی ہوتا ہے نا بیٹے۔''

بیٹے کا بچہ لڑکا تلملا کر بولا۔

''ہم سویرے کو ادھر سکول آئے گا تو اُدھر بکریاں تمہارا باپ چرائے گا۔''

دیسی پیاز کی بیرونی پرت جیسے رنگ والی ریت پر کھڑی یہ بستی خوشحالی اور غریبی دونوں طبقوں کی عکاس تھی۔غریب جھونپڑیوں میں کیا کھانے پکانے کی جگہ اور کیا سونے کی یہ دیڑ دیڑ ریت ہی ہر جا پردان تھی۔ہاں البتہ پھولوں سے سجے آنگن اور پلاسٹک کی شیٹوں سے ڈھنپے فرش اور کمروں میں میز کرسیوں اور کھانے پینے کے برتن بھانڈوں اور جام چٹنیوں کے جار بتاتے تھے کہ یہاں مکین کھاتے پیتے بھی ہیں۔

پر یہ کیسے لوگ تھے۔پھولوں، پودوں سے محبت کرنے والے موسیقی سے پیار کرنے والے کہ ہر جھونپڑی اور ہر گھر میں ٹرانسٹر بجتا تھا اور گیت فضاؤں میں بکھرتے تھے۔پوری بستی میں ایک بھی جھونپڑی ایسی نہ تھی جہاں بوگن ویلیا کی بیلیں نہ ہوں۔شیشوں کی بوتلوں اور جاروں میں منی پلانٹ کی بیلیں نہ سجی ہوں۔

☆☆☆

ایک عظیم شخصیت رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور سے میرا پہلا تعارف پانچ جولائی 1969 کی اُس شب ہوا جس کی دوپہر کو میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے گرلز ہوسٹل رقیہ ہال میں بورڈر ہوئی تھی۔ آڈیٹوریم میں اُن کا ڈرامہ چترا انگدا سٹیج ہو رہا تھا۔ رم جھم برستی بارش میں رقص اور ان کی شاعری کے سنگت ڈھاکہ یونیوسٹی سٹوڈنٹس کی یہ پیش کش حد درجہ کمال کی تھی۔ بنگالی زبان سے اِسے میں نے اُردو میں لال منیر ہاٹ کی بہاری روشن آرا سے سمجھا جو پانچ چھ گھنٹوں میں میری دوست بن گئی تھی۔

چھ ماہ میں ''گیتا نجلی'' کو زبانی کلامی میں نے سمجھا اور ٹیگور کی شخصیت کے دیگر پہلوؤں سے آشنا ہوئی۔ ایک عظیم اور لافانی شخصیت جن کی شاعری، مصوری، افسانہ، ناول، ڈرامہ موسیقی، مقالہ نویسی غرض کہ کون سی صف ایسی تھی جس کے وہ شہسوار نہ تھے۔ قلم اُن کا وہ ساتھی تھا جو کبھی اُن سے جدا نہ ہوا اور زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ تھا جس پر انھوں نے نہ لکھا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، تصوف، مذہب، سیاست، اخلاقیات، سماجیات جسے پکڑا اُس کے اندر یوں اُترے کہ وہ تحریر جاوداں ہوگئی۔ جو لفظ چنا اُسے معتبر کر دیا۔

ہندوستانی ادب کے معماروں میں شامل ایک بہت بڑا نام نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور کلکتہ کے جوڑا سانکو کے مشہور ٹھاکر گھرانے میں 7 مئی 1861 کو پیدا ہوئے۔ عجیب سی بات ہے نا کہ روایتی تعلیم سے انھیں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ کہنے کو وہ اورینٹل سیمناری، بنگال اکیڈمی پھر مشہور زمانہ سینٹ زیویئرس سکول میں داخل رہے۔ مگر روایتی

تعلیم کی طرف ان کی طبیعت مائل ہی نہ ہوئی۔ یہ زمانہ انقلاب کا تھا اور ٹیگور گھرانہ مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے فنون لطیفہ سے پوری طرح بہرہ ور تھا۔ ٹیگور کے والد حافظ شیرازی کے دلداہ تھے۔ ان کی بنگالی سوانح عمری میں حافظ کے اشعار جا بجا موتیوں اور نگینوں کی طرح سجے آتے تھے۔ یوں بھی یہ خاندان لباس، آداب نشست و برخواست اور بود وباش میں مسلمانوں سے متاثر اور اُن سے خصوصی نسبت رکھتا تھا۔ اس گھرانے کی ایسی ہی وجوہات پر ہندوان کو ''دھریوں'' اور ہندونما مسلمان سمجھتے اور کہتے تھے۔

اپنے والد کی طرح وہ بھی حافظ شیرازی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی شاعری میں اسکا اظہار ہوا۔ میں نقاد نہیں ہوں مگر اُن کی شاعری اور گیتوں کو مجھ جیسی بے مایہ بھی کہیں گاتے اور بجاتے سُن کر جان لیتی تھی کہ یہ رابندر وشنگیت ہے۔ اسے کوئی نذرل کا گیت نہیں کہہ سکتا۔ کیا بات تھی۔

میرے خیال میں پہلی چیز شاعری کا بے ساختہ پن ہے۔ آنکھ سے نکلنے والے کسی بے اختیار و بے تاب آنسو کی طرح، ہونٹوں پر اپنے آپ ہی بکھر جانے والی مسکراہٹ کی طرح۔ ان کی شاعری، ان کے گیت، سریلے اور نغمہ بار ہیں، اپنے آپ میں مکمل۔ ان کی شخصیت کے عکاس، فکر ونظر میں آزاد۔

ٹیگور کی ذات مذہب، فرقہ بندی، قوم وملت کی بندشوں کو توڑتی ہے۔ انسان کو انسان سے جوڑنے کی ترغیب دیتی ہے کہ ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے ۔اسی لیے وہ اس کی توہین برداشت نہیں کرتا۔

ذرا دیکھئے شاعر کا انداز......

جب میں روشنی کی سنہری باتیں سُنتا ہوں

میں محسوس کرتا ہوں

آسمانی فضا کا دل محبت سے بھر گیا ہے

تب میں اس جہان کے ہر ذرے میں

آگہی اور عرفان کا پیغام محسوس کرتا ہوں

جب گیت کے اندر سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں

تب میں اُسے پہچانتا ہوں، تب اُسے سمجھتا ہوں

ان کے یہاں کوئی مخصوص نظریہ نمایاں فلسفہ حیات نہیں ملتا۔ مذہباً ٹیگور کا تعلق برہموسماج سے تھا۔ یہ فرقہ صرف بنگال میں ہے۔ بنگال کی بیشتر عظیم ادبی و سیاسی شخصیات کا تعلق اسی طبقے سے تھا۔ برہموسماج صرف وحدانیت خداوندی کا قائل ہے۔ ٹیگور کی فنکارانہ زندگی کے تحت الشعور میں یہ تصور ہمیشہ قائم رہا۔ مسائل حیات کے تعمیری پہلو، تہذیب نفس، کردار کی پاکیزگی، حق گوئی و بیباکی کے لیے ایک دائمی پکار ملتی ہے۔ اس کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کو آواز دیتے ہیں۔ کوئی نہیں ملتا تو کہتے ہیں......

جب تیری پکار پر کوئی نہ تیرا ساتھ دے

تنہا ہی چل تو اکیلا ہی چل

یہ ایک حقیقت ہے کہ اچھی شاعری کی بنیاد شدید قسم کی جذبایت اور تیز حسّیت کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ تخیل کی رنگینی اور زبان کی سادگی جس شاعر کے ہاں ملے گی وہی حقیقی اور سچا شاعر کہلائے گا ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیگور کے ہاں خیالات کی جدّت ہے۔ تیز رفتار جولانیاں ہیں، رنگینی ہے، جذبات کی شدت اور احساسات کا تیز بہاؤ ہے۔ خیالات میں گہرائی اور گنگناتی ہوئی سادہ زبان۔ اُس کے انہی اوصاف نے اُسے ایک عظیم شاعر بنا دیا کہ جب اُن کی شہرہ آفاق تصنیف ''گیتا نجلی'' کا انگریزی ترجمہ ہوا تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ دنیا نے اُسے کس کس انداز میں تعظیم دی۔ کسی نے کہا۔ ٹیگور شاعر کائنات ہے۔ کسی

نے کہا وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین شعرا کی قطار میں سب سے آگے ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اس کی شاعری نے نئی نئی جہتوں کو نئے نئے انداز میں دریافت کیا اور وہ نئے نئے راستوں پر چلی۔ شاعری کی مروجہ پرانی ریت وروایتیں اور تنگ راستے سبھوں سے اُس نے اپنا تعلق واسطہ نہ رکھا۔

پُشکن کی طرح جس نے روسی زبان کو مالا مال کیا اور یورپی زبانوں کے مقابل لا کھڑا کیا ٹیگور نے بنگلہ زبان کو وہی درجہ دیا کہ وہ ٹیگور کی شاعری کی بدولت ارتقا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔

''گیتانجلی'' اُس کی لافانی شاعرانہ تخلیق ہے۔(yeats) نے اُس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ وہ لکھتا ہے، ایک زمانہ وہ آئے گا جب راستہ چلنے والے انھیں راہ میں گنگنائیں گے، کشتیوں پر ملّاح انھیں گائیں گے، عاشق اپنے معشوق کے انتظار میں، محبوبہ اپنے چاہنے والے کے انتظار میں اور سچی بات ہے کہ یہی سب کچھ ہو رہا ہے۔

ٹیگور کی یہی سحر کاری اُسے ممتاز کرتی ہے۔ مترنم سادہ سا اسلوب منفرد کرتا ہے۔ سندھا سنگیت (شام کا نغمہ) سے اس غنائی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ آغاز میں یاسیت کا بھی غلبہ رہا۔ مگر یہ وقت جلد گزر گیا۔ پربھات سنگیت (صبح کا نغمہ) میں ذرا دیکھئے، صبح کی روپہلی دھوپ میں پھیلی ہوئی زندگی اس کے لیے کتنی دلآویز ہے......

میں اور کچھ نہیں چاہتا
بس اگر چاہتا ہوں تو اتنا سا
اسے دیکھتا رہوں مسحور رہوں
ہر چیز بھول جاؤں گم سم رہوں

مانسی (محبوبہ) کو پڑھیں تو شاعر کی فنّی پختگی کا نقطہ کمال محسوس ہوتا ہے۔''اے

بار پھراؤ مورے'' (اس بار مجھے لوٹا دو) اُس کی ایسی شاہکار نظم ہے۔اسی طرح ''لامتناہی راستہ'' کا گیت ہے۔اُس بچی کا گیت جو چھوٹی سی ہے۔شاعر کہتا ہے......

میں اشک بار اُس لڑکی کو دیکھتا ہوں
محبت سے لبریز آنکھوں والی بچی
میری کشتی سفر پر چل پڑے گی
اور بچی بھی اپنا کام پورا کرے گی
وہ مجھے نہیں جانتی
میں اُسے نہیں جانتا
مگر میں سوچتا ہوں
وہ کسی نامعلوم بستی اور نامعلوم اجنبی گھر میں دُلہن بن کر جائے گی
پھر ماں بنے گی
اور پھر سب کچھ ختم ہو جائے گا

ٹیگور کا یہ گیت کتنی سچائی اور کڑی حقیقت پر ہے۔ٹیگور کے نزدیک انسان خدا کا پرتو ہے ۔ہر ایماندار، نیک اور جفاکش انسان میں خدا پنہاں ہوتا ہے۔اسے خانقاہوں، مسجدوں اور مندروں میں محسوس کرنے والوں سے وہ کہتا ہے......

یہ عبادت (بھجن) یہ تسبیح خوانی چھوڑ
دروازہ بند کر کے خانقاہ کے ویران اُجڑے گوشے میں تو کس کی پوجا کر رہا ہے؟
آنکھیں کھول اور دیکھ خدا تیرے سامنے ہے
وہ کہاں ہے؟ وہاں جہاں کسان سخت زمین میں ہل چلاتا ہے
جہاں سڑک کی تعمیر کرنے والے پتھر کوٹتے ہیں

دھوپ اور بارش میں کام کرتے ہیں۔خدا تو ان کے پاس ہے۔

اس عظیم شاعر کی ازواجی زندگی کا بھی ایک رخ دیکھ لیں۔دُلہن کا نام بھبوتارینی تیرہ سالہ کم پڑھی لکھی عام سی لڑکی تھی جسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ دنیا کے جینئس انسان کی بیوی بن رہی ہے۔لیکن وقت نے بتایا کہ اس نے خود کو اِس اعزاز کا اہل ثابت کیا۔

شوہر نے جو نام دیا وہ مرینالنی دیوی تھا۔اِس نام کا بھرم رکھنے کیلئے اُس کم عمر لڑکی نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بننے کے باوجود دوسری زبانیں سیکھیں۔ادب،موسیقی اور آرٹ کی باریکیاں جانیں۔اپنے شوہر کے مقام اور مرتبے سے آگاہ ہوئی۔شوہر کو لکھے گئے خطوط کا شمار اب ادبی نقطہ نظر سے ہو رہا ہے۔رابندر ناتھ کو اِس کی منزل تک پہنچانے میں مرینا کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

کبھی شوہر کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں۔شانتی نکیتن میں جب کھلے آسمان تلے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تو کہیں سے مدد نہ ملی۔ایسے میں وفا شعار بیوی نے سب زیورات قدموں میں ڈھیر کر دیئے۔آخری عمر میں زبان بند ہوگئی تو رابندر نے لکھا......

اتنی فرصت نہ ملی
یہ بھی ممکن نہ ہوا کہ تم
دل کی آخری باتیں کہہ جاتیں

ایک جگہ اور دیکھیئے وہ مرینا کے ہجر میں کیا کہتے ہیں......

تم اپنا وہ اچھا لگنا میری آنکھوں میں نقش کر کے
میری آنکھوں میں اپنی نگاہ رکھ گئی ہو

کیسا شاعر تھا جسے رکشہ چلانے والا اور پتھر کوٹنے والا اگر گا تا تھا تو وہیں حکمرانوں

کی آنکھوں کا بھی تارہ تھا۔ دلّی کی سیاحت کے دوران اندرا گاندھی میموریل کو دیکھنے گئی تو ان کی سٹڈی میں جو نظم موجود تھی وہ ٹیگور کی ہی تھی۔

جہاں ذہن میں ڈر اور خوف نہ ہو
جہاں انسان سربلند ہو کر جیئے
جہاں علم کا حصول ہر خاص و عام کے لئے ہو
جہاں یہ ہماری دنیا ٹکڑوں میں بٹ کر تقسیم نہ ہو

☆☆☆